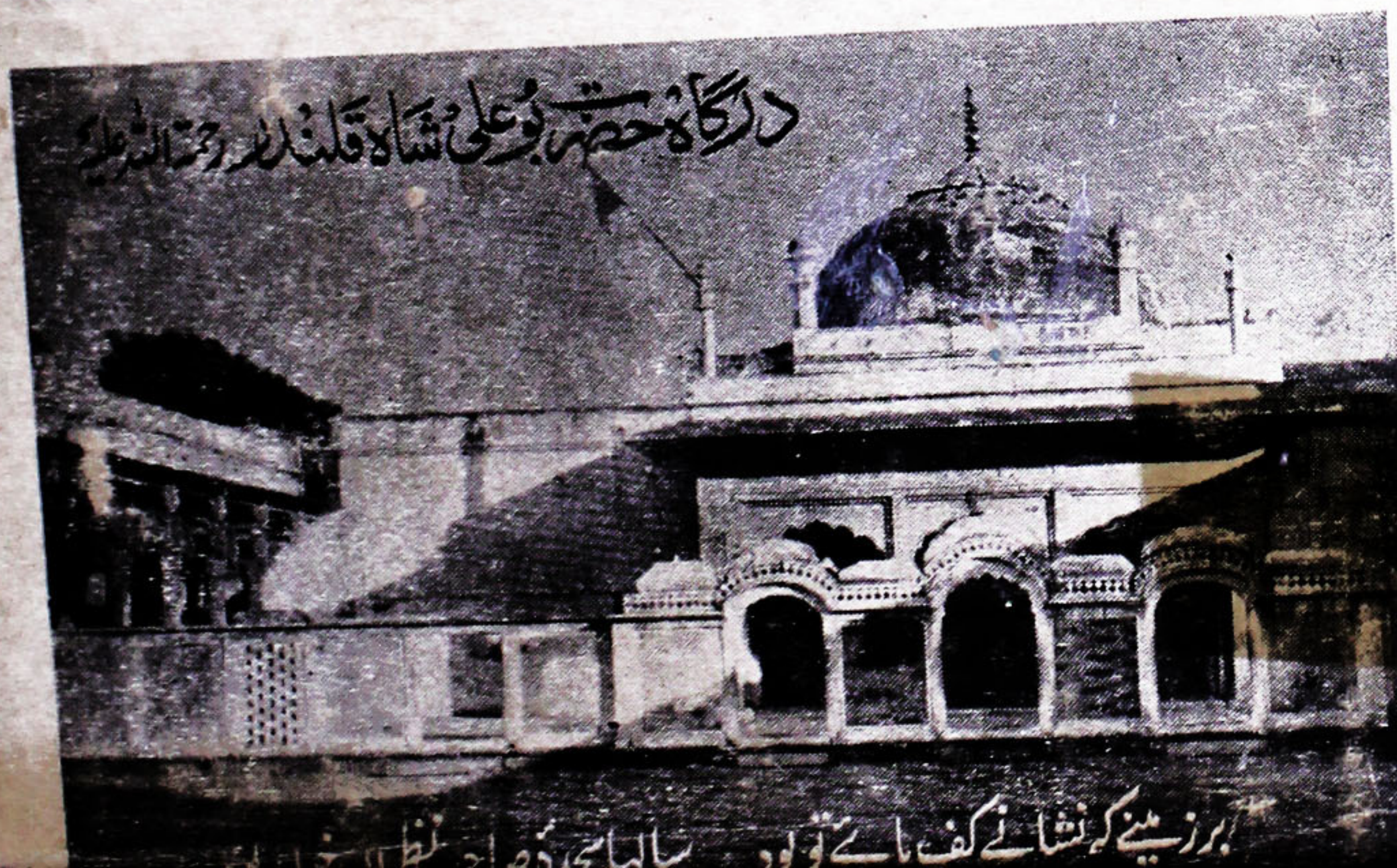
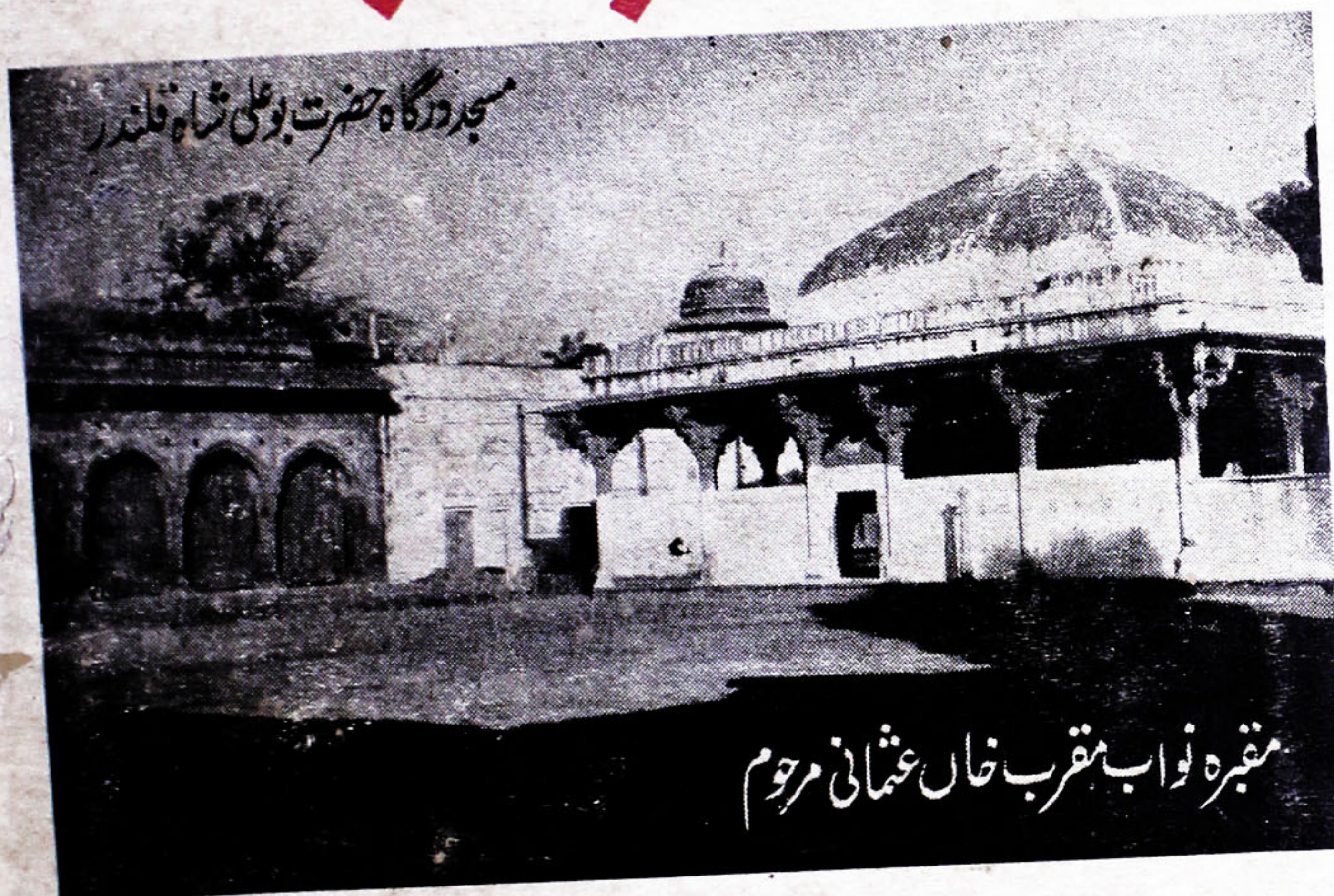


۱۳۴۹

۱۰۷

پانی پت

بزرگانِ پانی پت



**Collection of Prof. Muhammad Iqbal Mujaddidi
Preserved in Punjab University Library.**

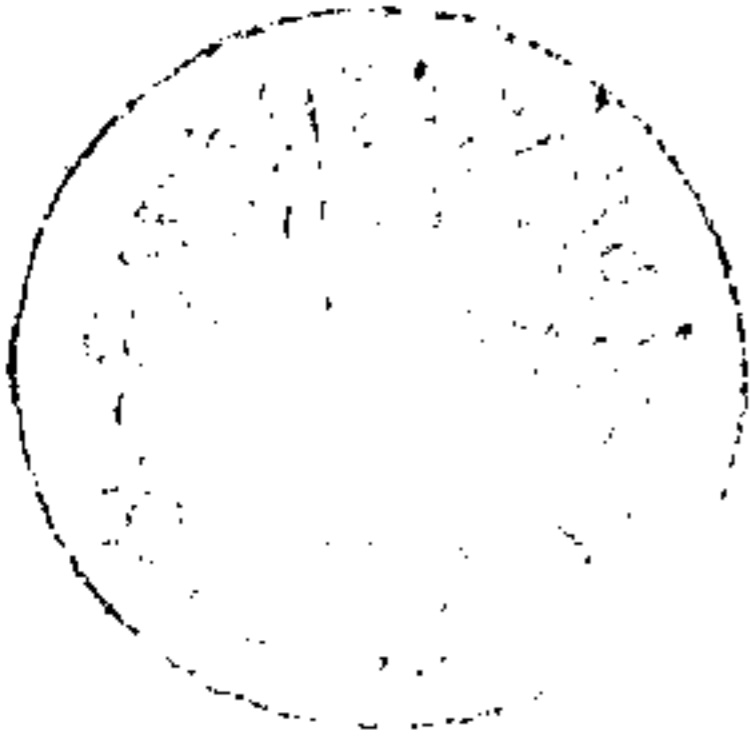
پروفیسر محمد اقبال مجددی کا مجموعہ
پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں محفوظ شدہ

Marfat.com

Marfat.com

Marfat.com

Marfat.com



مَوْلَانَا

پانی پت

اور

بزرگان پانی پت

سیدنا

حضرت ابو علی شاہ قلندر

حضرت خواجہ شمس الدین ترک - مخدوم المشائخ شیخ جلال الدین کبیر ولیہ
شیخ عالی چشتی پانی پتی وغیرہم - رحمہم اللہ

از

مولانا سید محمد میاں صاحب - ناظم عمومی جمعیتہ علماء ہند

مصنف - علماء ہند کا شاندار ماضی و عمار حقیت تاریخ اسلام اسلامی فکر وغیرہ

حسب فرمائش

حضرت مولانا تقار اللہ صاحب عثمانی پانی پتی

مجموعہ ماہ جمعیتہ پریس دہلی - ۶

قیمت

پانے کا پتہ :- (۱) حضرت مولانا تقار اللہ عثمانی پانی پت ضلع کرنال (پنجاب)

(۲) کتابستان - گلی قاسم جان - دہلی - ۶

129485

فہرست مضامین

نمبر شمار	عنوان	صفحہ	نمبر شمار	عنوان	صفحہ
۱	عام عقیدت کے اسباب	۵	۲۰	استغفار اور بے نیازی	۴۹
۲	وجہ تالیف	۶	۲۱	تصنیفات	۵۱
۳	تاریخ پانی پت کا ایک نظر از پہلو	۷	۲۲	ایک بنیادی فرق	۵۸
۴	ایک دلچسپ معممہ	۷	۲۳	قلندری اور شان قلندری	۶۱
۵	معممہ کا حل	۸	۲۴	لفظ قلندر کے معنی	۶۲
۶	تاریخی حقیقت	۸	۲۵	قلندر اور سالک میں فرق	۶۶
۷	حضرت قلندر صاحب کے زمانہ کا	۱۱	۲۶	قلندری اور پابندی شریعت	۶۸
۸	سیاسی ماحول		۲۷	بنیادی غلطی	۷۱
۹	بادشاہ کے متعلق ان بزرگوں کے خیالات	۲۲	۲۸	اسباب ترک	۷۷
۱۰	حضرت بوعلی شاہ قلندر	۲۹	۲۹	سیاسی بحران کا اثر علماء اور مشائخ پر	۹۰
۱۱	خاندان اور نسب	۳۰	۳۰	دین و ایمان کے حق میں اندرونی	
۱۲	ناہیہالی سلسلہ	۳۱	۳۱	خطرات حفاظت کی صورتیں	۱۰۱
۱۳	سال ولادت	۳۵	۳۱	اور لاکھ عمل	
۱۴	ولادت کے بعد کثرت گریہ اور تسکین کی عجیب و غریب صورت	۳۵	۳۱	تبلیغ و اشاعت کا لاکھ عمل	۱۰۳
۱۵	تعلیم	۳۶	۳۲	مسک عشق و محبت کا پرچار	
۱۶	اساتذہ	۳۶	۳۲	حضرت قلندر صاحب کے مسک عشق	۱۰۷
۱۷	پانی پت سودھی اور سلسلہ درس و تدریس	۳۷	۳۳	ایک سوال اور جواب	۱۰۹
۱۸	حکم نامہ کیا ہے؟	۳۷	۳۴	ہم رنگی کیا ہے؟	۱۱۰
۱۹	مشائخ	۳۷	۳۵	سوانح نگاروں کے بیان میں	۱۱۴
	مریدین	۳۷	۳۶	تعارض اور تعناد	
			۳۶	کیا جذب مقصود ہے؟	۱۲۰

۱۹۲	۵۷	حضرت شمس لدین کی خدمات	۱۲۲	۳۷	ہم رنگی محبوب کی حقیقت اور اس کی صحیح تصویر
۱۹۵	۵۸	حضرت شمس رحمۃ اللہ علیہ کی وفات	۱۲۵	۳۸	مذہب عشق، تبلیغ و اصلاح کا لائحہ عمل
۱۹۵	۵۹	اولاد	۱۲۶	۳۹	سلک عشق کی غلط تفسیر
		مخدوم المشائخ حضرت خواجہ	۱۳۱	۴۰	گوجری کا افسانہ
۱۹۹	۶۰	محمد جلال الدین کبیر الاولیاء	۱۳۵	۴۱	حضرت قلندر صاحب کی وفات ایک مزار
		عثمانی گاڈرونی قدس سرہ	۱۳۷	۴۲	مزار شریف کہاں ہے
۲۰۰	۶۱	نام نامی	۱۴۱	۴۳	خطاب قتال اور وجہ خطاب
۲۰۰	۶۲	وطن اور سلسلہ نسب	۱۴۴	۴۴	ہم عصر اصحاب کمال اور حضرت قلندر عثمان
۲۰۱	۶۳	سلسلہ پرورش			حضرت خواجہ علاؤ الدین علی احمد صاحب کبیر
۲۰۱	۶۴	تعلیم و تربیت	۱۴۴		حضرت خواجہ شمس لدین نرک پانی پتی
۲۰۳	۶۵	ذریعہ معاش			مخدوم المشائخ جلال الدین کبیر الاولیاء
۲۰۵	۶۶	نکاح	۱۵۴		سلطان المشائخ نظام الدین محبوب الہی
۲۰۷	۶۷	سیاحت اور حج			اور حضرت امیر خسرو
۲۱۱	۶۸	بیعت	۱۶۲		شیخ احمد یحییٰ و شیخ شرف الدین منیری
۲۱۲	۶۹	حضرت شیخ کی خدمت			رحمہم اللہ۔ متوفی ۷۸۲ھ
۲۱۳	۷۰	سند خلافت	۱۶۳	۴۵	حضرت قلندر صاحب اور شاہانِ دہلی
۲۱۵	۷۱	کمالات و کرامات	۱۶۴	۴۶	بادشاہوں کے تعاقبات
۲۱۹	۷۲	مستجاب الدعوات ہونا	۱۶۹	۴۷	خاتمہ کلام
۲۲۳	۷۳	آخری دور اور استغراق	۱۷۱	۴۸	حضرت شیخ شمس لدین کٹانی پتی
۲۲۳	۷۴	صاحبزادگان	۱۷۱	۴۹	وطن اور سلسلہ نسب
۲۲۵	۷۵	خلفاء	۱۷۲	۵۰	تعلیم اور تافہل
۲۲۸	۷۶	شیخ عثمان زندہ پیر	۱۷۷	۵۱	فوجی ملازمت
۲۲۹	۷۷	شیخ نظام الدین	۱۷۸	۵۲	فوجی ملازمت کب کی؟
۲۵۰	۷۸	شاہ علی ہشتی پانی پتی	۱۷۹	۵۳	فوجی ملازمت کیوں کی؟
۲۵۱	۷۹	اصل نام	۱۸۵	۵۴	فوج میں کشف و کرامت کا ظہور
۲۵۱	۸۰	سال ولادت بچپن اور ابتدائی دور	۱۹۰	۵۵	پانی بہت میں تشریف آوری
۲۵۲	۸۱	فوجی ملازمت کیوں اختیار کی	۱۹۳	۵۶	کرامت کے ذریعہ سید ہونے کا ثبوت

۲۸۰	۱۰۲ حب وطن	۲۵۳	۸۲ اسلمو کاپے پناہ شوق اور تائبیدنی
۲۸۱	۱۰۵ غم کس بات کا تھا؟		۸۳ کی عجیب و غریب مثال
۲۸۱	۱۰۶ قناعت	۲۵۴	۸۳ دوبارہ تلاش ملازمت اور ناکامی
۲۸۱	۱۰۷ مولانا کا اثر غیر مسلموں پر	۲۵۵	۸۴ قلندرانہ زندگی اور سیاحت
۲۸۳	۱۰۸ حضرت مولانا نقار اللہ صاحب	۲۵۶	۸۵ بہار
	کا بیان	۲۵۸	۸۶ چلہ کشی
۲۸۳	۱۰۹ فساد کی ابتداء	۲۵۸	۸۷ چلہ کیا ہے؟
۲۸۴	۱۱۰ امن کی کوشش	۲۵۸	۸۸ حضرت شیخ نظام الدین نارٹولی
۲۸۸	۱۱۱ گاندھی جی کی آمد		سے رابطہ اور تعلق
۲۸۹	۱۱۲ مسلمانوں کے انخلاء کا فیصلہ	۲۶۰	۸۹ تیاسات
۲۹۰	۱۱۳ دیہاتی مسلمان اور ان کا انخلاء	۲۶۲	۹۰ عجیب و غریب انکشافات
۲۹۲	۱۱۴ کانگریسی دوستوں کی غلط بیانی	۲۶۳	۹۱ مجاہدہ کی نوعیت اور توکل علی اللہ
۲۹۲	۱۱۵ ۴ دسمبر کو مہاتما گاندھی کی تشریف آوری		کی نادر مثال
۲۹۳	۱۱۶ ہتھیار	۲۶۴	۹۲ صبر و ضبط اور تسلیم و رضا
۲۹۳	۱۱۷ اسپیشل ٹرینوں کا انتظام	۲۶۴	۹۳ چند کرامتیں
۲۹۴	۱۱۸ فساد کا ذمہ دار کون تھا؟	۲۶۰	۹۴ وفات
۲۹۵	۱۱۹ انخلاء مسجد درگاہ حضرت مخدوم صاحب	۲۶۰	۹۵ مزار مبارک
۲۹۶	۱۲۰ ایک کرامت	۲۶۰	۹۶ ایک خاص کرامت
۲۹۷	۱۲۱ خواتین کی بازیابی اور ندھی آزادی	۲۶۱	۹۷ تنبیہ
۲۹۸	۱۲۲ کام کی نوعیت اور گاندھی جی کا حادثہ قتل	۲۶۳	۹۸ حضرت خواجہ عبدالرحمن گادرونی
۲۹۹	۱۲۳ دینی تعلیم کا سلسلہ	۲۶۳	۹۹ سلسلہ نسب از حضرت شاہ اعلیٰ تاج
۳۰۱	۱۲۴ تنظیم اوقات		حضرت عثمان ذی النورینؓ بجا لہ سیر لائقاً
۳۰۲	۱۲۵ سیکولرزم کا ایک خوشگوار نتیجہ	۲۶۴	۱۰۰ پانی پیت کے نام خواجہ سہیل حمد کا بیغام
۳۰۳	۱۲۶ مسلمانوں کی جائیدادوں کی واگزار کی	۲۶۸	۱۰۱ پانی پیت — انقلاب ۱۹۴۷ء اور ۱۹۴۸ء
۳۰۴	۱۲۷ متغیر عورتوں کی بازیابی		مولانا نقار اللہ عثمانی
۳۰۶	۱۲۸ خاتمہ کتاب ایک سبق جو کبھی بھی	۲۶۸	۱۰۲ مولانا نقار اللہ صاحب کا تعارف
	۱۲۹ فراموش نہ ہونا چاہیے۔	۲۶۹	۱۰۳ چند سبق آموز اور قابل تقلید شخصیتیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ
الحمد لله وكفى وسلام على عباده الذين اصطفى

پانی پت اور بزرگانِ پانی پت

عام عقیدت کے اسباب

پانی پت ہندوستان کا مشہور شہر ہے کہا جاتا ہے کہ ہندوستان کے مشہور سپہ سالار اور فاتح راجہ "ارجن" نے اس کی بنیاد رکھی تھی۔

دہلی یہاں سے جنوب کی جانب ۵۳ میل کے فاصلہ پر ہے اور جانب شمال میں تقریباً ۴۰ میل کے فاصلہ پر برادرانِ وطن کا مشہور "تیرتھ" کورک شیترا ہے جس کا دوسرا نام "تھان ایشور" تھا۔ جو بعد میں "تھانیسر" ہو گیا۔

ہندوستان کی تاریخ قدیم میں اگر "کورک شیترا" اس لئے شہرت رکھتا ہے کہ یہاں ایک خونریز معرکہ نے "حق و ناحق" کا فیصلہ کیا تھا، تو بعد کی تاریخ میں پانی پت اس لئے مشہور ہے کہ یہ بہت سی فیصلہ کن لڑائیوں کا میدان جنگ بنا جہاں متعدد بار حکمران خاندانوں یا جنگجو قوموں کی قسمت کا فیصلہ کیا گیا جس کی قیامت خیز اور خونریز لڑائیوں کے بعد پورے ملک میں بار بار علمِ انقلاب بلند ہوا۔

انقلاب ۱۹۴۶ء | دنیا کی چشم حیرت نگار نے ۱۹۴۶ء جیسا کوئی انقلاب

نہیں دیکھا ہوگا۔ کہ نہ دو بادشاہتوں میں تصادم ہوا نہ حاکم اور محکوم کے آپس میں خونریزی ہوئی حکمراں محفوظ، فوجیں محفوظ، مگر پنجاب و بنگال کے عوام تباہ و برباد۔ اس انقلاب نے پانی پت کا بھی روپ بدل دیا۔ تقریباً ۵ ہزار کی مسلم اکثریت شہر بدر، مسجدیں ویران، مدرسے برباد، مقابر و مزارات تباہ، جس شہر میں ہزاروں حافظ قرآن اور نہ صرف مرد بلکہ عورتیں بھی حافظ قرآن، اس شہر میں صرف ایک کلمہ گو باقی رہ گیا۔ جس کی قوت ایمانی نے اس کے قدم استقلال کو پہاڑ سے زیادہ مضبوط بنا دیا۔ یہ مولانا فقار اللہ صاحب عثمانی کا نفس نفیس تھا۔ خدا کا شکر ہے کہ تقریباً دو سال بعد اسی ایک جڑ سے شاخیں پھوٹی شروع ہوئیں۔ جمعیتہ علماء ہند نے آبیاری کا فرض انجام دیا۔ جس کی صورت یہ ہوئی کہ ایک اسلامی مدرسہ قائم کیا گیا۔ اللہ تعالیٰ نے اس مدرسہ کو بہترین اساتذہ قاری محمد عمر عطا فرما دیا۔ ابتداً جمعیتہ علماء ہند کی طرف سے کچھ امداد دی گئی۔ پھر وقف نواب عظمت علی خاں صاحب (آف کرنال) سے امداد مقرر ہوئی۔ اس طرح ایک تعلیمی مرکز قائم ہوا۔ پھر خدا کے فضل سے کچھ اور مسلمان بھی مختلف پیشوں کے سلسلہ میں یہاں آنے لگے۔ اب مسلمانوں کی تعداد چند سو تک پہنچ چکی ہے۔ لیکن ایک مسجد کے علاوہ باقی تمام مساجد ویران پڑی ہیں یا دو سڑک کے قبضہ میں ہیں۔ اسی طرح مقدس مزارات کے گنبد اور محرابوں کو رہائشی مکان بنے ہوئے ہیں۔ کافی جدوجہد کے بعد حضرت شاہ ابو علی قلندرؒ کی درگاہ خالی کرائی گئی ہے۔ ان حالات کی بنا پر حضرت مولانا فقار اللہ صاحب عثمانی کا اصرار

وجہ تالیف | ہوا کہ پانی پت اور بزرگانِ پانی پت کے حالات یکجا شائع کر دیے

جائیں تاکہ چشمِ عبرت کے لئے ذخیرہ رہیں۔

اگرچہ علمی بے مائیگی کے ساتھ وقت کی قلت بلکہ وقت کا صحیح معنی میں قحطِ حشر کے لئے معقول عذر تھا۔ لیکن حضرت مولانا کے ارشاد گرامی اور حضرات اکابر اولیاء اللہ

رحمہم اللہ سے فطری انس نے مجبور کیا کہ تعمیل کی کوشش کی جائے۔ لہذا نہایت انتہائی اور پراگندگی میں اس گلدستہ کی شیرازہ بندی کی جارہی ہے۔ اللہ تعالیٰ تکمیل کی توفیق بخشے اور خود اپنی جناب میں اور اپنی مخلوق کی نظر میں اس کو مقبول بنائے۔ (آمین)

ہندوستان کی سیاسی تاریخ میں
تاریخ پانی پت کا ایک نظر انداز پہلو | "پانی پت" کی شہرت انھیں سیاسی

لڑائیوں کی وجہ سے ہے۔ مگر افسوس اس اقتدار پرست سیاسی تاریخ کے وحشت خیز اور نفرت انگیز ہنگاموں میں تاریخ پانی پت کا وہ پہلو قطعاً نظر انداز ہوتا رہا جس کا تعلق اخلاق، روحانیت اور سماجی زندگی سے تھا۔ اور کسی ایک سیاسی پابند ہی فرقہ کے لحاظ سے نہیں بلکہ انسانی شرافت و عظمت اور خود ہندوستان کے مذہب پرست مزاج کے لحاظ سے اس کا بیان کرنا بہت ضروری تھا۔

چودھواں سال چل رہا ہے کہ پانی پت ۱۹۴۷ء کے اس طوفان سے آزا تھا جس نے "انقلاب" کے نام پر بھائی کو بھائی سے جدا کیا۔ یہاں تک کہ وطن عزیز کے جسم پاک کے دو ٹکڑے کر دیئے۔ یکہ دستہا ہرف ایک مولانا نقار اللہ صاحب کے علاوہ پوری مسلم آبادی یہاں سے اجڑی۔ اور ماور وطن نے وطنیت کے جسر وھاگے سے ہندو اور مسلمانوں کو باندھ رکھا تھا وہ ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا۔ کیونکہ ہندو مسلم منافرت کے وہ بیج جو انگریزی دور حکومت میں تقریباً ایک صدی پہلے بوئے گئے تھے اس وقت ان کے کڑوے پھل پوری طرح پک چکے تھے۔

لیکن کیا حیرت کی بات نہیں ہے کہ عقیدت کے وہ رشتے جو بزرگان پانی پت سے ہندو اور مسلمانوں کے مشترک طور پر ساہا سال سے جڑے چلے آ رہے تھے ان کی ایک گرہ بھی نہیں ٹوٹی۔

ایک دلچسپ معرکہ | مسلمانوں کی حکومت غرضہ ہوا ختم ہو چکی، ان کا اقتدار

مرٹ چکا، ۱۹۴۶ء نے ان کے اس پتہ کو بھی بے وزن کر دیا جو مردم شماری کے لحاظ سے پانی پت میں بھاری تھا لیکن بزرگانِ پانی پت سے عقیدت و محبت کے وہ چراغ جو برادرانِ وطن کے دلوں میں شروع سے روشن ہیں۔ آج بھی ان کی نو اسی طرح بھبک رہی ہے۔ اور عقیدت کے پھول جس طرح پہلے چڑھائے جاتے تھے آج بھی ان کے ہاں اسی طرح پہنائے جا رہے ہیں۔ یہ ایک عجیب و غریب معرہ ہے جو اگر آج تک حل نہیں ہوا تھا تو جمہوریت کے اس دور میں جس کی بنیاد میل ملاپ، انسانی بھائی چارے، ہمدردی، غمخواری اور مساوات پر رکھی جا رہی ہے ضرور حل ہونا چاہیے۔

معرہ کا حل | حقیقت یہ ہے کہ فوجی اقتدار اور شوکت و حشمت کے سامنے مغلوب انسانوں کی گردنیں ضرور جھک جاتی ہیں، مگر دل کبھی نہیں جھکتے۔ انسانوں کے دل صرف اسی کے سامنے جھکتے ہیں جو خود اپنے خالق اور معبود کے سامنے جھکا ہوا ہو جس کے دل میں انسانوں سے ہمدردی ہو۔ جو ساری مخلوق کو خالق کا کنبہ اور اس کی خیال سمجھتا ہو جس نے خلقِ خدا کی محبت کی وادی سے اپنے خالق اور معبود تک پہنچنے کا راستہ نکالا ہو جس کا عقیدہ یہ ہو کہ تَخْلَقُوا بِاِخْلَاقِ اللّٰهِ (اللہ کی خصلتیں اختیار کرو) جس کا عملی پہلو یہ ہے کہ جس طرح اللہ رب العالمین، ارحم الراحمین ہے۔ وہ بھی اسی طرح مخلیقِ خدا کے لئے سراسر رحم اور پیکرِ شفقت بنا رہے۔ اس کی آنکھیں شفقت ہر مصیبت زدہ کے لئے کھلی ہوئی ہو۔ اور اس کا کاشانہ رحم ہر ستائے ہوئے کی پناہ گاہ ہو۔ جہاں نہ رنگ و نسل کا کوئی فرق ہو اور نہ مذہب و ملت کا کوئی امتیاز ہو۔

ایک مثال | ابھی پندرہویں صدی عیسوی ختم نہیں ہوئی تھی کہ یورپ کے سفید فام، ہندوستان آنے لگے۔ ان کے تاجر آئے، ان

کے مبلغ آئے، روحانی پیشوا آئے، پھر ان کے حکمراں آئے، ان کی حکومت قائم ہوئی۔ اور ان کے اقتدار کا جھنڈا ایسا بلند ہوا کہ اس کے سامنے مسلمانوں کی شوکت و شہمت کے افسانے بھی فراموش ہو گئے۔ عیسائی مشنریوں نے انتھک کوشش اور بے شمار روپیہ خرچ کر کے اپنا مذہب پھیلانے کی کوشش کی۔ جگہ جگہ مشن اسکول، کالج اور ہسپتال بنوا کر لوگوں کو اپنی طرف مائل کیا۔ اور اس پانسو سالہ دور (۱۷۸۵ء تا ۱۹۴۷ء) میں چند لاکھ سپانڈہ ہندوستانیوں کو عیسائی بنا بھی لیا لیکن باہمی تعلقات کے اسٹیل دور میں عیسائیوں کا کوئی ایک روحانی پیشوا بھی ایسا نہیں گزرا جس کی پاک زندگی اور روحانی عظمت نے ہندو اور مسلمانوں کے دلوں کو جھکا یا ہو۔ جس کی زندگی میں سب نے مل کر اس کے "چرن" چھوئے ہیں اور مرنے کے بعد کسی بھی ہندو یا مسلمان نے اس کی تربت پر عقیدت کے پھول چڑھائے ہوں۔ اس کے برعکس پورے ہندوستان کے سینکڑوں مزارات اور درگاہوں کو چھوڑ کر صرف "پانی پت" کو لیجئے کہ یہاں بہت سے بزرگوں کی درگاہیں آج بھی ایسی ہیں جن کی طرف "خلق خدا" امنڈا مند کر آتی ہے۔ اور مسلمانوں سے زیادہ نہ سہی تو کم از کم مسلمانوں کے برابر اور ۱۹۴۷ء کے بعد جہاں مسلمان نہیں رہے وہاں صرف ہندو ہی ان کی خدمت کرتے ہیں۔ ان پر چادریں چڑھاتے ہیں، چراغ جلاتے ہیں، مٹیوں ملتے ہیں۔ اور جب خدا کے فضل سے منتیں پوری ہو جاتی ہیں تو چڑھاوے چڑھاتے ہیں۔ نذریں گزارتے ہیں۔ آخر یہ کیا بات ہے۔؟ یہ عقیدت کا ترکہ لپٹہ لپٹہ سے ان کو کیوں ملا؟ کس طرح ملا؟

اب آئیے واقعات کی دنیا کا رخ کیجئے۔ محض خیالی باتوں اور بناوٹی کہانیوں سے نہیں۔ بلکہ تاریخ کی سچی حقیقتوں سے اس عقیدت اور محبت کی وجہ معلوم کیجئے۔

مسلمان ناراض نہ ہوں آج ہمیں صاف اور سچی بات کہنی ہے۔ جب مسلمانوں نے دہلی فتح کیا۔ تو لوکیت اور شہنشاہیت

تاریخی حقیقت

کی وہ ساری آن بان اختیار کر چکے تھے جس سے اسلام نے نفرت کی کھتی۔
ملوکیت اور بادشاہت اور حقیقت بہت بڑی خود غرضی ہے اور خود غرضی بھی
زہریلی قسم کی۔ جس میں بھائی بھائی کا دشمن بن جاتا ہے۔ بیٹا باپ سے بغاوت کرتا
ہے۔ ضرورت پڑے تو باپ بیٹے کا سر قلم کراتا ہے اور ماں بیٹے کے حق میں ناگن بن
جاتی ہے۔

انھیں بادشاہوں کا مقولہ بلکہ عقیدہ تھا کہ "الملک عقیق" یعنی بادشاہت
کوئی رشتہ نہیں رکھتی۔

یہ خود پرست بادشاہ صرف بادشاہت ہی کو سب سے بڑا رشتہ اور ناتہ سمجھتے
ہیں۔ جو ان کی بادشاہت کی حفاظت کرے۔ وہ اگر غیر بھی ہے تو عزیز رشتہ دار
اور جو اس سے کچھ بھی نہ رکھے، کچھ بھی اختلاف کرے۔ وہ اگر ماں جابا بھائی یا خود
اپنے جگر کا ٹکڑا بھی ہے تو خونی دشمن۔

بارھویں صدی عیسوی کے آخر میں یعنی ۱۱۹۳ء میں مسلمانوں نے دہلی پر
قبضہ کیا۔ جو رسول خدا حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات (۶۳۲ء) پر
ساڑھے پانچ صدی سے زیادہ مدت گزر چکی تھی۔ اور اتفاق سے یہ فتح کرنے والے
بھی عرب نہیں تھے۔ بلکہ عربوں کے بعد دوسری قوموں کے اور دوسرے ملکوں کے
جنگجو اور لڑاکو سپاہی تھے جو عربوں کے اقتدار کو بھی ختم کر چکے تھے۔

بیشک انھوں نے ہندوستان میں بہت سی بلند بلند عمارتیں بنوائیں۔
بہت سی مسجدیں اور جامع مسجدیں تعمیر کرائیں۔ مزارات کے بڑے بڑے قبے اور گنبد
بنوائے، رعایا کے فائدے کے بھی بہت سے کام کئے۔ ملک کی صنعت۔ تجارت
اور زراعت کو ترقی دی۔ ہندو مسلمانوں کی تفریق مٹائی۔ مسلمانوں کی طرح ہندوؤں
کو بھی فوجوں میں بھرتی کیا۔ ان کو اونچے اونچے عہدے اور منصب بھی دیئے۔ ان کے

مندروں کو بڑی بڑی جاگیریں عطا کیں۔ یہ سب کچھ کیا مگر ان سب کی تہ میں جو جذبہ سب سے زیادہ کارفرما تھا، وہ بادشاہت کا جذبہ تھا اور یہ جذبہ ایسا تھا کہ جب ابھرتا تھا تو جس طرح کبھی سخاوت کے دریا بہاتا تھا۔ اسی طرح وہ کبھی خون کی ندیاں بھی بہا دیتا تھا۔ جس میں ڈوبنے والے غیر نہیں بلکہ بسا اوقات خود اپنے ہوتے تھے۔ اپنے ہی عزیز رشتہ دار ایک دوسرے کے قاتل۔ ایک دوسرے کے حق میں جلا د اور درندے بن جاتے تھے۔

ہمیں یہاں بادشاہت کی تاریخ لکھنی نہیں ہے کہ ثبوت کیلئے مثالیں لکھیں ہمیں بزرگانِ پانی پت اور سردست حضرت قلندر صاحب کے کچھ حالات لکھتے ہیں۔ اور اسی مناسبت سے اس زمانہ کی بادشاہت کا مختصر سا نقشہ کھینچنا ہے۔ تاکہ یہ معممہ حل ہو سکے کہ ہندو بھائیوں کے دلوں میں ان بزرگوں کی اتنی عقیدت کیوں ہے کہ سینکڑوں سال اور پچاسوں پشتیں گزر گئیں اور یہ عقیدت ختم نہیں ہوئی۔

حضرت قلندر صاحب کے زمانہ کا سیاسی ماحول | حضرت قلندر صاحب کے

بچپن میں اس خاندان کی بادشاہت تھی جس کو غلاموں کا خاندان کہا جاتا ہے اور اتفاق سے اس زمانہ میں وہ بادشاہ حکمراں تھا جو صرف اس خاندان میں نہیں بلکہ وہی کے تمام بادشاہوں میں اپنی طبیعت کی نیکی اور دل کی سبلائی میں مشہور ہے۔

یہ شمس الدین التمش کا سرب سے چھوٹا لڑکا "ناصر الدین محمود" تھا۔ اس نے اگرچہ دولت کے پوتوں میں جنم لیا تھا۔ بادشاہت کے گہوارے میں پلا بڑھا۔ اور ہمیشہ شان و شوکت کے جھولوں میں جھولتا رہا تھا۔ مگر طبیعت فقیرانہ پائی تھی ۱۲۴۶ء (۶۲۴ھ) میں اس کو بادشاہ بنایا گیا۔ بائیس سال حکومت

کی مگر اس پورے دور میں اس نے خزانہ شاہی سے اپنے لئے ایک پیسہ بھی کبھی نہیں لیا۔ اسلامی تعلیم کے مطابق اس کا عقیدہ یہی تھا۔ کہ جس کو خزانہ شاہی کہا جاتا ہے وہ بادشاہ کا نہیں بلکہ رعایا کا ہے؛ یا وہ شاہ صرف امانت دار ہے اور محافظ۔

بادشاہ اگر اس میں سے لے سکتا ہے تو صرف اتنا جتنا کوئی ایک کار پر وار حکومت یا رعایا کا کوئی ایک فرد لے سکتا ہے۔ یعنی وہ دیگر جو اوسطاً ملک کے کسی ایک باشندہ کی گذران ہو سکتی ہے۔ اور اچھا یہ ہے کہ اتنا بھی نہ لے۔

مَنْ كَانَ غَنِيًّا فَلْيَسْتَعْفِفْ وَمَنْ كَانَ فَقِيرًا فَلْيَأْكُلْ بِالْمَعْرُوفِ

(سورۃ نساء ع ۱۴)

یعنی جو مستغنی ہو (ضرورت مند نہ ہو) اس کو پاک دامن رہنا چاہیے۔ (اس دولت

کو ہاتھ نہ لگانا چاہیے) اور جو ضرورت مند ہے وہ کھا سکتا ہے عام گذران بمطابق

ناصر الدین نے اسی پہلی صورت کو اختیار کیا تھا۔ اس نے ملکی خزانہ سے

کبھی بھی اپنے یا اپنے اہل و عیال کے لئے کچھ لینا گوارا نہیں کیا وہ بہترین خطاط اور

اعلیٰ درجہ کا خوش نویس تھا۔ اس زمانہ میں خوشخطی بھی ایک شریفانہ اور اجلا پیشہ تھا

چھاپہ اس وقت تک ایجاد نہیں ہوا تھا۔ کتابیں کاتبوں سے اجرت پر لکھوائی جاتی

تھیں۔ ناصر الدین عمر بھر یہی پیشہ کرتا رہا۔ وہ بہترین خط سے قرآن شریف لکھ کر اجرت

حاصل کرتا اور اپنا خرچ چلاتا تھا۔ اس نے اپنے لئے کبھی نوکر نہیں رکھا۔ کھانا

اس کی بیوی خود بناتی تھی۔ وہ اپنے ہاتھ سے روٹی پکاتی اور گھر کا تمام کام خود کرتی

تھی۔ ایسے بادشاہ کا دور حکومت جس قدر بھی آسودہ اور پرامن ہو کم ہے چنانچہ اس

کے ہائیس سالہ دور حکومت میں چین اور آرام ہی کی رنگ رلیاں رہیں۔

ناصر الدین کا انتقال ہوا تو اس کا بیٹا یا بھائی نہیں بلکہ پرانا رفیق "غیاث الدین

بلبن" جو وزیر اعظم تھا بادشاہ بنا دیا گیا۔ کیونکہ یہی سب سے زیادہ قابل اور مستحق تھا

اور ناصر الدین کی کامیابی میں اس کی قابلیت، جانفشانی، ایمانداری اور دیانتداری کو بہت بڑا دخل رہا تھا۔

غیاث الدین بلبن ۶۶۶ھ (۶۱۲۶۷ء) سے ۶۸۶ھ (۶۱۲۸۸ء) تک بادشاہ رہا۔ ناصر الدین محمود کی طرح غیاث الدین بلبن کا دور بھی امن سے گزرا لیکن اس کے بعد وہ پُر آشوب دور شروع ہوا جس کا تصور بھی وہشت انگیز اور بھیانک ہے اس کی فتنہ سامانی اور ہولناکی کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے ۱۲۸۶ء سے حضرت قلندر صاحب کی وفات ۱۲۲۲ھ (۱۳۲۲ء) تک صرف ۳۸ سال کے عرصہ میں وہلی کے اسی تخت پر وہلی کے اسی شاہی محل میں جو جینا کے کنارے "کلو کھٹری" میں تھا جہاں آج کل ہمالیوں کا مقبرہ ہے، نو بادشاہوں نے سروں پر تاج رکھا جو یکے بعد دیگرے خود اپنے عزیزوں اور دوستوں کے ہاتھوں قتل کر دیئے گئے۔ اور ایسی عبرتناک صورت سے کہ مثلاً شالسنہ خاں (جس نے بعد میں اپنا نام فیروز شاہ رکھا) اس کا عظیم الشان کارنامہ یہ تھا کہ اس نے اپنے بادشاہ معز الدین کو ۶۸۹ھ (۱۲۹۰ء) میں اس کلو کھٹری کے محل میں موت کے گھاٹ اتارا، اس کی نعش جینا میں پھینکوائی، اس کے لڑکے "شمس الدین کیومر شاہ" کو جو چند سال کا معصوم بچہ تھا قتل کر ڈالا۔ پھر خود بھی صرف پانچ سال حکومت کرنے پایا تھا کہ ۶۹۵ھ مطابق ۱۲۹۵ء میں اپنے بھتیجے علاؤ الدین کے ہاتھوں جو داماد بھی تھا کٹرہ مانکپور کے قریب گنگا کے کنارے کشتی میں قتل کر دیا گیا۔ فرق صرف گنگا اور جینا کا رہا۔ نتیجہ ایک ہی رہا۔ کنواں نہیں کھاتی ہے جاہ کندہ راجاہ و ریش۔

حضرت قلندر صاحب کے تذکرہ میں علاؤ الدین کا ذکر بار بار آتا ہے۔ کہ اس کو حضرت قلندر سے عقیدت تھی۔ یہ علاؤ الدین ہی بزرگ ہیں۔

بہر حال علاؤ الدین کی بادشاہت ۶۹۵ھ (۱۲۹۵ء) سے ۷۱۵ھ (۱۳۱۵ء)

تک ہیں سالِ ربی۔ کہا جاتا ہے کہ اس کو بھی زہر دیدیا گیا۔ اس کے مرنے کے بعد ۱۵۷ھ سے حضرت قلندر صاحب کی سالِ وفات ۱۷۲ھ مطابق ۱۳۲۲ء تک یعنی صرف نو سال کے عرصہ میں چار بادشاہ یکے بعد دیگرے تخت پر بٹھائے گئے اور قتل کر دیئے گئے۔ بیشک یہ قتل ملک میں خفیہ سازشوں کے ذریعے ہوئے۔ فوجوں کی چڑھائی نہیں ہوئی۔ اس وجہ سے شہروں میں مارو دھاڑ اور آبادیوں کی تباہی و بربادی کی نوبت بھی نہیں آئی۔ مگر جب بادشاہ قتل ہوتا ہے تو نیا بادشاہ مقتول کے عزیزوں ہی کو نہیں بلکہ جن جن پر مقتول کی حمایت کا شبہ ہوتا ہے۔ ان سب ہی کو موت کے گھاٹ اتار دیتا ہے۔ اس کے وزیروں اور افسروں کو معزول، معطل اور قتل وغیرہ طرح طرح کی سزاؤں کے شکنجے میں کستا ہے۔ تاکہ اس کا رعب قائم ہو اور اس کی دھاک بٹھے۔ ظاہر ہے اس افراتفری سے عوام میں کتنا خوف و ہراس اور کتنی پریشانیاں اور سراسیمگی پھیلتی ہے۔

اس سلسلہ میں اسی علاؤ الدین کے ردِ قصے سن لیجئے۔ ان سے معلوم ہوگا کہ بادشاہت کیا چیز ہے۔ اور اسلام نے اس پر کیوں لعنت بھیجی ہے۔ یہاں تک کہ بادشاہ شاہنشاہ (ملک۔ ملک الاملاک) کے نام تک پسند نہیں کئے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:-

ان اختی الاسماء الی اللہ ان لیسعی ملک الملوک داو کما قال

صلی اللہ علیہ وسلم۔ (بحوالہ ترمذی)

یعنی اللہ تعالیٰ کے یہاں سب سے زیادہ مستحق ملامت و نفرت ملک الملوک

رشاہنشاہ) کا خطاب ہے۔

پہلا واقعہ جنگِ گجرات کے نتیجہ میں پیش آیا تھا۔ گجرات پر حملہ کے لئے جو فوج بھیجی گئی تھی اس میں ایک کمپنی ان تاناری نوجوانوں کی بھی تھی جو مسلمان ہو گئے تھے۔

ان کو نو مسلم مغل کہا جاتا تھا۔ فوج کی قیادت ملک نصرت کے سپرد تھی۔ جو علاؤ الدین کا مقرب اور عزیز تھا، گجرات فتح ہوا تو مال غنیمت کی تقسیم میں کچھ جھگڑا ہو گیا۔ بات یہاں تک بڑھی کہ نو مسلم مغلوں نے ملک نصرت خاں کے بھائی "ملک اعز الدین" کو مار ڈالا۔ دہلی واپس ہو کر یہ قصہ بادشاہ کے سامنے پیش ہوا۔ بادشاہ نے تو یہی فیصلہ کیا تھا کہ مجرموں کو گرفتار کر کے جیل خالوں میں ڈال دیا جائے۔ مگر ملک نصرت خاں اپنے اختیارات یہاں تک کام میں لایا کہ ان کے عورتوں اور بچوں کو بھی گرفتار کیا۔ اور بھنگیوں کو حکم دیا کہ شیر خوار بچوں کو پکڑ کر ان کی ماؤں اور بہنوں کے سروں پر اس زور سے پٹھیں کہ ان کے بدن پاش پاش ہو جائیں۔ (معاذ اللہ)

اس قسم کا ایک اور واقعہ فتح کرناٹک اور مالابار کے بعد پیش آیا۔ بادشاہ نے نو مسلم مغلوں کو فوج سے برطرف کرنا چاہا۔ ان مغلوں نے بادشاہ ہی کو ختم کر ڈالنے کی سازش شروع کر دی۔ بادشاہ کا اقبال سامنے تھا اس کو سازش کا قبل از وقت علم ہو گیا۔ پھر کیا تھا حکم دیدیا کہ پورے قلمرو میں جس قدر مغل نو مسلم ہوں سب کو ایک دن کے اندر قتل کر دیا جائے۔ فوراً حکم کی تعمیل ہوئی۔ کہا جاتا ہے کہ ۱۶، ۱۷ ہزار مغل نو مسلم ایک دن میں موت کے گھاٹ اتار دیئے گئے۔ ان کی عورتوں اور بچوں کو ذلیل اور خوار کر کے منتشر کر دیا گیا۔

بہر حال بادشاہ اور ان کے شاہ پرست ساتھی خواہ کتنے ہی عدل و انصاف اور خدا پرستی کے تحت پر جلوہ افروز ہوں۔ مگر جب بھی ان کی خود غرضی کی آخری نشا یعنی بادشاہت کے لئے کوئی خطرہ محسوس ہوتا ہے وہ درندوں سے بھی زیادہ درندہ بن کر نمودار ہوتے ہیں اور وہ سب کچھ کر ڈالتے ہیں جس کا تصور بھی رونگٹے کھڑے کرنے کے لئے کافی ہوتا ہے۔

یہ خود مسلمانوں کا حال تھا۔ جو اس وقت حکمراں تھے۔ اب ہندوؤں کو لیجئے۔

اگرچہ حکمراں حلقہ کے آپس کی مار دھاڑ اور کشت و خون کا ان پر اثر نہیں پڑتا تھا۔ اور اب مسلمانوں سے جنگ کی حالت بھی نہیں رہی تھی کیونکہ سو سال سے زیادہ کا عرصہ ہو گیا تھا کہ پورے شمالی ہند پر مسلمانوں کا قبضہ ہو چکا تھا۔ لیکن ظاہر ہے اپنے پرانے راج کی یاد ان کے دلوں میں ہمیشہ سلگتی رہتی تھی۔ اس وجہ سے ان میں اپنی مجبوری اور کمتری کا احساس قدرتی امر تھا۔ اس کے علاوہ جنوبی ہند کے راجاؤں سے چھڑ چھار چلی جاتی تھی۔ خاص علاؤ الدین خلجی کا دور تو بہت ہی زیادہ طوفانی اور ہیبت انگیز تھا۔ مہارانا چتوڑ سے علاؤ الدین کی لڑائی کے قصے آج تک مشہور ہیں۔ اور راجا جگماری پدمنی سے علاؤ الدین کے عشق و محبت کے افسانے کو اگر شاعروں کی من گھڑت مان لیا جائے، تب بھی یہ تو صحیح ہے کہ چتوڑ فتح ہونے پر بہت سے راجپوت مردوں اور عورتوں نے موت کو زندگی پر ترجیح دی۔ کیا عام ہندوؤں کے لئے یہ درد انگیز صورت رنج اور صدمہ کی بات نہیں تھی۔ بہر حال علاؤ الدین کے حملے چتوڑ تک ہی نہیں رہے وہ اس سے پہلے دہلی سے ایک ہزار میل کرناٹک تک پہنچ کر دیوگیر پر قبضہ کر چکا تھا۔ اور وہاں کے راجہ رام دیو سے سینکڑوں من سونے کے علاوہ سات من موتی دامن جواہر لعل، یاقوت، الماس، زمرد وغیرہ وصول کر چکا تھا۔ جس سے پورے ملک میں ایک تہلکہ مچ چکا تھا۔ ظاہر ہے اس قسم کی لڑائیوں سے کتنی پریشانی ہندوؤں کو ہوگی اور وہ اپنے آپ کو کتنا بے پناہ سمجھتے ہوں گے۔

اس وقت ایک طبقہ تھا جو ان بے پناہوں کی پناہ تھا۔ جو سب ہی انسانوں کا ہمدرد اور بے سہاروں کا سہارا تھا۔ جس کے دروازے ہر ایک کے لئے کھلے ہوئے تھے جس کی محبت بھری گود ہر فریادی کے لئے پھیلی ہوئی تھی۔ جو تمیموں کے سر پر ہاتھ رکھتا۔ بچھڑے ہوؤں کو سینے سے لگاتا۔ ان کی ڈھارس بندھاتا۔ ان کی مایوسیوں کو ختم کر کے زندگی کی دشواریوں کو حل کرتا۔ یہ انھیں

اولیاء اللہ کا طبقہ تھا جن کے پاس نہ تو فوجیں تھیں نہ حکومت کا کردار تھا اور نہ دولت کے خزانے تھے، نہ ان کے پاس قلعے اور محل تھے۔ مگر یہ شاہ کہلاتے تھے۔ کیونکہ بادشاہوں کی بادشاہی ظاہری دنیا پر تھی اور دلوں کی دنیا پر جو بادشاہت کرتے تھے۔ وہ یہی گڈریوں کے محل تھے جو ہاتھ خالی تھے، مگر دولت بداناں کیونکہ ہزاروں انسان دونوں وقت ان کے لنگر خانوں سے سیر ہوتے تھے۔

یہ کچے کوٹھوں چھپروں اور جھونپڑوں میں رہتے مگر قلعہ میں رہنے والوں سے زیادہ محفوظ تھے۔ کیونکہ ان کا دشمن وہی ہوتا جو خود اپنا دشمن ہوتا۔ اور اپنی تباہی خود اپنے ہاتھوں مول لیتا۔

بادشاہ ان کے محتاج ہوتے تھے۔ کیونکہ بادشاہوں کو عوام کی ضرورت ہوتی تھی۔ اور عوام ان درویشوں کے ساتھ تھے۔ وہ انھیں کے جھونپڑیوں کو اپنا قلعہ سمجھتے تھے اور انھیں کے کچے کچے گھر وندوں کو دربار اور درگاہ کہا کرتے تھے۔ آپ کو تعجب ہوگا۔ مگر یہ حقیقت ہے کہ بادشاہ ان سے ملاقات کی درخواست کرتے اور یہ ان سے کتراجاتے۔ بادشاہ ان کو جاگیر پیش کرتے اور یہ معذرت کر کے اپنا دامن جھاڑ لیتے تھے۔

انگریزوں کے زلزلے میں جو مصیبتیں عوام پر آئیں۔ انگریزوں کے نہ کسی پادری نے عوام کی مدد کی اور نہ ان کے کسی پوپ کا دامن رحم منظر مظلوموں کے لئے کشادہ ہوا۔ مگر مسلمانوں کے دور حکومت میں حکومت کے ذمہ داروں سے جو مصیبتیں پہنچیں، یہ اللہ والے فقیران مصیبتوں میں بادشاہوں کے ساتھ نہیں۔ بلکہ عام مظلوموں کے ساتھ ہوتے ان کے فریاد رس بنتے اور ان کی بگڑی کو سنوارنے کی پوری کوشش کرتے تھے۔

یہی رام دیو جس کو لوٹ کھسوٹ کر علاؤ الدین خلجی نے اپنا باج گزار بنایا تھا

اسی کے معاصر راجاؤں کے فرزند ہر دیو، سیتل دیو، چیتل دیو اور سنبھل دیو تھے۔
 "ہر دیو" تو ایک فوجی افسر "خواجہ حسن علامہ سنجری" سے (جو خراج وصول کرنے کے لئے
 "دیو گڑھ" گیا تھا) مانوس ہو گیا تھا۔ اور خواجہ حسن کی زبانی حضرت خواجہ نظام الدین
 سلطان الاولیاء کی تعریفیں سن کر ان کی زیارت کے لئے دہلی آیا تھا۔ مگر باقی تینوں جو
 ایک ہی راجہ کے بیٹے تھے اور آپس میں حقیقی بھائی تھے۔ ایک عرصہ کے بعد اپنے وطن
 سے جلا وطن ہو کر مصیبتیں جھیلنے ہوئے دہلی پہنچے تھے۔ اور ایک ہی دفعہ میں اتنے
 مالا مال ہو گئے کہ انکی ساری مصیبت دور ہو گئی۔ اور اگرچہ حضرت خواجہ کا خود اپنا کوئی
 مکان نہیں تھا۔ مگر ان تینوں نے حضرت خواجہ کی معمولی مہربانی سے اپنے لئے محل تعمیر
 کرائے۔ اس کی تفصیل نہایت پر لطف ہے مطالعہ فرمائیے اور ان بزرگوں کی عام
 شفقت و محبت کا اندازہ کر لیجئے۔

واقعہ یہ ہوا کہ سیتل دیو اور اس کے بھائیوں کو دہلی پہنچے ہوئے دو ایک
 دن ہی ہوئے تھے۔ کہ حضرت خواجہ نظام الدین رحمۃ اللہ علیہ کی تعریفیں سن کر ان کی
 زیارت کے لئے خانقاہ میں پہنچے۔ حضرت کے یہاں مریدوں کا مجمع تھا۔ جہاں حضرت
 تشریف فرما تھے وہ سارا کمرہ کچھا کچھ بکھرا ہوا تھا۔ دو بھائی باہر کھڑے رہ گئے اندر
 نہیں جاسکے۔ سیتل دیو اندر پہنچ کر اس مجمع میں بیٹھ گیا۔

غربت افلاس اور مصیبتوں کے سفر کے سبب سے چہرہ جھلسا ہوا سادھو
 وضع، کپڑے پٹے ہوئے، امیلے کچیلے۔ اس کا تصور بھی نہیں ہو سکتا تھا۔ کہ کسی ریاست
 کا راجہ کمار ہوگا۔ لوگوں نے یہی سمجھا کہ کوئی سادھو ہے جو مجلس کی رونق دیکھنے آ گیا ہو
 اتفاق سے اسی وقت علاؤ الدین بادشاہ کے دو افسر ملک نصرت خاں اور خضر خاں
 بادشاہ کے بھیجے ہوئے حاضر ہوئے۔ ان کے ساتھ دو خادم تھے جن کے سروں پر
 دو کھال (طشرت) تھے۔ جن پر زربفت کے خوان پوش پڑے ہوئے تھے حضرت

امیر خسرو ان کی قیادت کر رہے تھے۔ ان تینوں نے حضرت خواجہ نظام الدین سلطان الاولیاء
 رحمۃ اللہ علیہ کے قریب پہنچ کر بادشاہ کا سلام عرض کیا۔ خادموں کے سروں پر سے
 مقال اتار کر حضرت کے سامنے رکھے اور ان کے خوان پوش ہٹائے۔ دونوں مقال
 آبدار موتیوں سے لبالب بھرے ہوئے تھے۔ حضرت نے ان دونوں مقالوں کو دیکھا۔
 اور خاموش رہے ان شاہی انسر ان نے یہ ہدیہ پیش کر نیکی بعد اجازت چاہی اور واپس
 چلے گئے۔ حضرت خواجہ کا ایک خادم جس کا نام اقبال تھا وہ سامنے آیا۔ اور دونوں
 مقالوں کو اٹھوائے لگا۔ کہ اس فقیر نے جو سادھو انہ لبا س میں تھا۔ اور کچھ فارسی
 عربی سیکھ چکا تھا۔ بلند آواز سے کہا: "یا با نظام الہدایا مشترک" یہ عربی زبان کا مقولہ
 اس سادھو کو یاد تھا جس کا مطلب یہ ہے کہ مجمع میں جو ہدیہ پیش ہو اس میں سب کا
 حصہ ہونا چاہیے یہ درست نہیں کہ تنہا صاحب مجمع اس چیز کو استعمال کرے۔ اس طرح
 لطیف پیرا یہ میں اس سادھو نے کچھ موتی مانگے۔

حضرت خواجہ نے فوراً جواب دیا: "بل تنہا خوشترک" یعنی پورا مجمع نہیں بلکہ صرف
 تنہا آپ کے لئے یہ ہدیہ بخوشی پیش ہے۔ سادھو نے اول اس کو مذاق سمجھا۔ مگر حضرت
 خواجہ نے دوبارہ پوری سنجیدگی سے فرمایا کہ یہ دونوں مقال آپ ہی کے ہیں۔
 جب سادھو کو یقین ہو گیا کہ یہ دولت اس کو صرف اس کے ایک فقرہ پر عطا
 کر دی گئی تو ان کو اٹھانے کے لئے آگے بڑھا۔ حضرت خواجہ نے حاضرین سے فرمایا۔
 اس قلندر سے دونوں مقال نہیں اٹھیں گے کوئی ان کی مدد کرے۔ اس مجمع میں
 "ہر دیو" بھی موجود تھے۔ انھوں نے آگے بڑھ کر یہ مقال اٹھوائے اور اس خیال سے
 ساتھ ساتھ چلے کہ اس کو باہر جا کر سمجھا دیں کہ یہ بہت قیمتی موتی ہیں۔ ان کو یوں ہی
 کسی معمولی قیمت پر نہ دیدینا۔ ہر دیو خود جوہری تھا۔ وہ جوہر کی قدر جانتا تھا جب
 یہ دونوں باہر نکلے تب ہر دیو نے سادھو کو غور سے دیکھا تو اس کو شبہ ہوا کہ یہ اس

کی جان پہچان کا کوئی آدمی ہے اور وہ اس کو کہیں پہلے بھی دیکھ چکا ہے۔ غرض باہر نکل کر بات چیت شروع ہوئی تب ہر دیو کو معلوم ہوا کہ یہاں کے وطن کا راجکمار ہے جو گردش زمانہ سے گرتا پڑتا کسی طرح یہاں پہنچا ہے۔ ہر دیو جب باہر نکلا۔ تو وہاں سیتل دیو کے دونوں بھائی بھی تھے ان سے کئی ملاقات ہوئی۔ مختصر یہ کہ یہ راج کمار جو بادشاہ کے اقدام سے تباہ ہو چکے تھے حضرت خواجہ نظام الدین اولیا رحمۃ اللہ علیہ کی معمولی توجہ سے پھر دولت مند ہو گئے۔ اور جو اپنی زندگی سے آزر دہ ہو چکے تھے۔ جن کے لئے زندگی بوجھ بن گئی تھی۔ وہ معمولی نظر لطف و کرم کے طفیل میں عیش و آرام کے جھولے میں جھولنے لگے اور ان کی زندگی سدا بہار بن گئی۔

یہ ایک واقعہ ہے اس قسم کے بہت سے واقعات تاریخ کے اوراق میں پھیلے ہوئے ہیں۔ ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ درویش یہ گدا، بے نوا یہ فاقہ مست اولیا اللہ جو خود جو کی سوکھی روٹی کھا کر زندگی گزارتے تھے۔ دوسروں کے لئے خصوصاً بادشاہوں کے ستائے ہوئے مصیبتوں کے مارے ہوئے دکھی انسانوں کے لئے ابر رحمت اور بخشش و سخاوت کے دریا بے پایاں بہا کرتے تھے۔ یہ کیا چاہتے تھے؟ یہ بھی سن لیجئے :-

اسی واقعہ کو لیجئے۔ اگلے روز جب ہر دیو نے آکر پھر حضرت خواجہ کو ان سا دھوؤں کی حقیقت بتائی کہ یہ اسی ملک کے راج کمار ہیں۔ جہاں سے علاؤ الدین بادشاہ سات من موٹی لے کر آیا ہے تو حضرت خواجہ نے فرمایا۔ ہر دیو سنو! اللہ تعالیٰ کی شان نرالی ہے۔ ہر دن اس کی شان جدا ہوتی ہے۔ ایک شان ہے کہ ایک سے دوسرے کو دلایا۔ دوسری شان یہ ہے کہ جس کو دلویا تھا۔ اُس نے اُس کو واپس کر دیئے جس کے یہ موٹی تھے۔

دیکھو! ہر دیو یہ موتی سمندروں کی تہ میں سیدپ کے پریٹ میں پیدا ہوئے
 غوطہ لگانے والوں نے سیدپ دریا سے نکالے ان کا جگر چاک کر کے ان سے
 موتی نکالے، موتی بازار میں بکے جو ہریوں سے امیروں نے خریدے۔ امیروں
 سے بادشاہوں نے چھینے۔ بادشاہوں سے یہ موتی درویشوں کے یہاں آئے۔
 درویشوں نے دیکھا کہ ان کے دل میں ان موتیوں کی کوئی جگہ نہیں ہے۔ کیونکہ وہاں
 خدا کی محبت کے بہت سے آبدار موتی بھرے ہوئے ہیں۔ بس درویشوں نے یہ
 موتی ان کے حوالے کر دیئے جن کو ان کی ضرورت تھی۔ جو کہہ رہے تھے کہ موتی ہمارے
 اور ہم موتیوں کے ہیں۔ ہم نے ان کے دلوں کی آواز سنی۔ ہم نے کہا موتی تمہارے
 ہی ہوں گے۔ مگر تم موتیوں کے ہرگز نہیں ہو۔ کیونکہ ہر آدمی خدا کے لئے پیدا ہوا ہے
 ہم نے موتی دیدیئے حق بحق دار رسید۔ مگر ہم نے مفت نہیں دیئے۔ ان موتیوں
 کے بدلے ہم نے تین دل لے لئے، دل کی محبت موتیوں سے کہیں زیادہ ہے۔
 ایک دل پوری دنیا اور ما فیہا سے زیادہ قیمتی ہے۔ دل رب ذوالجلال کا جلوہ گاہ
 ہے اس کو حبت لیا تو پوری دنیا کو حبت لیا۔
 یہ ہے درویش کا تصور۔

یہی دل جو بادشاہ کی نظر میں گھاس کے تنکے کی برابر بھی نہیں جس کو وہ
 جب چاہتا ہے مسل دیتا ہے۔

یہی دل درویش کی نظر میں پوری دنیا اور اس کی تمام دولتوں سے زیادہ
 قیمتی ہے۔ کیونکہ یہ انسانیت و شرافت کا مرکز اور اس کے محبوب حقیقی کی جلوہ گاہ ہے،
 بیشک ان درویشوں اور قلندروں کو اپنے خدا سے محبت تھی، یہ خدا کے
 سچے عاشق تھے۔ اور اسی کے عشق میں رات دن مست رہتے تھے۔ ایسے مست
 کہ ان کو اپنے تن من کی خبر نہ رہتی تھی نہ اپنے فرزند و زن کی۔ مگر یہ عشق خدا، عشق

خلق خدا کے رنگ میں ظاہر ہوتا تھا۔

اُن کی بارگاہ میں نیک و بد، اچھے بُرے، مسلمان اور ہندو کا سوال نہیں تھا، بلکہ جو بُرا ہوتا تھا اس سے ان کی ہمدردیاں اور زیادہ ہوتی تھیں۔ کیونکہ یہ بزرگ انسانیت اور روحانیت کے طبیبِ حاذق ہوتے تھے۔ بُرے آدمی روحانیت کے مریض اور بیمار، طبیب اور ڈاکٹر بیماریوں سے نفرت نہیں کرتے بلکہ جو زیادہ بیمار ہوتا ہے اس سے اُن کی ہمدردیاں اور زیادہ ہوتی ہیں۔

حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فتح مکہ اور جنگِ حنین کے بعد مالِ غنیمت تقسیم کیا تو مکہ کے ان سرداروں کو زیادہ العامات دیئے جو ابھی تک مسلمان نہیں ہوئے تھے۔ اور وفادار انصار کو جنہوں نے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفاداری میں اپنا سب کچھ قربان کر دیا تھا، یہ فرما کر مطمئن کر دیا گیا تم اس پر راضی نہیں کہ مکہ کے یہ لوگ دنیا کا مال و متاع لیکر اپنے گھروں کو لوٹیں اور تم محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (اپنے محبوب) کو لیکر اپنے وطن واپس ہو۔ یہ انصار صفت درویش اور قلندر جن کے نہاں خانہ دل میں اللہ کی محبت کے بعد اگر کسی کی محبت تھی تو وہ اس کے رسول اور نبی تھے (صلی اللہ علیہ وسلم) ان کو اپنے نبی اور رسول کا بتایا ہوا یہ سبق ہمیشہ یاد رہتا تھا کہ تَخَلَّقُوا بِأَخْلَاقِ اللَّهِ یعنی عاشق اپنے معشوق اور محبوب کا رنگ و ڈھنگ اختیار کیا کرتا ہے اس کو اپنے محبوب کی خصلتوں سے بھی ایسا ہی عشق ہوتا ہے جیسا کہ اپنے محبوب سے۔ بس تمہیں اللہ سے عشق ہے تو تم اللہ کی خصلتیں اپنے اندر پیدا کرو۔ اور انہیں خصلتوں کو اپنا محبوب و معشوق بنا لو۔

اللہ تعالیٰ کی خصلتیں کیا ہیں؟ اس کی پہلی خصلت یہ ہے کہ وہ رب العالمین

ہے۔ یعنی اچھے بُرے، مسلمان غیر مسلمان، انسان غیر انسان سب کا رب، سب کا

پالنہار۔ یعنی وہ اپنے سے بے نیاز ہے۔ لیکن ہر ایک کا کارساز۔ وہ خود نہ کھاتا ہے نہ پیتا ہے نہ راحت و آرام کی اس کو ضرورت ہے۔ مگر ہر ایک کے لئے رزاق ہے، روزی رساں ہے۔ ہر ایک کے لئے راحت و آرام کے سامان مہیا کرتا ہے وہ ارحم الراحمین ہے۔ بلا امتیاز مذہب و ملت اور بلا امتیاز رنگ و نسل، ہر ایک پر رحم کرتا ہے۔ بس ان بزرگوں کا نصب العین بھی یہی تھا۔ یعنی اپنی فکر نہیں، ہر ایک کی فکر، خود اپنے سے بے نیاز، اور ہر ایک کے کام آنے والے، ہر ایک کے لئے رحم و کرم کے دیوتا۔ ہر ایک کے کارساز۔

ان بزرگوں نے قرآن شریف سے یہ سبق لیا تھا کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو نوع انسان کے ساتھ وہ ہمدردی تھی کہ اس کی فلاح و بہبود کی فکر میں خود اپنی جان کی فکر سے بے نیاز ہو گئے تھے۔ وہ خلق خدا کی ہمدردی اور غمخواری میں اپنی جان قربان کرنے کے لئے تیار ہی نہیں تھے۔ بلکہ ان کی تمنا اور آرزو تھی کہ وہ اپنی جان قربان کر دیں۔ اپنے تن، من، دھن کو اس کی راہ میں کھپا دیں۔ وہ اسی کے لئے رات دن بے چین رہتے تھے۔

ان بزرگوں نے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت کر کے یہی سوز و گداز، یہی ہمدردی، اسی طرح غوام کے لئے کھپنا، ان کے غم میں گھلنا سیکھا تھا۔ اور اسی غم خواری خلق اللہ نے ان کو خلق خدا کا محبوب بنا دیا تھا۔ بس یہ ایک قدرتی بات تھی کہ جس طرح ان کو انسانوں سے محبت تھی۔ انسانوں نے ان سے محبت کی۔ نہ صرف زندگی میں بلکہ وفات کے بعد بھی محبت کی اور کر رہے ہیں۔ سیکڑوں برس کی تاریخ نے ہزاروں لاکھوں واقعات پر پردہ ڈال دیا۔ مگر جس پر کوئی پردہ نہ پڑ سکا۔ وہ ان درد لیشیوں کی محبت ہے۔

لاکھوں باتیں انسانی ذہن سے مچھو ہوئیں۔ دلوں کی تختیوں پر ان کے

مٹے ہوئے نشان بھی باقی نہیں رہے۔ مگر ان بزرگوں کی محبت کچھ اس طرح پتھر کی لکیر بن چکی ہے کہ نہ آج تک مٹی ہے نہ آئندہ مٹے گی۔ جس طرح ان ہاک بندوں نے عشقِ خدا اور ہمدردیِ خلقِ خدا میں ابدی زندگی حاصل کی۔ اسی طرح ان کی محبت ان کے دلوں میں زندہ و جاوید ہوگی۔ جن کے لئے یہ مٹے تھے اور فنا ہوئے تھے۔

بادشاہ کے متعلق ان بزرگوں کے خیالات | راج کمار "ہردیو" سے آپ واقف ہو چکے ہیں۔ یہ

حضرت سلطان الاولیاء کی خدمت میں حاضر رہتے تھے۔ اور جب موقع ملتا تو حضرت امیر خسرو کی باتوں سے دل بہلا یا کرتے تھے۔ ہردیو کی ایک ڈائری بھی ہے جس میں وہ روزمرہ کے واقعات اور ملفوظات لکھ لیا کرتا تھا۔

ایک مجلس کی دلچسپ گفتگو آپ بھی سن لیجئے۔ اس سے ان بزرگوں کی اپنی زندگی کا نقشہ بھی سامنے آجاتا ہے اور یہ بھی معلوم ہوگا کہ ان کے خیالات بادشاہوں کے متعلق کیا ہو کرتے تھے۔

ہردیو۔ میں نے کہا حضرت (سلطان الاولیاء) دن بھر رونے رکھتے ہیں اور رات کو فقط جو کی روٹی کھاتے ہیں اس سے ان کی جسمانی طاقت بہت کم ہو جانے کا ڈر ہے۔

حضرت امیر خسرو نے جواب دیا۔ خدا کی یاد ان کے جسم کی طاقت کے لئے کافی ہے۔

ہردیو کہتے ہیں۔ میں نے امیر خسرو سے علاؤ الدین گجراتی کی برائی کرنی شروع کی اور کہا کہ وہ بہت ہی برا بادشاہ ہے۔

امیر خسرو نے میری بات سنی تو وہ بہت بہتے اور انھوں نے کہا "ہردیو" تو نے کبھی کسی ڈاکو کو دیکھا ہے۔ میں نے جواب دیا۔ ایک نہیں بہت سے ڈاکو

دیکھے ہیں۔ امیر خسرو نے پوچھا ڈاکو کس کو کہتے ہیں۔ میں نے کہا جو دوسروں کا مال لوٹ لے اور جان لے لے۔ عورتوں اور بچوں پر رحم نہ کرے اس کو ڈاکو کہتے ہیں امیر خسرو نے مسکرا کر کہا: کہ اور تو نے یہ بھی سنا ہو گا کہ ڈاکو سوائے اس گناہ کے کہ وہ دوسروں کا مال لوٹ لیتے ہیں اور بغیر رحم کے دوسروں کو مار ڈالتے ہیں۔ اور زخمی کر دیتے ہیں۔ اور برائیاں ان میں نہیں ہوتیں مثلاً وہ کبھی جھوٹ نہیں بولتے جو کچھ ان کے دل میں ہوتا ہے وہی ان کی زبان پر ہوتا ہے۔ وہ اپنا لوٹا ہوا مال غریبوں اور محتاجوں کو بانٹ دیتے ہیں۔ مہمانوں اور مسافروں کو کھانا کھلاتے ہیں لاوارث عورتوں اور بچوں کی مدد کرتے ہیں۔ اور ہر وقت خدا کی مخلوق کو فائدہ پہنچاتے رہتے ہیں۔ خدا کی عبادت کرتے ہیں۔ نماز پڑھتے ہیں۔ اور اگر ہندو ہوں تو ہمیشہ مندروں میں جاتے ہیں۔ گنگا میں نہاتے ہیں۔ تم مجھے بتاؤ کہ ان ڈاکوؤں کی یہ اچھی باتیں اچھا کہنے کے قابل ہیں یا نہیں؟

میں نے جواب دیا: جو اچھی بات ہے وہ اچھی بات ہے اور جو بری بات ہے۔ وہ بری ہے۔ پس ڈاکو مارنا برا ہے اور جتنے کام آپ نے بتائے وہ سب اچھے۔ امیر خسرو نے کہا کہ اگر میں کسی ڈاکو کے نیک کاموں کی تعریف کروں تو تم یہ تو نہیں کہو گے کہ وہ ڈاکو ہے بے رحم ہے۔ اس کی اچھی بات کی تعریف نہ کرو۔ میں تم سے یہ کہتا ہوں کہ یہ سب بادشاہ ڈاکو ہوتے ہیں۔ اور بہت بڑھیا قسم کے ڈاکو ہوتے ہیں۔ دوسروں کا ملک چھین لیتے ہیں۔ ان کو مفلس و کنگال بنا دیتے ہیں۔ اور ان کی عورتوں اور بچوں پر بھی رحم نہیں کرتے۔ مگر اس غیب کے سوا ان میں ہزاروں خوبیاں بھی ہوتی ہیں۔ وہ نماز بھی پڑھتے ہیں روزے بھی رکھتے ہیں۔ خیرات بھی کرتے ہیں۔ بھوکوں کو کھانا کھلاتے ہیں، تنگوں کو کپڑے بندھتے ہیں۔ اور کسی کی تکلیف نہیں دیکھ سکتے۔ لیکن جب ان کو شک ہو جاتا ہے۔ کسی شخص سے ان کی

بادشاہی کو خطرہ ہے تو پھر وہ رحم اور انصاف کو بھول جاتے ہیں۔ چاہے وہ شخص پیر ہو یا ان کا باپ ہو یا انکی ماں ہو یا انکی اولاد ہو یا انکا بھائی ہو۔ یہ کسی کی پرواہ نہیں کرتے اور سب کو فنا کروینا اپنا بادشاہی کا ایمان و قانون سمجھتے ہیں۔

یہی حال علاؤ الدین خلجی کا بھی سمجھو کہ وہ بھی دنیا کے بڑے سے بڑے ڈاکوؤں میں سے ایک بڑا ڈاکو ہے۔

ہر دیو! تم دہلی میں ابھی نئے آئے ہو۔ تم کو معلوم نہیں ہے کہ خود مختار بادشاہوں کے پایہ تخت میں زندگی بسر کرنا کتنا مشکل کام ہے۔ چند روز کے بعد تم کو معلوم ہو جائے گا کہ علاؤ الدین کے اکثر مصاحب اور اکثر بڑے بڑے امیر اور فوجی سردار میرے حضور کے مرید ہیں۔ سوائے چند آدمیوں کے کہ وہ فقط بادشاہ کے مرید ہیں۔ اور بادشاہ کے سوائے ان کو خدا کی ضرورت ہے نہ رسول کی ضرورت ہے وہ اگر کبھی خدا کو یاد کرتے ہیں تو فقط اس لئے کہ بادشاہ ان کو خدا پرست سمجھے، وہ رسول سے محبت ظاہر کرتے ہیں تو اس لئے کہ بادشاہ کو بھی رسول سے محبت ہے۔ وہ دلی کے پیروں کے پاس چلے جاتے ہیں۔ زمین پر سر جھکاتے ہیں۔ ان پیروں کو نذریں دیتے ہیں۔ ان پیروں سے دعائیں کراتے ہیں۔ لیکن درحقیقت وہ بادشاہوں کی نوکری کے لئے ایسا کرتے ہیں۔ کیونکہ بادشاہ ایسے سب لوگوں سے باخبر رہنا چاہتے ہیں۔ جن کا عوام پر اثر ہے۔ یہ ایک طرف پیروں کے قدموں میں سر رکھتے ہیں۔ اور دوسری طرف بادشاہ کے یہاں انھیں پیروں اور بزرگوں کی مخبری کرتے ہیں۔

حضرت امیر خسرو رحمۃ اللہ علیہ کی اس گفتگو سے اندازہ کیجئے کہ یہ بزرگ اور ان کے مصاحبین شکستہ دل اور دکھی انسانوں کی کس طرح دلداری کیا کرتے تھے عربی زبان کی یہ مشہور کہاوت بالکل صحیح ہے کہ "الْاِنْسَانُ عَبْدُ الْاِحْسَانِ"

یعنی "احسان کے جواب میں انسان غلام بن جاتا ہے" ان بزرگوں کے بھی احسانا ہوتے تھے جو احسان شناس انسانوں کو "بندہ بے دام" بنا لیتے تھے۔ ان کی محبت اور گرویدگی دل کے ہر ایک گوشہ اور بدن کے ہر ایک رگ پھمے میں یہاں تک سرایت کر جاتی تھی کہ آنے والی نسلیں بھی متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتی تھیں۔ یہی اثرات ہیں جو پشتیں گزر جانے کے بعد بھی ان کے اندر موجود ہیں۔ جن کے دادا پُر دادا پشتہا پشت پہلے ان بزرگوں کے احسانات سے متاثر ہوئے تھے۔

۲۸

۴

باب اول

حضرت شاہ ابو علی قلندر

خاندان اور نسب

آپ کا سلسلہ نسب چند واسطوں سے دین و مذہب کے سب سے بڑے مزاج شناس، وحی الہی کے عظیم المرتبت مفکر، منشا و شریعت کے سب سے بڑے مبصر، مذہبی قانون کے سب سے بڑے نکتہ و ال، تفقہ فی الدین کے جلیل القدر مقتدا امام اعظم حضرت نعمان بن ثابت ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ و رضی اللہ عنہ تک پہنچتا ہے والد ماجد کا اسم گرامی فخر الدین ہے۔ چند لہنتوں سے غالباً فوجی خدمات کی وجہ سے سالار کا خطاب نام کا جزو بن گیا ہے۔ چنانچہ فخر الدین صاحب بھی سالار فخر الدین کے نام و خطاب سے مشہور ہیں۔ اور ان کے والد ماجد اور جد ماجد کو بھی سالار لکھا جاتا ہے۔ حضرت امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ تک سلسلہ نسب یہ ہے۔

شیخ شرف الدین ابو علی قلندر خلف سالار فخر الدین بن سالار حسن بن سالار، عزیز بن ابو بکر غازی بن فارس بن عبدالرحمن بن عبدالرحیم بن محمد بن وانک بن امام نعمان ابو حنیفہ کو فی بن ثابت بن نعمان رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین (سیر الاقطاب ص ۳۲) والدہ ماجدہ کا اسم گرامی جمال بی نہایت متقی، بااوقات عابدہ و زاہدہ اللہ تعالیٰ نے حفظ کلام اللہ شریف کی دولت بھی عطا فرمائی ہے۔ اس لئے آپ کو بی بی حافظہ جمال

کہا جاتا ہے۔ (خزنیۃ الاصفیاء ص ۳۲۷)

ناپہالی سلسلہ | شیخ محمد بن احمد بن عثمان پانی پتی تیرہویں صدی ہجری کے صاحبِ قلم ہیں وہ حضرت قلندر صاحب کے ہم جد ہیں۔

یعنی قلندر صاحب کے برادر بزرگ حضرت نظام الدین صاحب عراقی کے اخلاف میں سے ہیں۔ آپ نے حضرت قلندر کے حالات و مناقب میں ایک کتاب لکھی ہے۔ اور حضرت قلندر صاحب کے اسم گرامی کی نسبت سے اس کا نام "شرف المناقب" تجویز فرمایا ہے تصنیف کی تاریخ اور سنہ کا تو علم نہیں ہو سکا۔ البتہ ایک نسخہ جو حضرت مولانا القبار اللہ صاحب عثمانی نے بڑی احتیاط سے احقر کو مرحمت فرمایا ہے۔ اس کے آخر میں تحریر ہے۔ بتاریخ نہم ماہ صفر ۱۲۵۳ھ نسخہ ہذا شرف المناقب مطابقت ۱۲۲۵ھ فصلی وقت سعید ختم شد۔ کاتب العاصی و مالک ہذا الكتاب بندہ ضعیف شیخ محمد الیسین پانی پتی عنہ

بہر حال جب یہ قلمی نسخہ آج (۱۳۸۱ھ) سے ۱۴۸ سال پرانہ ہے۔ تو تصنیف تو تقریباً دو سو برس پیشتر کی ہوگی۔

یہ شیخ محمد بن احمد صاحب تحریر فرماتے ہیں :-

شیخ فخر الدین صاحب عراقی کو حضرت خواجہ شیخ بہار الدین زکریا ملتانی قدس اللہ سرہ العزیز سے شرفِ دامادی حاصل تھا۔ لیکن یہ اہلیہ لا اول فوت ہو گئیں تو حضرت فخر الدین صاحب ہمدان تشریف لے گئے۔ وہاں حضرت سید نعمت اللہ ہمدانی کرمانی کی ہمشیرہ سے آپ نے عقد کر لیا۔ آپ اس حرم کو ساتھ لے کر عراق تشریف لی گئے۔ وہاں اس حرم سے آپ کو ایک فرزند نصیب ہوا۔ آپ نے اس کا نام "نظام الدین" رکھا۔ نظام الدین صاحب نے عراق ہی میں پرورش پائی۔ جب آپ کی عمر بارہ تیرہ سال کی ہوئی تو والدین سے اجازت لے کر بسا سلسلہ تجارت ہندوستان تشریف

لائے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ آپ نے گھوڑوں کی تجارت شروع کی اور ہندوستان گھوڑے لے کر آئے تھے۔ بہر حال جب آپ پانی پت پہنچے تو اس شہر اور اس کے قریب دجوار کے سرسبز و شاداب خطوں نے آپ کا دل موہ لیا۔ آپ یہیں رہ پڑے۔ کچھ دنوں بعد والدین سے بھی نہیں رہا گیا۔ اور وہ بھی یہیں پانی پت اپنے فرزند رشید نظام الدین صاحب کے پاس آگئے یہیں حضرت شیخ بوعلی قلندر کی ولادت ہوئی۔

شیخ فخر الدین کے متعلق "جامع العلوم" کے حوالے سے لکھا ہے:-

"والشمسند کامل حال بود۔ در علم معقول و منقول ممتاز و مشہور"

(ترجمہ:- بہت بڑے صاحب عقل و ہوش اور باکمال بزرگ تھے جو عقلی

اور نقلی علوم میں نہایت مشہور اور ممتاز تھے)

اس کے بعد آپ کے ملتان پہنچنے کا ایک نہایت عجیب واقعہ لکھا ہے کہ

آپ اپنے مدرسہ میں تشریف فرما تھے۔ کوئٹہ روڈ کا ایک گروہ آیا۔ شیخ نے ان کی خاطر مدارات کی۔ ان میں ایک نوجوان سے آپ کو اتنا انس ہو گیا کہ جب یہ قافلہ روانہ ہوا۔ تو آپ اس کے ساتھ ہوئے۔ دو چار روز اپنی اصلی وضع پر رہے۔ پھر ان قلندروں نے کہا کہ اگر آپ اس نوجوان کے ساتھ رہنا چاہتے ہیں تو شرط یہ ہے کہ آپ بھی چار ابرو کا صفایا کریں اور ہماری وضع اختیار کر لیں۔

شیخ فخر الدین کچھ اس درجہ وارفتہ تھے کہ یہ شرط قبول کر لی۔ یہ قافلہ منزلیں

طے کرتا ہوا خراسان سے ملتان پہنچ گیا۔ یہاں حضرت شیخ بہار الدین زکریا کا دسترخوان اتنا وسیع تھا کہ روزانہ سینکڑوں درویش آپ کے لنگر خانے سے کھانا کھاتے تھے۔ یہ قافلہ بھی حضرت خواجہ ملتانی کے وسیع دسترخوان سے فیض یاب ہوا۔

حضرت خواجہ مولانا فخر الدین صاحب عراقی سے کسی طرح پہلے سے واقف

تھے یا آپ نے نظر کشفی سے ان کو تار لیا تھا۔ بہر حال حضرت شیخ ملتانی کو شیخ

فخرالدین کی موجودہ حالت دیکھ کر بہت افسوس ہوا۔ آپ نے مولانا فخرالدین صاحب کو تخلیہ میں طلب فرما کر گفتگو کی۔ اور توجہ باطنی سے ایسا تصرف کیا کہ مولانا فخرالدین صاحب کو اس حالت سے نجات مل گئی اور یہ عالم سکر ختم ہوا۔ اب شیخ فخرالدین، حضرت خواجہ بہارالدین کے ممنون احسان بھی تھے اور حد درجہ معتقد بھی، جس کا لازمی تقاضا یہ تھا کہ آپ نے حضرت خواجہ ملتانی سے بیعت ہونے کی درخواست کی جو منظور ہوئی، اور آپ داخل سلسلہ ہو گئے۔

طبیعت کی یکسوئی اور مقصد کے لئے جذبہ فنا، عشق مجازی میں حاصل ہو چکا تھا۔ صرف رُخ بدلنے کی دیر تھی، حضرت خواجہ ملتانی کے فیض تصرف سے وہ رُخ بدل گیا۔ تو چند روز ہی میں مراحل سلوک طے کر کے درجہ کمال کو پہنچ گئے۔ یہاں تک کہ خود حضرت بہارالدین نے آپ کو دامادی کے لئے منتخب فرمایا۔

یہ ایک رُخ تھا کہ کس طرح عشق مجازی سے عشق حقیقی تک پہنچے۔ اور یہ کہ حضرت خواجہ بہارالدین نے کس طرح آپ کے کمال کی قدر کی، یہاں تک کہ اپنی نور چشم کو آپ کے جہالہ عقد میں منسلک کر دیا۔

اب ایک اور لطیفہ کمال احتیاط کا ملاحظہ فرمائیے۔ اگر ادب مانع نہ ہو تو آپ اس کو "تکشف" سے بھی تعبیر کر سکتے ہیں۔

واقعہ یہ ہے کہ جب ان صاحبزادی صاحبہ کی وفات ہو گئی تو حضرت خواجہ بہارالدین صاحب نے چاہا کہ دوسری لڑکی انھیں سے منسوب فرما دیر۔ آپ اپنے فرزند رشید حضرت خواجہ صدرالدین صاحب سے مشورہ فرمایا۔

حضرت خواجہ صدرالدین صاحب نے سختی سے مخالفت کی، مخالفت کی وجہ یہ تھی کہ آپ کے خیال میں شیخ فخرالدین صاحب "بندہ نفس" تھے۔ دلیل یہ بیان فرمائی گئی کہ "ایک روز میں خانقاہ کے مہمان خانہ میں کھڑا ہوا تھا۔ صبح کا وقت

تھا۔ میں نے بھائی فخر الدین صاحب کو دیکھا کہ کرتا اتارے نسیم صبا سے محفوظ ہو رہے ہیں۔ جو شخص اس درجہ حفظِ نفس میں مبتلا ہو۔ اس کو پہلے ہی لڑکی دینی مناسب نہیں تھی۔ چہ جائیکہ دوسری لڑکی بھی اسی کے حوالہ کر دی جائے۔

والد صاحب نے بہت سمجھایا کہ میاں صدر الدین یہ حفظِ نفس ایسا نہیں جو ناجائز ہو۔ فخر الدین صاحب کے لئے اتنا حفظِ نفس مباح ہے۔ مگر صدر الدین صاحب راضی نہیں ہوئے۔ بالآخر والد صاحب نے بھی صاحبزادے کی مرضی کے خلاف نکاح کر دیا مناسب نہیں سمجھا۔

اب شیخ فخر الدین صاحب آزاد ہو گئے تو حضرت شیخ سے رخصت ہو کر ہمدان پہنچے۔ وہاں سید نعمت اللہ صاحب ہمدانی کی بہن سے دوسرا نکاح کیا۔ پیٹ کھول کر گھومنا یا کرتا اتار دینا تنہائی میں یا مجمع میں شرعاً ناجائز نہیں ہے۔ کیونکہ مرد کا پیٹ اور پیچھے ستر میں داخل نہیں ہے۔ جس کا کھولنا ناجائز ہو۔ البتہ مجمع میں خلاف ادب ہے۔ لیکن حضرات صوفیا کرام کا نصب العین نفس کشی ہوتا ہے ان کے اصول کے مطابق اس طرح کا حفظِ نفس بھی ممنوع ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس زمانے میں مشائخ طریقت کیسے کیسے مجاہدے اور ریاضتیں کرایا کرتے تھے۔

سید نعمت اللہ صاحب کے متعلق شرف المناقب میں تحریر ہے کہ:-
 "سید نعمت اللہ ہمدانی کرمانی کہ مرقش ظاہر اور قصبہ ہانسی است"
 (ترجمہ:- سید نعمت اللہ ہمدانی کرمانی جن کا مزار بظاہر قصبہ ہانسی میں ہے)
 لیکن یہ تفصیل نہیں ہے کہ ہانسی میں یہ پہلے سے تھے یا بعد میں تشریف لائے
 ہانسی مشرقی پنجاب کا ایک مشہور قصبہ ہے۔

سید نعمت اللہ صاحب کی ہمیشہ جو شیخ فخر الدین صاحب سے منسوب ہوئیں۔
وہ حافظ قرآن تھیں نہایت متقی، پابند اوقات، ذاکر و مشاغل۔ غالباً جمال النصار
نام ہوگا۔ حافظہ بی بی جمال کے نام سے مشہور ہوئیں۔

صاحب شرف المناقب یہ بھی تحریر فرماتے ہیں کہ بہت سے معتبر حضرات کا
خیال ہے کہ حضرت شاہ شرف بوعلی قلندر پانی پتی۔ حضرت قطب جمال ہانسوی،
سلطان شاہ فرخ گوہالوی اور شاہ صوفی کیتھلی یہ سب خالہ زاد بھائی ہیں۔ یہاں
یہ بھی واضح ہو جانا چاہیے کہ پانی پت، ہانسی، حصار، گوہانہ، کیتھلی یہ سب مشرقی پنجاب
کے قصبات ہیں اور ایک دوسرے سے تقریباً بیس بیس میل کے فاصلہ پر یا اس سے
کچھ کم و بیش ہیں۔

حضرت شیخ فخر الدین صاحب اس دوسرے عقد کے بعد
سال ولادت | ۶۷ھ میں ہندوستان تشریف لائے۔ اور تشریف آوری
سے چار سال بعد ۷۱ھ میں دوسرے فرزند پیدا ہوئے جن کا نام شرف الدین رکھا
گیا۔ بعد میں پورا نام یہ ہو گیا۔ "شیخ شرف الدین بوعلی قلندر قتال"

ولادت کے بعد کثرت گریہ اور تسکین کی عجیب و غریب صورتیں
قب

ہے کہ ولادت کے بعد تین دن ایسے گزرے کہ یہ ہونے والے قلندر برابر روتے ہی
رہے۔ تیسرے روز شیخ فخر الدین صاحب نے مکان کے دروازے پر ایک "چرم پوش" درویش
کو دیکھا، سلام کیا۔ درویش نے سلام کا جواب دیتے ہوئے کہا: "مبارک ہو، لڑکا ہوا ہے میں اسی کو دیکھنے کے لئے منتظر کھڑا ہوں۔"
فخر الدین صاحب درویش کا ہاتھ پکڑ کر اندر لے گئے۔ درویش نے
بچہ کو دیکھا تو پیشانی کو بوسہ دیا۔ پھر دونوں کانوں میں یہ آیت پڑھی:

فَاَيْنَمَا تُولُوْا فَلَا اِنْفَاثَ وَجَدَ اللّٰهُ - جس طرف کو منہ کر لو ادھر ہی اللہ ہے،
اس آیت کی آواز جیسے ہی کانوں میں پڑی گریہ موقوف ہو گیا، آنکھیں کھل
گئیں اور وہ دھچو سنا بھی شروع کر دیا۔

درویش صاحب نے شیخ فخر الدین صاحب کو بشارت دی کہ یہ بچہ صاحب
کمال عاشقِ خدا ہوگا۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے یہ درویش نظروں سے غائب ہو گئے۔

فارسی آپ کی ماوری زبان تھی اور عربی علمی اور قانونی زبان، آپ
دونوں زبانوں کے ماہر تھے۔ اور اس زمانہ میں جو علوم و فنون

ایک فاضل کے لئے ضروری مانے جاتے تھے۔ آپ نے ان میں بھی دسترس حاصل
کی۔ شعور سخن متمدن اور مہذب انسان کا فطری ذوق ہوتا ہے اور جذبہ عشق اس

سونے پر سہاگے کا کام کرتا ہے۔ آپ کا ادبی ذوق ایک ممتاز حیثیت رکھتا ہے
آپ کا کلام نہایت سلیس، پُر معنی اور پُر مغز، یعنی سہل متمتع، آپ کے دیوان کا

ایک قلمی نسخہ اس وقت میرے سامنے ہے اور غالباً یہ مطبوعہ کبھی ہے۔ مگر عام طور
پر دستیاب نہیں ہوتا۔ البتہ آپ کی شنوی یہاں تک مشہور اور متداول ہے کہ اب

سے تقریباً پچاس سال پیشتر تک وہ کریم سعدی کی طرح فارسی کے ابتداء کی کورس
میں داخل تھی۔

آپ کے اساتذہ کے نام معلوم نہیں ہیں۔ بظاہر آپ نے پانی پت
اساتذہ ہی میں وہاں کے اساتذہ سے تعلیم پائی۔ شرف المناقب کے ایک

جملہ سے آپ کے ایک استاذ مولانا سراج الدین علی کا نام معلوم ہوتا ہے۔ جو
آپ کی وفات کے بعد بھی عرصہ تک زندہ رہے اور بروایت مصنف "شرف المناقب"

دوسو تیس سال کی عمر پائی۔
"مولانا سراج الدین علی کہ استاد آل عاشق الہی بود و دوصد

وہی سال عمر شان بود۔“

پانی پت دہلی اور سلسلہ دریں قضا | عمر عزیز کے چالیس سال
آپ نے اسی پانی پت میں

گزار دیئے جہاں کی گلیوں اور کوچوں میں آپ نے بچپن کے دن گزارے تھے۔
پھر آپ دہلی تشریف لائے سب سے پہلے آپ حضرت خواجہ قطب الدین بختیار
کاکئی اوشی قدس اللہ سرہ کی درگاہ میں حاضر ہوئے اور مسجد میں بیٹھ کر دو گانہ شکر
ادا کیا۔ خود آپ کی تحریر ہے۔

”چوں این درویش ضعیف الضعیف فقیر الحقیر شرف الدین بوعلی قلندر
پانی پتی از خط پانی پت در شہر دہلی رفت در مقام خواجہ قطب الدین بختیار
کاکئی اوشی قدس اللہ سرہ العزیز در نماز گاہ دو گانہ گزاردم و سر سجدہ بردم۔“
ترجمہ :- جب یہ ضعیف و کمزور فقیر و حقیر شرف الدین بوعلی قلندر پانی پتی۔ پانی پت
سے دہلی پہنچا۔ حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکئی رحمۃ اللہ علیہ کی قیام گاہ
پر پہنچ کر دو گانہ شکر ادا کیا اور سر بسجود ہوا۔

پھر آپ تحریر فرماتے ہیں :-

”آں روز عمر این درویش چہل سالہ بود در مینارہ دہلی سکونت کردم۔ و آنچه
مطلوب بود از خدائے تعالیٰ خواستم۔“

ترجمہ :- اس وقت اس درویش کی عمر چالیس سال تھی۔ دہلی کے مینارہ ...
(قطب مینار) کے علاقہ میں، میں نے سکونت اختیار کی۔ اور اللہ تعالیٰ
سے اپنے مقصود میں کامیابی کی دعا کی۔“

مگر صرف مینارہ دہلی میں سکونت ہی نہیں بلکہ سوانح نگاروں نے تو یہ لکھا
ہے کہ آپ نے مسجد ”قوت الاسلام“ کو درس و تدریس کا مرکز بنا لیا۔ اور چالیس

سال "قطب مینارہ" کے نیچے درس و تدریس میں گزار دیئے۔

اسٹنٹن طویل عرصہ تک درس و تدریس کا سلسلہ اس دور میں جب اللہ اور رسول کے بعد استادا اور پیروی کا درجہ مانا جاتا تھا اس کے اثرات لامحالہ یہ ہوتے تھے کہ وہی کے تمام علمی اور سیاسی حلقوں میں آپ کی عزت و عظمت کا سکہ جم جائے چنانچہ کہا جاتا ہے کہ امرائے دولت اور ارباب حکومت بھی یہاں تک متاثر تھے کہ انہوں نے پایہ تخت کا منصب قضا (حجی) آپ کے سپرد کر دیا۔ پھر آپ بیس سال تک فرائض قضا پوری احتیاط اور دیانت سے انجام دیتے رہے۔ مگر آپ نے خود اپنی تخریر میں جس کا عنوان حکمنامہ ہے۔ چالیس سال تک درس و تدریس کا ذکر نہیں کیا۔ البتہ اہل علم و دانش اور ارباب فکر کے حلقہ میں جو عظمت آپ کو حاصل تھی۔ اور اس وقت کے نامور مشائخ اور علماء و فضلا جس طرح آپ کو اپنا مسلم مقتدا اور پیشوا سمجھتے تھے اس کے متعلق آپ نے تحریر فرمایا ہے۔

جمع درویشان و دانشمندان جمع شدہ بایں درویش گفتند۔ کہ میان ما

"بزرگ" کوئی۔ مولانا وجیر الدین پاٹلی۔ مولانا ظہیر الدین بخاری۔ مولانا

صدر الدین و شریعت الدین و مولانا فخر الدین ناقلی و مولانا شریعت الدین

ترکی و مولانا معین الدین دولت آبادی و مولانا نجم الدین سمرقندی و مولانا

قطب الدین مکی و مولانا احمد بخاری و علمایان دیگر رحمۃ اللہ علیہم و الغفران

ہر یک باتفاق برس آمدند و اجازت فتویٰ کردند۔

لیکن یہ اثر و رسوخ کہ اکابر علماء اور مشائخ نے متفقہ طور پر آپ کو اپنا

بزرگ اور بڑا مان لیا۔ اور شرعی نقطہ نظر سے آپ ہی کے فیصلے اور فتوے کو

لے سب درویشوں اور علماء نے اکٹھے ہو کر اس فقیر سے فرمایا۔ کہ ہم سب سے زیادہ

بزرگ اور افضل آپ ہیں۔ اس اجتماع میں یہ حضرات شریک تھے۔

حرف آخر قرار دیا۔ ظاہر ہے دو چار سال میں حاصل نہیں ہوتا۔ اس کے لئے ایک طویل مدت درکار ہے اور بظاہر یہ بات صحیح ہے کہ چالیس سال تک آپ کے حلقہ درس کی گرم بازاری نے دانشوروں اور علماء کو مجبور کر دیا تھا کہ آپ کو عظمت و قیادت کا تاج پہنائیں اور اپنی گردنیں آپ کی عزت و حرمت کے لئے خم کریں۔ پھر آپ کی یہ تاج پوشی اس زمانے کے بادشاہوں کی طرح چند روزہ نہیں تھی۔ بلکہ بیس سال تک آپ کے انفاس قدسیہ سے مسند افتار آراستہ رہی۔ خود آپ کا ارشاد ہے۔

”بست سال فتویٰ و ادم و سبقہ گفتم“

بیس سال کے بعد بھی کسی باہر کے حریف نے یہ مسند نہیں چھینی، بلکہ خود قلندر صاحب کی گیتی فطرت سے سندانِ عشق حملہ آور ہوا اور اس نے آبدینہ علم کو پارہ پارہ کر دیا۔ پھر اہرن شوق کی دست درازی یہاں تک بڑھی کہ علم کے تمام سفینوں کو آپ نے دریائے استغراق میں غرق کر دیا۔ آپ حکمنامہ میں تحریر فرماتے ہیں۔ کہ :-

”اس درویش کو چار علم بہ تمام و کمال عطا ہوئے۔ علم شریعت، علم

طریقت، علم حقیقت اور علم معرفت“

دہلی کے جملہ فضلاء نے مل کر مجھ سے درخواست کی کہ ہمیں ایک ماہ عطا کر دیا جائے کہ ہم متفرق کتابوں کے کچھ اوراق آپ سے پڑھ لیں مگر مجھ پر جذبہ شوق کا غلبہ ہوا۔ میں دہلی سے نکل کھڑا ہوا۔ صحرا کی راہ لی۔ اول ”وزیر آباد“ پہنچا۔ وہاں دریائے جمنا کے کنارے قیام کیا۔ رات وہیں گزار لی جب صبح ہوئی تو جتنی کتابیں میرے پاس تھیں سب کو دریا میں ڈال دیا۔

دو ماہ :- پنڈت لکھیا باپچ کر پوتھی ہالی توریہ سکھ کے انجیر میٹ کر من میں سائیں لوڑ

ترک فتوے و کتاب کر دم و مشغول بزہد و طاعت گشتم۔

اس کے بعد آپ پانی پت تشریف لائے۔ پانی پت پہنچنے کی تاریخ
۱۴ محرم الحرام تحریر فرمائی ہے۔ مگر سند تحریر نہیں ہے۔

یہاں بطور معترضہ حکمنامہ کا تعارف کرایا جاتا ہے
حکمنامہ کیا ہے؟ جس کا تذکرہ سطور بالا میں چند بار آیا ہے۔

حضرت مولانا تقار اللہ صاحب نے "دیوان حضرت شاہ بوعلی قلندر" کا
ایک قلمی نسخہ احقر کو مرحمت فرمایا ہے۔ اس کے آخر میں یہ حکمنامہ درج ہے۔
جس کے کل ۵ صفحات ہیں۔ یہ گویا حضرت شاہ قلندر صاحب کی خود نوشت
مختصر سوانح ہے۔ پہلے اور دوسرے صفحہ کے چند اقتباسات سطور بالا میں پیش
کئے گئے۔ کچھ اقتباسات آئندہ سطور میں پیش کئے جائیں گے۔ اب شانِ قلندری
ملاحظہ فرمائیے۔ کہ اس مختصر کا بھی تقریباً ڈیڑھ صفحہ اشعار سے بھرا ہوا ہے جو ایک
معنی نے آپ کی فرمائش پر پڑھے ہیں۔ گویا خود آپ کی نظر میں اپنی سوانح کا یہ ایسا
واقعہ ہے جس کو مختصر سے مختصر سوانح میں بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا تھا۔

اب واقعہ ملاحظہ فرمائیے اور دلچسپی لیجئے۔ واقعہ یہ ہے کہ رمضان شریف
کی ستائیسویں شرب اور جمعہ کی رات تھی کہ شوقِ الہی نے ایک کیفیت پیدا کی۔
آپ نے اسی عالم کیفیت میں اپنے مخلص مولانا سراج الدین رکوعی سے فرمایا۔

"کسے را بیارتا چند غزل در علم موسیقی بخواند تا وقت ما خوش و خرم شود۔"

ترجمہ:- کسی کو بلا لوتا کہ فن موسیقی کے ساتھ چند غزلیں سنا دے جس سے ہمارا

یہ وقت پرفرت و پرنشاط ہو جائے۔

مولانا نے دریافت فرمایا:- کس کو بلاؤں۔ آپ نے فرمایا۔

ابراہیم کے لڑکے کو بلاؤ۔ جس کا نام زکریا ہے اور شہید الشہیدی (۹)۔

کے روضہ کے قریب اس کا مکان ہے۔“
 مولانا سراج الدین صاحب اس لڑکے کو لے آئے۔ اس کی عمر ۱۱ سال تھی۔
 اس نے دو غزلیں پڑھیں۔ پانچ شعر ایک غزل میں ہیں جس کا مطلع ہے۔
 ساربان با اشتراں مسرت در رفتار مسرت
 میر مسرت و خواجہ مسرت و یار مسرت اغیار مسرت
 پندرہ شعر دوسری غزل میں ہیں۔ یہ غزل خود حضرت قلندر صاحب کی ہے
 اس کا مطلع ہے۔

با صورت آدم نبرد سجدہ عزازیل
 ناں مدعی آرد بتو در سجدہ ماقیل
 اور آخری مقطع یہ ہے۔

در روئے تو دیدہ شرف اسرار عجائب
 کز دئے نتوال کرد حکایات بہ تمثیل
 ہاں بوعلی از مدعیان ہیچ زنجی
 با صورت آدم نبرد سجدہ عزازیل
 حضرت قلندر صاحب اتنے محفوظ ہوئے کہ آپ نے لڑکے کو قریب بلا کر
 اس کی کمر پر ہاتھ رکھا اور فرمایا۔

”بیٹا تم ہمارے ہو۔ لڑکوں بالوں کا ایک انبوہ تمہیں اللہ تعالیٰ
 بخشے گا۔ تمہارے گھوڑوں کا اصطلیل (خیل خانہ) بہت بڑا ہوگا۔“
 پھر آپ نے مولانا سراج الدین رکوعی سے فرمایا۔

”جبہ و دستار را بیارتا من بریں پس عطا کنم۔“

ترجمہ :- (جبہ و دستار لے آؤ تاکہ اس لڑکے کو دے دوں۔)

مولانا سراج الدین صاحب نے حکم کی تعمیل کی۔ جب یہ دوستار لاکر پیش کر دیا آپ نے یہ خلعت اس لڑکے کو عنایت فرمایا۔ اس کی برکت یہ کھٹی کہ پھوڑے ہی پھوڑے میں لوگوں نے دیکھ لیا۔

”آں لپسہ و حضرت صمدیت مقبول شد۔“

ترجمہ :- (وہ لڑکا مقبول بارگاہ اور خدارسیدہ بزرگ ہو گیا)

یہ تو حکمنامہ ہوا اب اس کی تاثیر ملاحظہ فرمائیے جو تاثیر علمدار کرام نے ”حزب الحجرت“ کی بیان کی ہے۔ تقریباً اسی قسم کی تاثیر اس حکمنامہ کی بھی تحریر کی گئی ہے۔ اور اسی وجہ سے شیخ محمد عرف غلام لیسین نے اس کو اپنے پاس محفوظ رکھنے کے لئے تبرکاً و تینتاً نقل کیا ہے۔

(بتاریخ نوز و ہم ۱۳۳۶ھ ص ۳۷) المعظم (یوم جمعہ) بعہد والاسپہر
چاہ محمد اکبر بادشاہ غازی خلف حضرت شاہ عالم عالی گوہر مغفور۔
یعنی آج سے تقریباً ڈیڑھ سو برس پہلے۔ مگر خود غلط بود آنچه ما پنداشتیم
ایک طرف شیخ محمد صاحب کا یہ حسن اعتقاد ہے۔ دوسری جانب ایک محقق کی تحقیق
ملاحظہ فرمائیے۔ حضرت مولانا عبدالحق صاحب محدث دہلوی تحریر فرماتے ہیں۔
رسالہ دیگر در عوام الناس شہرت دارو کہ اور احکمنامہ شیخ شرف الدین
می گویند۔ ظاہر آنست کہ آن از مختصرات عوام است۔ واللہ اعلم
(اخبار الاخیار)

یعنی یہ حکمنامہ کوئی حقیقت نہیں رکھتا۔ حضرت قلندر صاحب کی
طرف اس کا انتساب بھی غلط ہے۔ یہ محض عوام کی گھڑی ہوئی تحریر

ہے۔ (رواللداعلم بالصواب)

مشائخ اور مریدین | مصنف شرف المناقب مولانا محمد بن احمد بن عثمان

کی رائے یہ ہے کہ آپ اگرچہ اپنے زمانہ کے متعدد مشائخ کی خدمت میں حاضر رہے مگر
درحقیقت آپ کی تربیت براہ راست صدر نشین منصف ولایت جناب حضرت علی بن
ابی طالبؑ کی روح مقدس سے ہوئی ہے۔ مولانا محمد صاحب فرماتے ہیں کہ "اگرچہ
بعض حضرات فرماتے ہیں کہ آپ حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ سے بیعت تھے۔
کسی کا خیال ہے کہ آپ شیخ شہاب الدین عاشق خدا خلیفہ امام الدین ابدالی سے
بیعت تھے (بن کا مزار دہلی میں ہے) مگر

"انچہ بہ فقیر تحقیق پیوست ہمیں سرت کہ از روح مقدس حضرت
امیر المومنین حضرت علی رضی اللہ عنہ تربیت شدہ وار علوم اولین و آخرین
بہرہ یاب گشتہ اند"

ترجمہ :- (اس فقیر کی تحقیق میں جو بات ثابت ہوئی ہے وہ یہ ہے کہ حضرت
امیر المومنین سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی روح مقدس سے تربیت ہوئی۔
اور آپ کے ان علوم سے جو اگلے پچھلے علوم پر حاوی تھے حضرت قلندر
صاحب فیض یاب ہوئے ہیں۔

مولانا موصوف نے اپنے اس دعوے کی تین دلیلیں پیش کی ہیں۔ اول یہ
کہ کسی کتاب یا رسالہ میں یہ میری نظر سے نہیں گذرا کہ آپ کسی سے بیعت ہوئے ہیں
ہاں یہ ضرور ہے کہ آپ حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ کی خدمت
میں حاضر ہوا کرتے تھے۔

دوم مولانا شیخ عبدالحق محدث دہلوی اپنی مشہور تصنیف "اجارا لاخبار"
میں تحریر فرماتے ہیں۔

"نسبت ارادت ادا زیکے از مشائخ مشہور نیست۔ بعضے گویند
خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ کی ارادت داشت۔ بعضے گویند شیخ

نظام الدین اولیاء و شیخ یکے ازیں رو بصحت نرسیدہ است۔
 ترجمہ :- اس زمانہ کے مشہور مشائخ میں سے کسی سے بھی ان کو ارادت و بیعت
 کا تعلق نہیں ہے۔ بعض علماء کہتے ہیں کہ خواجہ قطب الدین بختیار کاکی
 سے بیعت تھے کسی کا خیال ہے کہ حضرت نظام الدین اولیاء سے تعلق ارادت
 رکھتے تھے۔ ان میں سے کوئی بھی صحیح نہیں ہے۔

تیسری دلیل - شیخ کالہ کی ایک روایت ہے۔ شیخ کالہ حضرت قلندر صاحب
 کے برادر زادے تھے وہ فرماتے ہیں کہ شیخ عثمان جو حضرت قلندر کے مخصوص
 ارادت مندوں میں سے تھے وہ فرمایا کرتے تھے کہ ایک دن حضرت قلندر صاحب
 کے استاد مولانا سراج الدین صاحب لکی سے دریافت کیا کہ ان عاشق الہی (قلندر صاحب)
 کس کے مرید تھے۔ مولانا سراج الدین صاحب نے جرتہ جواب دیا کہ امیر المؤمنین حضرت
 علی رضی اللہ عنہ کے۔ اس شخص نے پھر عرض کیا - مشہور تو یہ ہے کہ شاہ شہاب الدین
 سے مرید تھے۔

مولانا سراج الدین نے جواب میں فرمایا :-

برادر من! بیشک عوام کو اسی بیعت و ارادت کا علم ہوتا ہے جو ظاہر میں کسی
 سے ہوتی ہے۔ لیکن اصل ارادت وہ ہے جو روحانیت کے لحاظ سے ہو جس سے
 کسی کی روحانیت کی تعمیر و تربیت ہو۔ اس کا ہر ایک کو علم نہیں ہوتا۔ اس کو وہی
 جانتے ہیں جو اس کے راز داں ہوتے ہیں۔

پھر مولانا نے فرمایا :- میں نے خود شیخ شرف الدین صاحب کی زبان سے
 بارہا سنا ہے کہ وہ فرمایا کرتے تھے -

”مرا فیض روحانی از جناب حضرت علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہ رسیدہ است۔

چنانچہ پر تو آفتاب بردیوار می تابد و او منور می شود۔ (شرف المناقب)

یعنی: "جس طرح آفتاب کی کرنیں دیوار پر پڑتی ہیں تو دیوار منور ہو جاتی ہے۔ اسی طرح حضرت علی رضی اللہ عنہ کے آفتاب فیض کی شعاعوں نے میری تربیت فرمائی ہے۔"

صاحب شرف المناقب کی رائے سے اس حد تک تو ہمیں بھی اتفاق ہے کہ حضرت قلندر صاحب حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی رحمۃ اللہ علیہ سے بیعت نہیں تھے کیونکہ حکمنانہ کی تصریح کے بموجب حضرت قلندر صاحب چالیس سال کی عمر میں دہلی تشریف لے گئے ہیں یعنی ۶۲۲ھ میں اور حضرت قطب صاحب رحمۃ اللہ علیہ اس سے گیارہ سال پہلے ۶۳۳ھ میں وفات پا چکے ہیں۔ لہذا بلا واسطہ حضرت قطب صاحب سے بیعت ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا لیکن اس تحقیق کی بنا پر شرف المناقب کا یہ ارشاد بھی صحیح نہیں ہے کہ:-

"گاہ گاہ آں عاشق الہی بخدمت خواجہ قطب الدین دہلوی می رفتند۔ و

آنحضرت برایشال توجہ و الطاف می فرمودند۔ و در انجمن شوق و مجلس

صحبت خواجہ صاحب موصوف حاضر می شدند۔"

ترجمہ:- یعنی کبھی کبھی قطب صاحب حضرت قطب صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا

کرتے تھے اور قطب صاحب خاص توجہ اور لطف و کرم فرماتے تھے۔ اور

حضرت قطب صاحب کی انجمن شوق اور مجلس تلقین میں بھی حاضر ہوا کرتے تھے۔"

بہر حال صاحب شرف المناقب کی رائے کے اتنے حصے سے ہمیں اتفاق ہے۔

کہ آپ حضرت قطب صاحب سے بلا واسطہ بیعت نہیں تھے لیکن اس سے ہمیں اتفاق نہیں کہ آپ کسی سے کبھی بیعت نہیں تھے۔

صاحب شرف المناقب فرماتے ہیں کہ میں نے کسی کتاب میں نہیں دیکھا۔

یہ درست ہے آپ نے اپنی زیر مطالعہ کتابوں میں سے کسی کتاب میں نہیں دیکھا۔

ہوگا۔ لیکن عجیب بات یہ ہے کہ آپ نے حضرت مولانا سراج الدین علی کامرکا لہ نقل کر کے خود اپنی کتاب میں قلندر صاحب کے بیعت ہونے کی تصدیق فرمادی ہے۔ کیونکہ مولانا علی نے اس سے انکار نہیں فرمایا کہ قلندر صاحب حضرت شاہ شہاب الدین صاحب سے بیعت نہیں تھے۔ آپ نے یہ فرمایا کہ تربیت آپ کی شاہ شہاب الدین نے نہیں فرمائی۔ بلکہ تربیت حضرت شیر خدا علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے فیض روحانی سے ہوئی ہے۔ اس سے بیعت کی نفی نہیں ہوئی۔ اس کے علاوہ اس سے بھی زیادہ عجیب بات یہ ہے کہ انھیں کے وطن عزیز "پانی پت" کے سوانح نگار شیخ اللہ دیا بن شیخ عبدالرحیم۔ ابن شیخ پناہ حکیم حشمتی عثمانی اپنی مشہور تصنیف سیرت الاقطاب میں تحریر فرماتے ہیں :-

”و زبیت شجرہ و خلافت کہ لقطب الشاہدین حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی اوشی قدس اللہ سرہ العزیز طے پیوند۔ بدیں طریق حضرت قطب ابدال مخدوم شیخ شرف الدین بوعلی قلندر مرید و خلیفہ حضرت شیخ شہاب الدین عاشق خداست و ہومن شیخ امام الدین ابدال و ہومن حضرت شیخ بدر الدین غزنوی و ہومن قطب الاقطاب حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی اوشی قدس اللہ سرہ العزیز رحمۃ اللہ علیہم اجمعین۔“

ترجمہ :- آپ کا شجرہ بیعت و خلافت جو حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی رحمۃ اللہ علیہ تک پہنچتا ہے۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ حضرت قلندر شیخ شہاب الدین کے خلیفہ ہیں جو عاشق خدا کے لقب سے مشہور تھے۔ شیخ شہاب الدین شیخ امام الدین ابدال کے خلیفہ۔ شیخ امام الدین نے شیخ بدر الدین غزنوی سے خرقہ خلافت حاصل کیا اور شیخ بدر الدین حضرت قطب صاحب کے خلیفہ مجاز تھے۔ رحمۃ اللہ علیہم اجمعین۔

صاحب شرف المناقب (محمد بن احمد بن عثمان) غالباً تیرہویں صدی ہجری کے مصنف ہیں اور سیر الاقطاب اس سے دو سو سال پہلے (درسنہ ہشت و ثلاثین و الف) ۱۰۳۸ھ (جہانگیر بادشاہ) کے زمانہ کی تصنیف ہے۔ تعجب ہے صاحب شرف المناقب کے مطالعہ سے نہیں گذری۔ باقی رہا حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ کا یہ ارشاد کہ "نسبت ارادت اوجیکے ازیں مشائخ مشہور نیست" تو محدث صاحب نے اس زمانہ کے مشہور مشائخ طریقت سے بیعت کی نفی کی ہے۔ حضرت شہاب الدین صاحب اس زمانہ کے مشہور مشائخ طریقت میں نہیں تھے۔ غالباً اسی وجہ سے حضرت محدث صاحب نے اپنی مشہور تصنیف "اخبار الاخیار" میں ان کا ذکر بھی نہیں کیا ہے۔ مختصر یہ کہ حضرت قلندر صاحب قاعدے کے مطابق حضرت شیخ شہاب الدین عاشقِ خدا سے بیعت تھے۔ البتہ فیض روحانی آپ کو سیدنا حضرت علی رضی اللہ عنہ سے حاصل ہوا ہے۔ (واللہ اعلم بالصواب) اس کے علاوہ ایک اور روایت بھی ہے جس کو اعرا سنامہ کے حوالہ سے حضرت مولانا عبدالحق صاحب نے نقل کیا ہے کہ آپ نے شیخ شمس الدین تبریزی سے خرقہ خلافت حاصل کیا۔ حضرت شمس الدین تبریزی۔ حضرت شیخ قطب الدین البری کے خلیفہ تھے اور حضرت شیخ قطب الدین حضرت شیخ ضیاء الدین ابی التجیب عبدالقاسم سہروردی کے خلیفہ تھے۔ اگر یہ روایت صحیح مانی جائے تو اس کی توجیہ یہ ہوگی کہ سلسلہ چشتیہ میں آپ نے حضرت شیخ شہاب الدین سے نسبت حاصل کی ہو اور سلسلہ سہروردیہ میں حضرت شیخ شمس الدین تبریزی سے۔

مریدین | اس سلسلہ میں "حکمتانہ" کا اقتباس پیش کیا جا رہا ہے ارشاد ہے۔

"میں مرید بھی کیا کرتا تھا اس درویش کے کچھ مرید سلاطین اور خواقین تھے

جیسے سلطان جلال الدین سلطان علاء الدین، خضر خاں، آصف خاں،

اور سیف خاں۔

اس کے بعد "حکمنامہ کے الفاظ کا ترجمہ یہ ہے۔

"جو شخص اس درویش رقلندر صاحب کے پاس آتا تھا اپنی مراد میں کامیاب ہو جاتا تھا۔ چنانچہ میرے کچھ مرید ایسے ہوئے ہیں جو گرم تنور میں نماز پڑھ لیا کرتے تھے۔ کچھ مرید ایسے تھے جو آبِ رواں پر مصلے بچھایا کرتے تھے اور وہ مصلے تر نہیں ہوتا تھا۔"

اس کے بعد قلندر صاحب کا ارشاد حکمنامہ میں نقل کیا گیا ہے کہ پانچ چھ تاجدار بادشاہ اس درویش کے آستانہ پر حاضر ہو کر آستانہ بوسی کیا کرتے تھے۔ آستانہ قلندری پر بادشاہوں کی حاضری مسلم ہے۔ باقی جہاں تک تنور میں نماز پڑھنے اور آبِ رواں پر مصلے بچھانے کا تعلق ہے تو اگرچہ ہمارا عقیدہ ہے کہ "کرامات الاولیاء حق" مگر یہ بھی نظر انداز نہ ہونا چاہیے۔ کہ حضرت مجدد الف ثانیؒ اور ان جیسے دوسرے اکابر اس طرح کی کرامتوں کو "مقبولیت" اور "تقرب الی اللہ" کا مدار قرار نہیں دیتے۔ بلکہ ان حضرات کی تحقیق یہ ہے کہ اس طرح کی کرامتیں بسا اوقات تقرب کے بجائے بعد کا سبب بن جاتی ہیں۔ کیونکہ اگر کسی شخص کو اس طرح کی کرامتوں پر ناز ہو گیا۔ تو یہ فخر و ناز خدا بینی کے بجائے خود بینی کے دام میں الجھا دیتا ہے۔

حضرات علماء کرام کے عقیدہ کے مطابق قرب اور مقبولیت عند اللہ کا مدار اتباع سنت ہے۔ کیونکہ ظاہر ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جملہ مقربین کے سر تاج ہیں۔ آپ کے اخلاق کی تعریف خود قرآن پاک میں موجود ہے۔ اور آپ کے کردار اور اسوہ کو نشانِ مقبولیت بنا یا گیا ہے۔ لقد کان لکم فی رسول اللہ اسوۃ حسنہ نیز ارشاد ہے۔ قل ان کنتمہ تجتوبون اللہ فاتبعونی۔ اس کے علاوہ حضرت شیخ عبدالحق صاحب کی یہ تحقیق بھی فراموش نہ ہونی چاہیے کہ "حکمنامہ از مختصرات عوام ست

بہر حال حضرت قلندر صاحب کے متعلق "حکمنانہ" کی شہادت یہ ہے کہ وہ مرید بھی کیا کرتے تھے۔ بظاہر "قیامِ دہلی" کے زمانہ میں یہ سلسلہ جاری رہا۔ یہاں تک کہ جب ہاتھ جذبے صحرا لوزوی کی دعوت دی اور آپ نے وزیر آباد کے قریب دریائے جن کے کنارے رات گزار کر صبح کو "سفینہ علم" اور "اوراق دانش" کو غرقاب کیا۔ پھر آپ حدودِ پانی پت میں داخل ہوئے تو اس وقت بھی ڈیڑھ ہزار نفوس آپ کے ساتھ تھے۔ جن کو آپ نے مفارقت کی تلخی چکھوائی۔

"ترکِ فتیے و کتابِ گرفتہ و مشغولِ بزہد و طاعت شرم چہار دہم ماہ محرم بود

کہ در حد پانی پت در آدم۔ پانصد و ہزار نفر ہمراہ بود گذرانیدم بعد ازاں

در خطہ پانی پت نزول خود کردم۔ (حکمنامہ)

ترجمہ :- فتویٰ لکھنا بھی چھوڑ دیا اور کتابوں کا مطالعہ بھی ترک کر دیا اور زہد و طاعت

میں مشغول ہو گیا۔ محرم کی چودھویں کو پانی پت میں داخل ہوا۔ ڈیڑھ ہزار

آدمی ساتھ تھے۔ سب کو رخصت کر دیا۔ اس کے بعد پانی پت کے علاقہ میں

فروکش ہو گیا۔

اب نہ پیری ہے نہ مریدی۔ جو کچھ ہے قلندری ہی قلندری ہے جس کی تفسیر

راگے آئے گی انشائاً اللہ مختصر یہ کہ۔

عشق اول، عشق آخر، عشق کل

عشق شاخ و عشق نخل و عشق گل

بے نیازی ہی نہیں ہے کہ کتابوں کو دریا برد

کر دیا۔ بلکہ اس سے پہلے ہزار و ہزار ذخیرانہ

(حکمنامہ)

بیت المال کشیدہ در راہ خدا تعالیٰ صدقہِ دائم۔

پھر اس کے بعد :-

”پنج شش بادشاہان و تاجداران و آستانہ این درویش آندہ آستان
 بوسی می کردند۔ از کسے دانکے درمے قبول نمی کردم کہ مرا خزانہ الہی موجود بود۔
 بہر کہ مے خواستم میدادم و نصیب خودمے بردند و این خزانہ برابر خود میدادتم۔
 ترجمہ :- پنج چھ بادشاہ اور تاجدار اس فقیر کی چوکھٹ پر حاضر ہو کر آستانہ بوسی
 کرتے تھے۔ میں کسی سے کبھی ایک جبہ یا ایک درہم بھی منظور نہیں کرتا تھا۔
 کہ میرے لئے اللہ تعالیٰ کا خزانہ کافی ہے جس کو جو چاہتا تھا دے دیتا
 تھا۔ ہر شخص اپنا حصہ مجھ سے لے جاتا تھا۔ میرا خزانہ جوں کاتوں باقی
 رہتا تھا۔“

یہ خزانہ کیسا تھا؟ خزانہ تھا یا قلندرانہ تصور تھا۔ ہم تو سمجھتے ہیں سب سے
 بڑا خزانہ وہ ضمیر منیر تھا جو ہر ایک خزانہ سے مستثنیٰ ہو چکا تھا۔ سرور کائنات خیر موجودات
 کا ارشاد ہے (صلی اللہ علیہ وسلم)

خیر الغناضنا القلب دسب سے بہتر دولت مندی قلب کا استغنا رہے

اے کہ پرسی چہ کسانیم و چہ سامان داریم

انچہ بیچ نیزد و جہاں آل داریم

ترجمہ :- تم پوچھتے ہو ہم کون ہیں؟ کیا سامان رکھتے ہیں ہم وہ رکھتے ہیں کہ دنیا کی
 کوئی چیز اس کی قیمت کو نہیں پہنچتی۔

خود قلندر صاحب کے الفاظ میں اس حدیث کی تفسیر ملاحظہ ہو ارشاد ہے۔

زُہد و تقویٰ چسپیت اے مرد فقیر!

لاطمع بودن ز سلطان و امیر

گر بدست آید ترا گنج نقود

ورنداری بہمت عالی چہ سود

ترجمہ :- اے مرد فقیر زہد و تقویٰ کیا ہے؟ زہد و تقویٰ یہ ہے کہ کسی بادشاہ یا دولت مند سے کوئی توقع نہ رکھنا۔ اگر بیشمار سگوں کا خزانہ تمہیں مل جائے، اگر تمہاری ہمت بلند نہیں ہے تو یہ دولت مند ہی بے فائدہ ہے۔

تصنیفات | دیوان کا تذکرہ پہلے آچکا۔ ثنوی بوعلی شاہ قلندر ایک مشہور ثنوی ہے اس کے انداز سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس زمانہ میں لکھی گئی جب بقول قلندر صاحب "ترک فتوے و کتاب گرفتیم" چنانچہ پہلا شعر ملاحظہ فرمائیے وہ اسی عشق کل کی غمازی کر رہا ہے جس کا نام قلندری ہے۔ ارشاد ہے۔

مرجبا اے بلبل باغ کہن
از گل رعنا بگو با ما سخن

ترجمہ :- اے پرانے باغ کی بلبل خوب آئی۔ اس گل رعنا کی کچھ باتیں ہم سے کہو۔
پھر ارشاد ہے :-

عشق بازی می کنم با او مدام
یافت آدم از طفیل عشق کام

ترجمہ :- میں ہمیشہ اس سے عشق بازی کرتا ہوں۔ عشق بازی وہ جوہر ہے کہ اسی کی بنیاد پر حضرت آدمؑ مقصد میں کامیاب ہوئے۔

(۳) حال ہی میں غزلیوں اور ثنویوں کا ایک مجموعہ کتب خانہ یوسف احمد شاہ نے شائع کیا ہے۔ کلام قلندری اس کا نام ہے۔ اس میں ثنوی اور دیوان مذکور کے اشعار بھی ہیں اور ان کے علاوہ کبھی تقریباً سترہ سو شعر ہیں۔ کل مجموعہ میں تقریباً چار ہزار شعر ہیں۔ ملنے کا پتہ :- مولانا محمد ثنات علی۔ روہڑے تل گبند سلطان شاہی حیدرآباد (دکن)۔

(۴) حکمنامہ کا نہ صرف تذکرہ بلکہ اس کے اقتباسات بھی آپ ملاحظہ فرما چکے ہیں۔
اس کو حکمنامہ شیخ شرف الدین بوعلی قلندر کہا جاتا ہے۔ مگر یہ بھی آپ پڑھ چکے ہیں۔
کہ حضرت مولانا عبدالحق صاحب دہلوی کی رائے اس کے متعلق یہ ہے کہ۔

”از مختصرات عوام اسدت“

البتہ حضرت مولانا دہلویؒ ایک مکتوب کی تصدیق کرتے ہیں کہ:-

”اور مکتوب ست بزبان عشق و محبت، مشتمل بر معارف و حقائق توحید و

ترک دنیا و طالب آخرت و محبت مولیٰ۔ جملہ آل بنام اختیار الدین می گویند“

ترجمہ:- آپ کا ایک مکتوب ہے۔ یہ مکتوب عشق و محبت کی زبان میں لکھا ہے۔

معارف و حقائق توحید، ترک دنیا، طلب آخرت اور محبت مولیٰ کے

مضامین اس میں سمو دیئے گئے ہیں۔ اختیار الدین صاحب مکتوباً لہ

ہیں جن کے نام یہ خط لکھا گیا ہے۔“

التقدیر صاحب سیر الاقطاب میں فرماتے ہیں:-

”با اشعار آبدار و پراسرار صاحب دیوان ست و مکتوبات نادر و نگین۔“

بہر حال مکتوبات کا تو پتہ نہیں۔ البتہ محدث صاحب دہلویؒ نے ایک

مکتوب نقل فرمایا ہے۔ یہ مکتوب خود ایک چھوٹا سا رسالہ ہے۔ یہاں پورا مکتوب تو

نقل نہیں کیا جاسکتا۔ البتہ اس کے چند فقروں کا ترجمہ پیش کیا جا رہا ہے۔ تاکہ آپ

بھی کچھ اندازہ کر لیں کہ عشق و محبت کی زبان کیسی ہوتی ہے۔

عشق کب پیدا ہو سکتا ہے۔ عنایت خصوصی متوجہ ہو۔ جذبہ پیدا ہو اور

انانیت ختم ہو جائے۔ ”میں کچھ ہوں“ یہ احساس فنا ہو جائے۔

اے برادر چوں عنایت درکار تو کنند و جذبہ در تو نہند، و ترا از توئی برابند

آزگاہ عشق در تو آید۔

شہنوی میں آپ کا ارشاد ہے :-

تا توئی کے یار گردو یار تو
چوں نباشی یار باشد یار تو
تو مباحش اصلاً کمال این ست و بس
تو ورد گم شو وصال این ست و بس
ترجمہ :- جب تک تو اپنی توئی اور اپنی شخصیت باقی رکھے ہوئے ہے : یار کب یار
ہو سکتا ہے۔ جب تم نہ رہو گے تب یار یار ہو سکتا ہے۔

تم اپنی ہستی اور اپنی شخصیت کو ختم کر دو۔ قطعاً اپنے اوپر نظر نہ رکھو بس
یہ ہی ہے کمال۔ تم بالکل اپنے آپ کو فنا کر دو صرف اسی کا نام کمال ہے
تم محبوب میں گم ہو جاؤ۔ یہی ہے وصال اور بس۔

اور ہاں جب عشق پیدا ہو جائے جب ہی جلوہ حسن بھی نمودار ہوگا۔ جب یہ
پہچان سکو گے "حسن کیا ہے۔ تب ہی معشوق کو پہچان سکتے ہو۔ اور اسی وقت معشوق
کے صحیح عاشق بن سکتے ہو اور جو امانت عاشق حقیقی نے معشوق کے سپرد کی ہے۔
اس پر عمل کر سکتے ہو۔

اے برادر! معشوق کو تمھاری ہی صورت میں پیدا کیا ہے۔ اور تمھارے
زمرے میں مبعوث فرمایا ہے تاکہ صراط مستقیم کی دعوت دے۔

اے برادر! باری عزوجل نے بہشت و دوزخ پیدا کی۔ اور یہ فیصلہ
کر دیا کہ دونوں کو پُر کر دوں گا۔ معشوق کو اس کے عاشقوں سمیت جنت
میں پہنچاؤں گا۔ اور شیطان کو اس کے پیروؤں کے ساتھ دوزخ میں لوں گا۔

اے برادر! بہشت و دوزخ میں عاشق کے سوا کوئی نہیں۔ بہشت میں
بھی عاشق ہی ہے۔ اور دوزخ میں بھی عاشق ہی ہے۔ یہ دونوں عاشق

کے حُسن سے پیدا ہوئی ہیں۔

فرق یہ ہے:-

بہشت مقامِ وصال است باو دستاں
 رہبشت وصال کی جگہ ہے
 دوزخ مقامِ فراق است بر دشمنان
 دوزخ دشمنوں کے لئے جارِ فراق ہے

فراق، کافروں اور منافقوں کے لئے اور وصال، عاشقان و محبوبانِ محمد
 (صلی اللہ علیہ وسلم) کے لئے۔

اس مکتوبِ گرامی کے بنیادی نکتے یہ ہیں کہ:-

(۱) خود حضرت حق جل مجدہ عاشقِ حقیقی ہیں۔ چنانچہ ارشاد ہے:-

اے برادر! دل کی آنکھ کھولو اور خوب غور سے دیکھو۔ عاشق نے اپنے
 عشق سے تمہارے لئے کیسی کیسی چیزیں پیدا کیں اور کیسے کیسے حسین مناظر
 سے تمہاری نگاہوں کو تازگی اور دلول کو فرحت بخشی۔ اپنے حُسن کا پرتو
 ہر درخت پر ڈالا، طرح طرح کے میوے پیدا کئے۔ ہر میوے کا الگ مزا
 رکھا۔ اس درخت کو نہ اپنی خبر نہ اپنے پتوں کی خبر نہ اپنے پھل کی خبر۔
 نیشکر کی رگ رگ میں تمہارے لئے شکر بھردی۔ آہوئے ختن کے نافہ
 کو مشک سے بھر لوپر کر دیا۔ نیشکر کو خود اپنی شکر کی خبر نہیں، اسی طرح ہرن
 خود اپنے نافہ اور مشک سے ناواقف ہے۔ یہ سب اس کے عشق و محبت
 کی کرم فرمائی ہے۔

(۲) معشوقِ حقیقی محبوبِ رب العالمین خاتم الانبیاء و المرسلین ہیں (صلی اللہ علیہ وسلم)۔

جیسا کہ ارشاد ہے:-

اے برادر! معشوق را ہمہ بصورت تو آفریدہ اند در میان شما فرستادہ اند
تا دعوت کند براہ راست۔

ترجمہ :- اے برادر! معشوق (حقیقی) کو تیری ہی صورت میں (انسانی صورت میں)
پیدا کیا۔ تمہارے درمیان میں بھیجا تا کہ سیدھے راستہ کی دعوت دے۔
(۳) انسان کو حکم ہے کہ جہاں تک اس کا اختیار اور اس کی قدرت ہے۔
اللہ تعالیٰ کی صفات اور اس کی خصلتیں اختیار کرے۔ وہ عاشق ہے تو انسان کو
بھی عاشق ہونا چاہیے اور جس طرح ہر مخلوق عشق خالق کا آئینہ ہے۔ اسی طرح ہر
مخلوق انسان کی بھی معشوق ہو۔ چنانچہ ارشاد ہے :-

اے برادر عاشق شو، ہر دو عالم را حسن معشوق داں و خود را حسن معشوق
خواں۔ عاشق از خود بلک وجود تو ساخت تا جمال حسن و آئینہ تو بہ بند
و ترا محرم اسرار بداند "الانسان سری" در شان تو آمد۔ عاشق شو حسین
را دائم ببین و بشناس دنیا را و عقبی را و بدان کہ عقبی ملک محمد صلی اللہ
علیہ وسلم است و دنیا ملک شیطان ہر دو را دریا ب کہ برائے چہ آفریدہ اند
و چہ خواہند کرد۔ (اخبار الاخیار ص ۱۳۱)

ترجمہ :- اے بھائی عاشق ہو جا۔ دونوں جہانوں کو معشوق کا حسن سمجھو،
خود کو بھی معشوق کا حسن سمجھو۔ عاشق نے خود بخود تمہارے وجود کی
مملکت کو پیدا کیا۔ تاکہ تیرے آئینہ میں اپنے حسن کا جمال دیکھے اور تجھے
محرم اسرار قرار دے "انسان میرا ایک راز ہے" تیری شان میں فرمایا۔
بس عاشق بن جاؤ حسن کو دائمی اور ابدی سمجھو۔ دنیا اور آخرت کا فرق سمجھو
اور یہ بھی باور رکھو کہ "آخرت" حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی مملکت
ہے اور "دنیا" شیطان کی مملکت ہے۔ دونوں پر غور کرو۔ ان کو سمجھو۔

اور یہ بھی غور کرو کہ کس مقصد کے لئے پیدا کیا ہے۔ اور وہ کیا چاہتے ہیں۔

شریعت :- یعنی قرآن و حدیث کی زبان میں اس مضمون کی تعبیر یہ ہے۔
 اللہ تعالیٰ رحم الرحیم ہے۔ پوری کائنات میں مرکز رحمت محمد رسول اللہ صلی اللہ
 علیہ وسلم ہیں۔ جن کے متعلق ارشاد ہے۔ وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا رَحْمَةً لِّلْعَالَمِينَ
 اس کائنات کے ذرہ ذرہ میں جو حسن و خوبی ہے وہ تقاضا رحمت ہے خود اس
 کائنات کا وجود پر تو رحمت ہے۔

پس یہ بھی درست ہے کہ اگر رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم کو پیدا نہ کیا
 ہوتا تو کائنات کا وجود ہی نہ ہوتا۔ لَوْلَا لَمْ يَخْلُقْنَا إِلَّا قَلِيلًا۔ اور یہ بھی
 درست ہے کہ ساری مخلوق اپنے رب اور خالق سے وہی تعلق رکھتی ہے جو عیال
 کو اپنے سرپرست اور مربی سے ہوتا ہے۔ اس بنا پر انسان خصوصاً وہ انسان جو
 رحمت للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم کا ذمہ منگھامے ہوئے ہے۔ اس کی فطرت
 کا تقاضا ہونا چاہیے کہ وہ سراسر رحمت ہو۔ ہر انسان کے لئے پیکر رحمت ہو۔ ہر
 مخلوق کے لئے مجسمہ رحمت ہو۔ فَاحْبِسْ إِلَى اللَّهِ احْسِنْ إِلَى خَلْقِهِ
 (ابو لکما قال صلی اللہ علیہ وسلم)

اصحاب تصنیف اور ارباب درس کی توجہ منطوق اور فلسفہ کی طرف رہی ہے۔
 ان کی تصنیفی صلاحیتیں زیادہ تر اسی میدان میں صرف ہوئی ہیں۔ چنانچہ ایک
 ایک ورقہ رسالہ "شمشیہ" کی شروحات سینکڑوں صفحات میں لکھ دی گئیں۔ اگر
 عشق و محبت کے اس تشکدہ کی طرف بھی ارباب تصنیف توجہ کرتے تو حضرت
 قلندر صاحب کے اس مکتوب کی شرح سینکڑوں صفحات میں لکھی جاسکتی تھی۔
 مگر جہاں کا پورب اور کچھم ہی پلٹا ہوا ہو، جہاں کی دنیا نرالی ہو، جہاں ترک و
 فنا کو سب سے پہلی منزل قرار دیا جاتا ہو۔

ترک جان و ترک مال و ترک سر
 در طریق عشق اول منزل است
 جہاں قاتل کو بد دعاؤں کی بجائے دعائیں دی جاتی ہوں۔
 آل کشتہ، سیچ حق محبت ادا نہ کر د
 کز بہر دست و بازو قاتل دعا نہ کر د
 ایسے مقام پر قلم و دوات لے کر کوئی کیا بیٹھے گا۔ اور کہاں سے کاغذ
 لائے گا کہ کتاب عشق کی تفسیر لکھے۔

ورہ منزل جاننا کہ خطر ہاست بجان
 شرط اول قدم آن است کہ مجنوں باشی
 بہر حال اس کو آپ مکتوب کہئے یا مقالہ یا ڈوورقہ کتابچہ۔ اس کی آخری
 سطریں یہ ہیں۔ کیا ہی اچھا ہو کہ ان سے سبق لینے کی توفیق ہو۔ اور کاش قلندر
 صاحب کے نام پر جان دینے والے جذبہ قلندری کو پہچاننے اور اس کے لئے
 قربان ہونے کی بھی تمنا کریں۔ خاتمہ مکتوب یہ ہے۔

"اے برادر! سیچ نامی دانم کہ چہ می گویم و از من چہ می آید و چہ می گویا بند۔ زبان
 در قبضہ قدرت خداست۔ اگر عنایت در کار تو می شد و از تو آں چیز می
 گویا بند۔ کہ پسندیدہ ہر دو جہانش سازد۔ اے برادر! این قدر معلیم است
 کہ بخواست خود پیدا کرد و بخواست خودی وارد و يفعل اللہ ما لیشأ
 و بحکم ما یرید۔ انچہ خواست کرد۔ و انچہ خواہد می کند۔ کسے راد و رجا
 از کارے نیست۔ (انیمار الاخیار)

ترجمہ:- اے برادر! کچھ خبر نہیں، کیا کہہ رہا ہوں۔ میں "کیا ہوں۔ مجھ سے کیا بن
 سکتا ہے۔ اور میری کیا حقیقت کہ کچھ کہہ سکوں۔ زبان اللہ تعالیٰ کے قبضہ

قدرت میں ہے۔ اگر عنایت خداوندی شامل حال ہو تو تم سے ایسی بات کہلو اور جو دنیا و آخرت دونوں جہانوں میں پسندیدہ ہو۔ اسے برا اور اتنی بات معلوم ہے کہ خود اس نے چاہا تو پیدا کر دیا۔ خود وہ چاہ رہا ہے تو باقی رکھے ہوئے ہے۔ اللہ تعالیٰ جو چاہتا ہے کر ڈالتا ہے۔ اور جس بات کا چاہے فیصلہ کر دیتا ہے جو اس نے چاہا کر دیا۔ جو چاہے گا کر دے گا۔ اس کی خواہست، اس کی چاہ، اس کے ارادہ اور منشا میں کسی کو دخل نہیں ہے۔

یہ باتیں سمجھی کہتے ہیں، کہہ سکتے ہیں۔ اس سے زیادہ

زور دار الفاظ میں کہہ سکتے ہیں۔ مگر فرق یہ ہے کہ ہمارا

قول محض قول ہوتا ہے جو زبان اور حلق کا عمل ہوتا ہے۔ دل کی آواز نہیں ہوتی۔ زبان پر عشق و محبت کے الفاظ اور دل نا آشنا، عشق، ہمدردی، خلق خدا کے نعروں سے حلق مجروح، مگر قلب درد سے بے بہرہ۔

اور جو سچا عاشق ہوتا ہے۔ اس کا قول صرف قول نہیں ہوتا، بلکہ حال ہوتا ہے۔ ایسا حال جس میں وہ خود گم رہتا ہے۔ اس کا نعرہ قلب مجروح کی ٹیس ہوتا ہے۔ دل کی صدا بلکہ دل نالاں کا گریہ ہوتا ہے۔

غور کرو، رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم کے دامن سے وابستہ ہونے والا جب سراسر رحمت (یا قلندرانہ الفاظ میں) سراسر عشق ہو جائے تو خدا کی کسی بھی مخلوق سے اس کو نفرت کیسے ہو سکتی ہے۔ اس کے یہاں تو محبت ہی محبت ہوگی۔ ویر و حرم کا فرق اپنی جگہ۔ مگر جس کے یہاں نفرت کی جنس ہی ختم ہوگئی ہو وہ نفرت کہاں سے لائے۔ ہم محبت سے تہی دامن ہیں تو ہمارے یہاں محبت کا نام نہیں۔ عاشقانِ مصطفیٰ اور محبانِ خدا، نفرت سے تہی دامن ہیں تو ان کے یہاں نفرت کا نام نہیں ہوتا۔

کفرست اور شریعت ماکینہ و اشتن
آئین ماست سینہ چو آئینہ و اشتن

ترجمہ :- ہماری شریعت میں کسی سے کینہ رکھنا کفر ہے۔ ہمارا آئین ہے سینہ کو آئینہ
کی طرح صاف رکھنا۔

قلندروں کی زبان میں یہ مفہوم اس طرح ادا کیا جاتا ہے :-

عاشق از ایمان خرابست و ہمہ از کفر

پردانہ چراغ حرم و دیر نداند

ترجمہ :- عاشق کا ایمان بھی خراب اور کفر بھی خراب، عاشق پردانہ ہوتا ہے اور
پردانہ مسجد اور مندر کی شمع میں فرق کرنا نہیں جانتا۔

جب ان کو کسی سے نفرت نہیں، تو ان سے کسی کو نفرت کیوں ہو۔ کہا جاتا ہے
کہ انسان تو انسان وحشی جانوروں کو بھی حضرت قلندر صاحب سے انسیت تھی۔
ہرن اور جیتل جو انسان کے سایہ سے بھی بھاگتے ہیں حضرت قلندر صاحب کے
آس پاس اس طرح بھرتے تھے جیسے گھر کے پالتو جانور، اور جس طرح دہلی کے بادشاہ
آپ کے آستلنے پر حاضر ہوتے تھے جنگل کے بادشاہ (شیران شکاری) بھی آپ کی
قدم بوسی کیا کرتے تھے۔ اس پر ایک افسانہ بھی بنا لیا گیا۔

افسانہ یہ ہے کہ ایک روز حضرت قلندر صاحب شمال کے پہاڑ پر تشریف لائے۔
گئے۔ وہاں ایک جوگی صاحب تھے۔ جوگی نے قلندر صاحب کو دیکھا تو حیرت سے کہا۔
آپ یہاں کیسے؟ یہ بگہ تو شیروں اور درندہ جانوروں کی ہے۔ یہاں کوئی انسان
زندہ نہیں رہ سکتا۔ قلندر صاحب نے جوگی سے کہا۔ آپ یہاں کیسے زندہ سلامت
ہیں۔ جوگی نے جواب دیا۔ مجھے تو اڑنے کی طاقت حاصل ہے۔ جیسے ہی کوئی شیر اس
طرف آتا ہے میں اڑ کر آسمان پر پہنچ جاتا ہوں یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ ایک

شیر بر آپہونچا۔ جوگی صاحب فوراً آسمان کی طرف پرواز کر گئے۔ حضرت قلندر صاحب
 وہیں تشریف فرما رہے۔ مگر شیر قلندر صاحب پر حملہ تو کیا کرتا سر جھکا کر خاموش بیٹھ گیا۔
 یہ تو قلندر صاحب کی صورت ہوئی۔ ادھر جوگی صاحب کی حالت یہ تھی کہ وہ اُڑ کر
 آسمان پر تو پہنچ گئے۔ مگر جہاں جاتے اپنے ساتھ ساتھ قلندر کو بھی دیکھتے کہ قلندر
 صاحب اور شیروں کا غول ان کے ہمراہ ہے۔ انتہا یہ کہ جوگی صاحب تھک کر اپنی جگہ
 واپس ہوئے تو دیکھا قلندر صاحب اطمینان سے ایک چٹان پر بیٹھے ہیں۔ اور شیر
 ان کے سامنے اس طرح بیٹھا ہے کہ جیسے یہ مرید یا شاگرد رشید ہو۔ قلندر صاحب نے
 جوگی کو دیکھا تو مسکرا کر فرمایا۔ سادھو صاحب یہ عجیب مہمان داری ہے خود آسمان
 پر اُڑ گئے اور اپنے مہمالوں کو شیروں کے حوالے کر گئے۔ بہر حال قلندر صاحب
 کی اس عجیب و غریب کرامت نے جوگی کو یہاں تک متاثر کیا کہ وہ قلندر صاحب
 کے قدموں پر گر گیا کہ آپ ایسے خدا رسیدہ اور پہونچے ہوئے بزرگ ہیں کہ میرے
 لئے آپ کی کفش برداری اور خدمت گزاری کے سوا کوئی چارہ نہیں۔ چنانچہ وہ
 آپ کا حلقہ بگوش ہو گیا۔ صاحب شرف المناقب نے اس قصہ کو نقل کر کے تحریر
 فرمایا ہے۔ اس پہاڑ میں حضرت قلندر صاحب کے بیٹھنے کی جگہ اور اس جوگی کی
 قبر آج تک موجود ہے اور زیارت گاہ خلالت ہے۔

بہر حال یہ کوہ شمال کون سا پہاڑ ہے اور وہاں یہ قبر ہے یا نہیں۔ اس
 کی حقیقت تک تو ہم جیسے کوتاہ بینوں کی نظر تغیش نہیں پہونچ سکتی۔ مگر جس بات
 کا انکار نہیں کیا جاسکتا وہ یہ ہے کہ محبت کے ان دیوتاؤں کی نظر محبت کا یہ اثر
 ہٹا کہ ہر چیز ان سے محبت کرنے لگتی تھی۔ زبان شریعت میں اس مفہوم کو اس
 طرح ادا کیا ہے۔ من کان للہ کان اللہ لہ۔ جو اللہ کا ہو جاتا ہے۔ اللہ
 اس کا ہو جاتا ہے۔

عشق و محبت اور جذب و فنا کی بات یہاں تک
قلندری اور شان قلندری پہنچی تو مناسب معلوم ہوتا ہے کہ قلندری
 کے متعلق بھی کچھ باتیں ہمیں کہہ دی جائیں۔

قلندر کون ہوتے ہیں؟ کیسے ہوتے ہیں؟ قلندری کیا ہے؟ یہ تمام باتیں
 تفصیل طلب ہیں۔ مگر تفصیل کون کرے۔؟

قلندری کی حقیقت وہی بیان کر سکتا ہے جو خود قلندر ہو یا مقام قلندری
 کا تجربہ کر کے آگے بڑھ چکا ہو۔ "قدر گو بہر شاہ داند یا بدانہ جو ہری۔"

مگر عجب تماشا یہ ہے کہ جو اس مرتبہ کے جاننے والے ہیں وہ زبانوں پر
 تلے ڈال لیتے ہیں۔ "آں را کہ خبر شد خبرش باز نیامد۔" (یعنی جس کو کچھ پتہ چل گیا
 وہ خود لاپتہ ہو گیا۔ کسی کو اس کا پتہ ہی نہیں چلا۔)

اسے خود غرضی کہتے یا بے غرضی، کہ جو پہونچ جاتا ہے۔ وہ زبان سے تو کیا
 بتاتا۔ پلٹ کر دیکھنا بھی گوارا نہیں کرتا۔ یا اُسے اتنی فرصت ہی نہیں ملتی کہ پلٹ کر
 دیکھ سکے۔

حضرت قلندر صاحب کے معاصر اور ہم نام یعنی شیخ شرف الدین مصلح عرف سعوی
 شیرازی (متوفی ۶۹۱ھ) ان کی طرف سے یہ معذرت پیش فرماتے ہیں۔

عاشقان کشتگان معشوقند بر نیاید ز کشتگان آواز
 ترجمہ:- عاشق معشوق کے کشتہ اور قتل کئے ہوئے ہوتے ہیں کشتہ اور مقتول
 کی آواز نہیں آبا کرتی۔

اور اس کا فلسفہ یہ بیان فرماتے ہیں۔

اے مرغِ سحر عشق ز بردانہ بیا موز
 کال سوختہ جان را جان شد و آواز نیامد

ترجمہ :- اے مرغِ سحر تو چپک کر یا چنچ کر عشق کا اظہار کرتا ہے یہ کمال کی بات نہیں،
تجھے چاہیے کہ پروانہ سے عشق کرنا سیکھے۔ دیکھو۔ سوختہ جان پروانہ کی جان
جل جاتی ہے مگر آواز نہیں نکلتی۔

اور اس سے بھی زیادہ پر لطف بات یہ کہ جو کچھ کہنا چاہتا ہے یا کہتا ہے
اس کے متعلق فتویٰ یہ ہوتا ہے۔

ایں مدعیان در طلبش بے خبر اند

ترجمہ :- یہ ڈینگیں مارنے والے بے خبر ہیں۔

اب ہم کچھ کہنا بھی چاہیں تو جب باخبروں کا فتویٰ یہ ہو کہ یہ بے خبر ہے تو
ہمارے کہنے کا اعتبار کیا۔ اور ایسی بے سند بات پر کون بھروسہ کر سکتا ہے۔
بہر حال حقیقت کی نقاب کشائی تو ناممکن ہے۔ البتہ کچھ پتے کی باتیں کہی جاسکتی
ہیں۔ خدا کرے وہ صحیح ہوں۔ اور انشاء اللہ صحیح ہوں گی۔ کیونکہ قلندروں نے
اگرچہ کچھ نہیں بتایا مگر اس نے سب کچھ بتا دیا ہے جس کے نام پر قلندر صاحبان
قلندری کرتے ہیں۔ اسی کی بتائی ہوئی باتوں میں سے کچھ باتیں یہاں لکھی جا رہی ہیں
مگر اس سے پہلے یہ معذرت بھی ضروری ہے۔ کہ
لفظ قلندر کے معنی | اہل لغت نے اسم "قلندر" پر بڑا ظلم کیا ہے۔
انتہا یہ کہ صاحب غیاث اللغات نے تو یہ لکھ دیا کہ قلندر "کندہ ناتراش" کو
کہتے ہیں۔ فرماتے ہیں: "بعض گویند اصل قلندر بود کندہ و ناتراشیدہ و بعضے
اصلش غلندر گفتہ۔"

اسی طرح مدعیان تصوف اور بقول حضرت شیخ سعدی "مدعیان بے خبر"
نے قلندر کی ایسی تصویر بنائی جو بھیانک ہی نہیں ہے بلکہ بڑی حد تک گھناؤنی
کبھی ہے جس میں نہ تہذیب و سلیقہ ہے۔ نہ شرم و حیا۔ گو یارند مشرب بدرستہ (معاذ اللہ)

مگر واقعہ یہ ہے کہ قلندری تہذیب و شائستگی، علم و معرفت، بلکہ توحید و تفرید کی وہ آخری حد ہے جہاں انسان خود محو ہو جاتا ہے۔ سمندر کی موجیں اس کو باہر نہیں پھینکتیں۔ بلکہ خود اپنے اندر گم کر لیتی ہیں۔

نہ گل شناسد و نہ رنگ و بو نہ عارض زلف

و نہ کسے کہ کجسں او گرفتار سرت

اب آئیے۔ اپنی زبان میں کسی قدر تفصیل سے اس کی تفسیر ملاحظہ فرمائیے۔

توحید کے معنی عام طور پر یہی کئے جاتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ خالق ذوالجلال

کو بلا شرکت غیرے "واحد" ماننا بیشک توحید کے یہی معنی ہیں۔ مگر یہ لغت عربی یا

عام اصطلاح کے لحاظ سے ہیں۔ اہل معرفت اس کو "عوام کی توحید" کہتے ہیں۔

خواص کی توحید صرف "مان لینے" پر ختم نہیں ہو جاتی۔ بلکہ اس کا مفہوم یہ

ہوتا ہے کہ "مان لینے" کے تقاضوں کو پورا کیا جائے۔

یعنی جب یہ مان لیا کہ "اللہ تعالیٰ ایک" ہے وہی سب کا رازق و خالق ہے،

وہی نفع نقصان پہنچانے والا ہے، وہی مشکلات کو حل کرتا ہے۔ وہی بیماریوں کو

شفا بخشتا ہے، وہی بے چاروں کا چارہ کار ہے اور وہی ناکاروں کا کارساز ہے۔

وہی قادر مطلق ہے اور جو کچھ ہے اسی کے حکم اور اس کے علم و ارادہ سے ہے۔ تو

اب لازم ہے کہ تمام امیدوں اور آرزوں کا تعلق اسی سے ہو۔ بیم و رجاء جو کچھ ہو

اسی سے ہو، نہ کبھی کوئی طمع قدم میں لغزش پیدا کرے۔ اور نہ کسی کا خوف و ہراس

اس کے قلب پر سکون کو مضطرب اور بے چین بنائے۔ مختصر یہ کہ جہاں تک کسی بھی

نفع یا نقصان کا تعلق ہے۔ تقاضا، توحید یہ ہے کہ اس کو صرف ذات حق "جل مجد"

سے وابستہ کرے۔ نہ کسی غیر سے توقع سود رکھے نہ خوف زیاں۔

لیکن عشاق کی توحید اس سے کبھی آگے ہے وہ سود و زیاں کی انصافوں

اور نفع و نقصان کی نسبتوں تک محدود نہیں ہوتی۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ صرف ان افعال و صفات کا مرکز ایک "ذاتِ حق" کو مان لیں۔ بلکہ وہ خود عاشق بیچارہ سے مطالبہ کرتی ہے کہ وہ اپنی انانیت، اپنی شخصیت اور اپنی ہستی کو قربان گاہِ عشق پر قربان کر دے۔

سرمد گلہ اختصار می باید کرد

یک کار ازین دو کار باید کرد

یا سر برضار و دوست می باید داد

یا قطع نظر از یار می باید کرد

یہاں صرف اپنی تمنا اور آرزو ہی قربان نہیں کی جاتی۔ صرف یہی مطالبہ نہیں ہوتا کہ عاشق مرضی محبوب کو اپنی "رضا" بنالے۔ بلکہ مطالبہ یہ ہے کہ عاشق اپنی "انانیت" ختم کر دے۔ اپنی ہستی کا تصور یک قلم محو کر دے۔

تو مباحث اصلا کمال اینست و بس

تو در دم شو وصال اینست و بس

(قلندر صاحب)

اگر عاشق کے دل و دماغ میں "میں" کا تصور باقی ہے تو وہ عاشق صادق

نہیں۔ فریب خوردہ عشق ہے۔

چونمانی با خدا یابی وصال

خولیش را گم سازاے صاحب جمال

تا توئی کے یار گردو، یار تو

چوں نباشی، یار گردو، یار تو

(قلندر صاحب)

عاشق اور "میں" دو متضاد چیزیں ہیں۔ جب تک میں یا انا "باقی" ہے شکر موجود ہے۔ تقاضا توحید یہ ہے کہ "میں" اور "انا" کا تصور کبھی ختم ہو۔ جہاں تک ہمت کا تعلق ہے صرف ایک سے ہے۔ اور وہ 'وہ سے جو فی الواقع ہمت ہے۔ جو واحد حقیقی ہے۔ جو "احد" ہے۔ جو "صمد" جو "لم یلد ولم یولد" ہے۔ جب سب کچھ وہی ہے۔ تو "انا" یا "میں" کے کیا معنی۔ اب اگر کوئی لفظ بمعنی ہے تو صرف ایک لفظ ہے یعنی "ہمہ اوست"۔

حضرت قلندر صاحب فرماتے ہیں:-

ہر کہ شد در بحر عرفان آشنا
 ذرہ ذرہ قطرہ داند از خدا
 آبِ دریا چوں زند موجِ دگر
 در حقیقت آب باشد جلوہ گر
 نفس آب و چوں جناب ست جسم تو
 آب چوں گردی نمساند جسم تو
 چوں الف در لام می گردد نہال
 خولش را گم ساز تا گردد عیاں
 گشت واصل چوں بدریا آب جو
 آب جو را باز از وریا مجو
 تا توئی کے یار گردد یار تو
 چوں بناشی یار باشد یار تو
 مولوی فرمود در نظم این بیاں
 بر تو گردد روشن اسرار نہال

تو مباحث اصلاً کمال این ست و بس
 تو دور و گم شو وصال این ست و بس
 یار را می بین تو دور ہر آئینہ
 سوز و ساز او ست در بر طنطنہ
 ہر چہ بینی در حقیقت جملہ او ست
 شمع و گل پروانہ بلبل ہم از او ست

آپ نے استغراق، محویت، سکیرپیم جیسے الفاظ صوفیا کی کتابوں میں پڑھے ہوں گے۔ اردو کے ایک شاعر نے اس کی تصویر اس طرح کھینچی ہے۔

تراخیال ہے ترا جمال ہے تو ہے!
 مجھے یہ فرصت کہاں کہ ہوں کیا میں؟

یہ گویا قلندری کی تفسیر ہے۔ مگر کچھ طرف کا بھی فرق ہوتا ہے۔ وہی فرق

مجزوب اور سالک، قلندر اور "عارف" میں امتیاز پیدا کر دیتا ہے۔

بیشک "انانیت" ایک سالک اور شیخ
 قاندر اور سالک میں فرق | طریقت کی بھی فنا ہوتی ہے سالکین

کے سر تاج انبیاء علیہم السلام ہیں۔ ان کے اندر انانیت کا نام و نشان نہیں ہوتا۔
 غور فرمائیے۔ ایک طرف عرش معلیٰ سے روح الامین "چلہ گاہ حرا" میں جلوہ افروز

ہو کر رب العرش کا آخری اور مکمل ترین پیغام پہنچا رہے ہیں۔ "اقرابا سحر
 ربك الذی خلق۔" اور دوسری طرف انانیت "زخم من" اور تصور "میں" کے

فنا اور ختم ہو جانے کی یہ نشان ہے کہ اس رسول امین کا قلب مبارک لرز رہا ہے

اور نہ صرف قلب لرز رہا ہے بلکہ دل کی دھڑکن سے پورا بدن لرز رہا ہے کہ یہ
 بار امانت کس طرح برداشت ہو سکے گا۔ یعنی قلندروں کی زبان میں گویا قلب

محمد صلی اللہ علیہ وسلم "انا" اور "میں" کو تلاش کر رہا ہے کہ وہ ہے کہاں۔ وہ تو سچ
درایچ ہے۔ وہ تو فنا محض ہے۔ وہ ہار بردار کیسے ہو سکتا ہے۔

ایک طرف رب السموات والارض کی جانب سے یہ ناز برداری اور یہ لطف
و عنایت کہ عرش و کرسی کی سیر کرائی جا رہی ہے۔ اور ان مقامات پر پہنچا یا جا رہا ہے
کہ اسرار ملکوتی کا سب سے بڑا امانت دار "ببرئیل امین" بھی کہہ رہا ہے۔

اگر یک مرموے بالا بہم
فروغ تجلی بسوزد پر م

اور دوسری جانب "زعم انا" کے فنا کا یہ عالم ہے کہ اُمت کے کمزوروں
اور گنہگاروں سے بھی فرمائش کی جاتی ہے کہ ہر ایک اذان کے بعد دعا کرو۔
والجشہ مقاماً محموداً۔ خداوند ہمارے رسول محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو مقام
محمود پر فائز فرما۔ بقول شخصے :-

در ہر پیرزن می زدمپیر
کہ اے زن در دعایم یاد آور

ترجمہ :- ہر بڑھیا کے دروازے پر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم دستک دیکر
فرمایا کرتے تھے کہ بڑی بی تجھے دعائیں یاد دلاؤ۔

سیرت مبارکہ میں اس طرح کی بیشمار مثالیں مل سکتی ہیں۔ جن کی شہادت یہ ہے
کہ انبیاء علیہم السلام کی "انانیت" نہ صرف فنا ہوتی ہے بلکہ اس فنا میں ان کا
مرتبہ اتنا ہی بلند ہوتا ہے جتنا منہدب نبوت کا۔ لیکن اس فنا کے ساتھ ان میں
بقا کی بھی ایک نشان ہوتی ہے۔ مگر یہ بقا اپنے لئے نہیں بلکہ رضا مولے کے
لئے یعنی جہاں تک خود ان کی اپنی رضا اپنی خواہش اور اپنی چاہ کا تعلق ہے وہ
قطعاً فنا ہوتی ہے۔ خود قرآن حکیم کی شہادت ہے۔ وما ینطق عن الہو۔

ان کی کوئی بات خود ان کی چاہ پر نہیں ہوتی، لیکن اس فنا میں یہ بدستی نہیں ہوتی کہ
 رضا محبوب کی بھی خبر نہ رہے۔ اور اس طرح سرگشتہ و حیران ہو جائے کہ بقول
 نواب ملتفت خاں - ۵

بجواب دیدہ ام آل طرہ پر لیشاں را

تمام عمر و گز خواب من پر لیشاں سرست

بلکہ انبیاء علیہم السلام اور ان کے تابع سالکین کرام جس طرح خود اپنی رضا
 اور اپنی چاہ اور پسند سے فانی ہوتے ہیں وہ اتنے ہی رضا مولیٰ سے باخبر اور اس
 کی تکمیل کے لئے کمر بستہ اور سر بکف رہتے ہیں۔ یعنی فنا را اپنی ذات اور ہستی سے اور
 بقا را "رضاء حق اور منشاء ربانی" کے لئے یہ حضرات مرضی مولیٰ کے لئے ایسے حسرت
 اور اس طرح باخبر رہتے ہیں کہ یہ تصویر بھی مشکل ہوتا ہے کہ ان کے اندر جذب و فنا
 بھی کار فرما ہے۔ یہاں تک کہ کبھی کبھی یہ خیال بھی ہونے لگتا ہے کہ جذب و فنا تو
 درکنار انھیں عشق و محبت سے بھی سرور کار نہیں ہے۔

یہ شان بلند ترین شان ہے جو انبیاء علیہم السلام کی شان ہوتی ہے۔ اور
 ان کے طفیل میں اُمرت کے ان خوش نصیبوں کو یہ درجہ عطا ہوتا ہے جن کو سالک
 کہا جاتا ہے۔ ان کی تلقین اور نصیحت یہ ہوتی ہے۔

از دروں شو آشنا، وز بروں بیگانہ وش

این چنین زیبا روش، کمتر بود اندر جہاں

اس کیفیت کی مختصر تعبیر یہ ہے۔ "دست بکار دل بیار"

سمجھایا جاتا ہے کہ قلندر اور مجذوب کو

قلندری اور پابندی شریعت

شریعت سے تعلق نہیں رہتا۔ مگر کیوں؟
 عام خیال یہ ہے کہ اس درجہ پر پہنچ جاتے ہیں۔ تو خود صاحب شریعت یعنی

اللہ رب العزت ان سے کہہ دیتا ہے کہ رکوع و سجدہ تو ظاہری باتیں ہیں۔ اب جب یہ بات ہوگئی ہے کہ "من تو شدم تو من شدی" تو اب رکوع و سجدہ کیسا ہر کس کے لئے اور کس جانب کو؟ چنانچہ یہی حکمنامہ جس کے اقتباسات بار بار پیش کئے جا چکے ہیں۔ اسی مکالمہ میں خود حضرت قلندر صاحب کی طرف منسوب کر کے تحریر کیا گیا ہے۔ لفظی ترجمہ ملاحظہ ہو،

"مفتی اور حاکم اور سات درویشوں نے جو حافظ تھے۔ اس درویش سے

(قلندر صاحب سے) ملاقات کی۔ محرم کی بیسویں کئی، صبح کا وقت، جمعہ کا دن

ان حضرات نے تکبیر کہتے ہوئے نماز کی اذان دی اور نمازیں شروع کر دیں۔

مولانا سراج الدین رکوعی نے اس درویش سے (قلندر صاحب سے) فرمایا۔

صبح صادق ہوگئی۔ سنتوں کا وقت ہے۔ میں نے کہا آپ لوگ تکبیر پڑھیں تاکہ

میں فرض ادا کر لوں۔ جب جماعت ہو چکی لوگ فرض صبح سے فارغ ہو چکے تو یہ

سب علماء و فضلاء اور درویش جو نماز میں شریک تھے۔ اس درویش کی طرف

متوجہ ہوئے۔ اور سب نے مل کر مجھ سے فرمایا۔ مخدوم محترم! ہمیں آپ سے

کچھ عرض کرنا ہے۔ جناب زالانے صبح کی سنتیں کیوں نہیں پڑھیں؟ میں نے

عرض کیا۔ خواجہ کائنات، سرور موجودات، رحمت عالمیاں، صفوت آدمیاں،

وتمہ در زماں، احمد مجتبیٰ محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان اس درویش

کے متعلق یہ ہے کہ:-

"اے شرف ہم نے اپنی سنتیں تم کو بخش دیں۔"

قلندر صاحب فرماتے ہیں:- اس کے بعد چالیس سال تک میں صرف فرض نماز

پڑھتا رہا کہ حضرت ذوالجلال کا فرمان اس درویش کے پاس پہنچا کہ:-

"اے درویش تو ازاں مالی دمن ازاں تو فریضہ خود بتو بخشیدم۔"

ترجمہ (اے درویش اس بنا پر کہ تو ہمارا ہے اور ہم تیرے ہیں تو ہم نے اپنا فرض بھی

تجھ کو بخش دیا۔)

میں نے فوراً سجدہ شکر ادا کیا۔

جب محدث دہلوی (حضرت مولانا شیخ عبدالحق صاحب) کی تحقیق یہ ہے کہ یہ مکالمہ "ایک اختراع" ہے تو اس روایت کو ثبوت میں تو نہیں پیش کیا جاسکتا۔ مگر اس سے عام خیالات کا اندازہ ضرور ہوتا ہے۔ کہ قلندر کے متعلق تعلیم یافتہ لوگوں کے بھی خیال کیا ہوا کرتے تھے۔

مغل بادشاہوں کے دور میں اس طرح کے خیالات ایک طرح کا فیشن بن گئے تھے۔ یہاں تک کہ آزاد منش فقیر اسی کیفیت کو "مقصود اصلی" قرار دینے لگے تھے۔ شاہزادہ داراشکوہ کے پیر "ملا شاہ بدخشی" کے متعلق روایت ہے کہ انہوں نے لا تقبلوا الصلوٰۃ وانتم سكارىٰ کی تفسیر کرتے ہوئے نماز ہی معاف کر دی تھی۔ آپ کی تفسیر کے الفاظ اور ان کا ترجمہ ملاحظہ فرمائیے:-

"اے کسانیکہ ایمان حقیقی آدرہ اید نزدیک نماز نشوید در حالت سکر و مستی مقرر سکر حالت بلند ترست از نماز گزاران۔ اگر مستی مجازی سرت قرب نماز ممنوع سرت تا نماز ملوث نشود۔ دریں صورت عزت نماز سرت۔ و اگر سکر حقیقی سرت باز ہم قرب نماز ممنوع سرت۔ دریں صورت عزت سکر سرت۔ مصلیٰ نماز نماز کے خواند (حسنات العارفين بحوالہ شاندار ماضی ۱۷)

ترجمہ :- راے لوگو! جو حقیقی ایمان رکھتے ہو۔ سکر و مستی کی حالت میں نماز کے پاس مت جاؤ۔ بیشک حالت سکر نمازیوں کی حالت سے بہت بلند ہے۔ مستی اگر مجازی ہے یعنی نشہ سے بے ہوشی ہوگی ہے تب بھی نماز کے پاس جانا ممنوع ہے۔ اس صورت میں نماز کی عزت و عظمت ہے تاکہ نماز ملوث اور آلودہ نہ ہو۔ اور اگر سکر حقیقی ہے یعنی عشق مولیٰ میں وارفتگی ہے۔ تب بھی قرب نماز ممنوع ہے۔ اس

صورت میں اس سکر اور بے خودی کی عزت ہے کہ نمازی ہی نہیں رہا۔ نماز کیسے پڑھے۔
 ملا صاحب کی یہ بات تو ٹھیک ہے کہ "مصلیٰ نماز، نماز کے خواندہ نمازی نہیں رہا۔
 نماز کون پڑھے۔ مگر انہوں نے اس تناقض کی طرف خیال نہیں فرمایا جو خود ان کے
 استدلال میں واقع ہو گیا ہے۔ یعنی جب وارفتگی اور بے خودی اس حد تک بڑھ گئی۔ کہ
 ہوش و حواس تو کیا خود اس کا وجود عدم کی برابر ہو گیا تو وہ مخاطب ہی کہاں رہا۔ اور
 جب وہ خطاب کی صلاحیت نہیں رکھتا تو تکلیف شرعی بھی باقی نہیں رہی۔ مگر ایسے
 مرقوع القلم کو نماز پڑھنے والوں سے افضل قرار دینا ملا صاحب کا معاذ اللہ "الحاد" ہی۔
 محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق جب یہ حقیقت ہے کہ "بعد
 از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر" پھر کسی کو معاذ اللہ آپ سے افضل قرار دینا الحاد اور
 زندہ نہیں تو اور کیا ہے۔

مگر قلندر صاحب کا دامن اس الحاد سے پاک ہے۔ مکتوب کے اقتباسات
 پہلے گذر چکے ہیں۔ آپ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو محبوب حقیقی اور محشوق حقیقی
 قرار دیتے ہیں۔ بس سب سے افضل اور سب سے محبوب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ
 وسلم ہیں۔ آپ کی ہر ایک حالت تمام حالتوں سے افضل ہے۔ آپ کی شان سکر و اکرم
 سے ہمیشہ بلند رہی۔ تو پھر سکر و اکرم کو نماز سے افضل کیسے کہا جاسکتا ہے۔ ؟

ملا شاہ جیسے لوگوں کی اس غلطی کی بنیاد یہ ہے کہ انہوں نے
بنیادی غلطی عبادت کے صرف ایک پہلو پر نظر رکھی کہ عبادت گناہوں
 کفارہ ہوا کرتی ہیں۔ اس پر اس زعم باطل کا اعتراف ہو گیا کہ جب سکر و اکرم ہے تو
 گناہ کیسے ہو سکتا ہے۔ پس جب گناہ نہیں تو کفارہ کی بھی ضرورت نہیں۔

مگر وحی الہی اور سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عبادت کا دوسرا پہلو
 بھی اتنی ہی قوت سے پیش کیا ہے۔ یعنی یہ کہ رضا رسولی کا ذریعہ بھی "عبادت" ہی

ہوا کرتی ہے۔ اور یہ کہ خداوندی انعامات کا شکر بھی اگر ادا ہو سکتا ہے۔ تو صرف عبادت کے ذریعہ ہی ادا ہو سکتا ہے۔

کسی قلندر یا مجذوب کے گناہوں کی معافی تو صرف اس کا تخیل ہے۔ جس کے متعلق شریعت کی کوئی سند نہیں پیش کی جاسکتی۔ البتہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے گناہوں کی معافی کا اعلان خود رب محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے کلام پاک میں فرمایا ہے:-

”ليغفر لك ما تقدم من ذنبك وما تاخر“

اس کے باوجود نہ صرف پنجوقتہ نمازیں اور ان کی سنتیں اور نفلیں پابندی سے ادا ہوتی تھیں۔ بلکہ شب بیداری کی بھی حالت یہ تھی کہ کئی کئی گھنٹے نفلوں میں کھڑے رہنے کے باعث پائے مبارک متورم ہو جاتے تھے۔

صدریقہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے عرض کیا۔ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آپ نبی اور مقدس رسول کی حیثیت سے فطرتاً معصوم ہیں، گناہوں سے پاک، اس پر بھی اگر کچھ لغزشیں اور خطائیں ہو گئی ہیں تو اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت کا اعلان فرما چکے ہیں۔ پھر یہ زحمت کیسی اور دن بھر کی بے پناہ مشغولیت و مصروفیت کے بعد راتوں کو ان لمبی لمبی نفلوں کی کیا ضرورت ہے۔؟

آپ کو معلوم ہے سید الکونین، محبوب رب العالمین صلی اللہ علیہ وسلم نے اس نہایت معقول سوال کا کیا جواب دیا تھا۔ آپ نے فرمایا۔

”افلا اكون عبداً شكوراً“

بیشک اللہ تعالیٰ کے احسانات بے شمار ہیں۔ مگر کیا تقاضا انصاف ہے کہ اس کے ان احسانات و انعام بے غایات کا شکر نہ ادا کیا جائے۔ گناہوں کے کفارہ کے لئے نہیں بلکہ ادائے شکر کے لئے ضروری ہے کہ:-

شکرِ نعمت ہمارے تو چنداں کہ نعمت ہمارے تو
 ادائے شکر کے علاوہ ایک اور چیز بھی ہے جو عاشق کے لئے نہایت ضروری ہے،
 اتنی ضروری جتنی ماہی بے آب کے لئے قطرہ آب ضروری ہے بلکہ اس سے
 بھی زیادہ یعنی سرگوشی راز و نیاز، عرض معروض اور مناجات۔
 اس کا ذریعہ کیا ہے، صرف نماز۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: "نمازی اپنے رب سے سرگوشی اور
 راز و نیاز کی باتیں کرتا ہے۔" (صحاح)

عاشق صادق محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو دیدارِ رب معراج میں ہوا تھا۔ آپ کی
 امت کی معراج یہ تو نہیں ہے کہ عرش و کرسی کی سیر کرے۔ البتہ مومن کی معراج
 نماز ہے۔ (صحاح)

قربِ محبوب مقصود ہے تو سب سے زیادہ قرب جو بندے کو اپنے رب سے
 میسر آتا ہے وہ ارشادِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے بموجب نماز میں میسر آتا ہے۔
 جب بندہ اپنی پیشانی اپنے رب کے سامنے زمین پر رکھتا ہے۔

بہر حال قلندر یا مجذوب کے لئے اتنی بات درست ہے کہ جیب وہ "عالمِ خبر"
 سے "بے خبر" ہوئے۔ اور ان کے یہاں خبرداری اور "آگہی" کا مدّ ہی ختم ہو گیا۔ تو
 پھر ان کو احکامِ شریعت کی خبر کہاں سے ہو۔ جذبِ دائم، سکرِ لازوال، سرمستی و
 وارفتگی جس کے لئے بے خبری اور نا آگہی لازم ہے۔ ان کی زندگی بن جاتی ہے۔ یہ
 اگر ختم ہوتا ہے تو زندگی ختم ہو جاتی ہے۔ ۵

ورد ہے جان کے عوض ہر رگ و پے بس ساری
 چارہ گرہم نہیں ہونے کے جو درماں ہو گا
 لیکن یہ بات بھی یاد رکھنی ضروری ہے کہ اس بے آگہی میں اگر کہیں آگہی

ہو جاتی ہے تو صحیح قلندر یعنی جو شخص واقعہ عشق مولیٰ کے جذبہ سے وارفتہ اور مغلوب ہو جاتا ہے اس کی شان یہ ہوتی ہے کہ وہ آگہی، احترام شریعت بلکہ احکام شریعت سے عشق کی صورت میں جلوہ افروز ہوتی ہے کیونکہ اصل عشق تو یہی تھا اسی کی غیر متقلد افزونی و فراوانی نے یہ بے خودی پیدا کر دی ہے۔

کسی اور قلندر کی یہ شان ہو یا نہ ہو، لیکن جس قلندر کے احترام میں ہمارا قلم سرنگوں ہے۔ یعنی شیخ شرف الدین بوعلی شاہ قلندر ان کی شان تو یہی تھی۔ چنانچہ فرضیت نماز کی معافی کی روایت تو صرف مکالمہ میں ہے جس کو اختراعی قرار دیا گیا ہے۔ مگر جس واقعہ کو تمام سوارخ نگاروں نے بلا کم و کاست نقل کیا ہے وہ اسی عشق کی شہادت دینا ہے جس کو عشق شریعت کہنا چاہیے۔

واقعہ یہ ہے کہ ایک مرتبہ حالت سرمستی میں حضرت قلندر صاحب کی لہیں بہت بڑھ گئیں۔ کسی کی ہمت نہیں ہوئی تھی کہ قلندر صاحب کو آگاہ کرے یا خود تراش دے حضرت مولانا ضیاء الدین صاحب سنائی جو پابندی شریعت کے زیور سے آراستہ اور اتباع سنت کے بارہ میں عام شہرت رکھتے تھے۔ وہ قلندر صاحب کے پاس پہنچے۔ قبینچی ہاتھ میں لی۔ ریش مبارک پر ہاتھ رکھا اور لہیں تراش دیں۔ مولانا سنائی اپنا فعل کر چکے۔ مگر اس کے بعد قلندر صاحب کی حالت یہ تھی کہ :-

”ہمیشہ محاسن خود را بوسیدے و گفتے این ریش چه مبارک ریش است کہ در راہ

شریعت محمدی گرفتہ شدہ است۔“ (خزینۃ العقیار و اخبار اللاحقہ وغیرہ)

ترجمہ :- ریش مبارک کو بوسہ دیا کرتے تھے اور فرمایا کرتے تھے کہ یہ دارِ صحتی مبارک ہے

کہ شریعت محمدی کی راہ میں پٹری گئی ہے۔

اس واقعہ کی صحت سے انکار مشکل ہے۔ لیکن یہ واقعہ اس الزام اور پیمانہ

کی بھی بہت بڑی ترویج ہے کہ حضرت قلندر صاحب صوم و صلوة اور احکام شریعت

کی پابندی سے آزاد ہو گئے تھے۔ کیونکہ جو علماء و اٹھی اور موچھپوں کی غیر مسنون ہدیت برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ وہ صوم و صلوٰۃ جیسے بنیادی فرائض کے ترک کو کیسے برداشت کر سکتے تھے۔ مولانا ضیاء الدین سنائی تو اپنے زمانہ کے مشہور اہل بصیرت فضلاء میں سے تھے۔ انکی شان تو بہت بلند ہے شریعت کے ایک معمولی واقف کار کیلئے بھی یہ بات مضحکہ خیز ہے کہ نماز روزہ کے ترک سے تو متاثر نہ ہو۔ اور موچھپیں خلاف سنت ہو جائیں تو ان کی اصلاح کیلئے ہمت و جرات کے مظاہرہ میں پوری طاقت صرف کرے۔ یہاں تک کہ اپنے سات لڑکوں کو قربان کرے۔ کیونکہ اس واقعہ کو جس انداز سے شرف المناقب جیسی کتابوں میں بیان کیا گیا ہے۔ اس میں یہ بھی ہے کہ مفتی صاحب نے اس شرعی احتساب کے انجام دینے کے لئے پہلے اپنے لڑکوں کو بھی اتنا مفتی صاحب کے سات لڑکے تھے جو لڑکا بھی مقرض لے کر قلندر صاحب کے سامنے جاتا رہا۔ نگاہ جلال کی تلوار سے شہید ہوتا رہا۔ جب سات بیٹے شہید ہو چکے تب حضرت مفتی صاحب خود شریفے گئے۔ اور اس خدمت کو انجام دیا۔

بہر حال جو مفتی اور عالم احکام شریعت کے احتساب میں اس قدر باہمت اور سخت جان ہو کہ صرف ایک سنت پر عمل کرانے کے لئے سات بیٹوں کو قربان کرے وہ صوم و صلوٰۃ کے ترک کو کیسے برداشت کر سکتا ہے۔ اور اگر کسی کو مرفوع القم مجنوں سمجھ کر نماز روزہ جیسے فرائض سے غیر تکلف سمجھتا ہے تو وہ اس کو دارطی اور موچھپ کی مستحب یا مسنون ہدیت کے بارے میں بھی لامحالہ غیر مکتف سمجھے گا۔ اور احتساب کا ارادہ ہی نہیں کرے گا۔

جب یہ واقعہ اخبار الانبار اور خزینۃ الاستیاء جیسی مستند کتابوں کے حوالہ سے حیطہ تحریر میں آیا ہے تو مناسب معلوم ہونا ہے کہ شرف المناقب کی روایت کا بھی مکمل ترجمہ پیش کر دیا جائے جس سے ناظرین کرام بھی صحیح اور غلط کا اندازہ فرما

سکیں گے۔

”شرف المناقب میں ہے“ معتبر اہل سلف سے منقول ہے کہ ایک مرتبہ آل عاشق الہی حضرت شرف الدین بوعلی کی مونچھوں کے بال دراز ہو گئے تھے۔ کسی کی ہمت نہیں تھی کہ ان کو تراشنے کی ہمائش کر سکے۔ البتہ مولانا ضیاء الدین صاحب سنائی عرف علی مفتی جو علماء شریعت کے مقتدا تھے۔ انہوں نے قصّ شوارب (مونچھیں کترنے) کے احتساب اور مونچھوں کو سنت کے مطابق تراشنے کے لئے اپنے ساتھ لڑکے بھجے جو لڑکا بھی حضرت بوعلی کے سامنے مونچھیں تراشنے کے لئے پہنچتا تھا حضرت شرف الدین بوعلی (جو قتال کے لقب سے مشہور ہیں) آپ کی نگاہ جلال کی تلوار کی ضرب سے شربت شہادت چکھتا تھا۔ مفتی نے کہا الحمد للہ میرے لڑکے شرع محمدی کی راہ میں شہید ہوئے۔ پھر خود اپنے ہاتھ میں مقرض لی اور آنحضرت کے سامنے پہنچے۔ چونکہ قلندر عاشق کو ہمیشہ ذات ذوالجلال کا مشاہدہ اور جناب رسالت پناہ کی مجلس مبارک کی حاضری میسر رہتی تھی حکم شریعت کی تعمیل کے لئے سر جھکا کر مفتی صاحب کے اقدام کو قبول کیا۔ جب مونچھیں تراشیں گئیں تو ہر ایک بال کی جڑ سے خون کا قطرہ جاری ہو گیا۔ اس کے بعد آنحضرت (قلندر صاحب) اپنی داڑھی کے بالوں کو اپنے مبارک لبوں سے بوسہ دیتے تھے اور فرماتے تھے۔ الحمد للہ یہ داڑھی شرع محمدی کی راہ میں پکڑی گئی ہے۔ چونکہ حضرت قلندر صاحب کے بدن مبارک کا ہر بال یاد الہی میں مشغول اور مقام رضا و تسلیم میں سرگرم رہتا تھا تو اتنے بالوں کے جدا ہو جانے کا کسی قدر ملال حضرت قلندر صاحب کو ہوا۔ اور آپ نے فرمایا۔ مفتی تیری قبر گدھوں کی چراگاہ ہوگی۔ جو گدھا گم ہو جایا کرے گا وہ تیری قبر پر ملا کرے گا۔ چنانچہ مشہور ہے کہ عرصہ تک ایسا ہی ہوتا رہا۔

بہر حال یہ تضاد بیانی انھیں مصنف صاحب کا مخصوص حصہ ہے کہ ایک

طرف حضرت قلندر صاحب مفتی ضیاء الدین صاحب کے سامنے اس لئے تسلیم خم
 کرویں کہ قلندر صاحب کو ہمیشہ دربار رسالت کی حاضری میسر رہتی تھی اور دوسری
 جانب یہی حاضر باش سات لوجوانوں کو ناحق قتل کرویں۔

مختصر یہ کہ اصل واقعہ اتنا ہی ہے کہ حضرت مفتی صاحب نے لبیس تراشیں
 اور قلندر صاحب کو اس پر وجد آگیا کہ اُن کی داڑھی راہ شریعت میں پکڑی گئی۔
 (واللہ اعلم بالصواب)

ہمارے خیال میں ہر وہ عالم تارک الدنیا ہے جو خدمتِ دین کو
اسباب ترک اپنی ذاتی منفعت پر مقدم سمجھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم
 کی سنت مبارکہ نے ترک دنیا کا جو نقشہ پیش فرمایا ہے وہ اسی کے مشابہ ہے۔
 صحابہ کرام میں سے تین فرد آستانہ حرم پر حاضر ہوئے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم
 کی خانگی زندگی اور خلوت کے مشاغل کے متعلق معلومات حاصل کرنی چاہیں۔

ان حضرات کے نزدیک ترک دنیا کے معنی یہ تھے کہ انسان کھانا پینا
 چھوڑ دے۔ ہمیشہ روزے سے رہے۔ رات بھر خدا کی یاد میں مصروف رہے
 اپنے اوپر سونا حرام کر لے۔ ازودِ حاجی زندگی سے کنارہ کش ہو جائے۔ جب ان کو
 معلوم ہوا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اندرون خانہ اس طرح رہتے ہیں جیسے ایک
 گریستی رہتا ہے۔ گھر کا کام بھی کرتے ہیں۔ اہل و عیال سے خوش طبعی بھی فرماتے ہیں۔
 رات کو آرام بھی فرماتے ہیں۔ روزے بھی رکھتے ہیں۔ مگر زیادہ تراویح کرتے ہیں۔ تو ان
 تحقیق کرنے والے حضرات کو حیرت ہوئی۔ کیونکہ زہد و تقویٰ اور ترک دنیا کا جو "معیار"

انھوں نے قائم کیا تھا۔ یہ باتیں اس معیار سے کم تھیں۔ مگر جو عقیدت ان صاحبان
 کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے تھی وہ اجازت نہیں دیتی تھی کہ آپ کی پاک زندگی کو
 زہد و تقویٰ کے معیار سے ساقط اور گری ہوئی قرار دیں۔ تو ان حضرات نے یہ توجہ یہ

کی کہ حضرت رسالت مآبؐ کا کیا کہنا، آپ کی شانِ نبویؐ ہے۔ آپ تو "محبوبِ خدا" ہیں آپ کی تمام خطائیں اور لغزشیں معاف ہیں۔ پس ہمیں اپنے اوپر آپ کو قیاس نہ کرنا چاہیے۔ آپ جو کچھ بھی کرتے ہوں وہ آپ کا فعل ہے۔ ہمیں تو یہ طے کرنا چاہیے کہ ازواجی زندگی ختم کر دیں، رات کو سونا اور دن کو کھانا حرام کر لیں، یعنی پوری رات یا وہ خدا میں صرف کیا کریں اور دن بھر روزہ رکھا کریں۔

ان حضرات کے اس فیصلہ کا علم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ہوا تو آپ نے برہمی کے ساتھ فرمایا۔ بیشک میں رات کو سونا بھی ہوں اور نوافل بھی پڑھتا ہوں دن کو کھاتا بھی ہوں اور روزے بھی (جب موقع ہو) رکھتا ہوں۔ میری بیویاں بھی ہیں جن کے حقوق ادا کرتا ہوں۔ یہی دین ہے یہی سنت ہے جو اس سے روگردانی کرتا ہے وہ مجھ سے منھ موڑتا ہے۔

بہر حال ترک دنیا یہ نہیں کہ دنیا کی پاک چیزوں کو اپنے اوپر حرام کر لیا جائے۔ ترک دنیا یہ ہے کہ اپنے نفس کے تزجی حق کو ختم کر دیا جائے۔ دنیا کی تمام خوشگواریاں اور تمام دلچسپیاں جائز اور مباح ہیں۔ جب تک کوئی دینی مصلحت مقابلہ پر نہ آئے اور جہاں مقابلہ ہو اس وقت دینی مصلحت کو نظر انداز کرنا، طلب دنیا ہے خواہ آپ عیش و رفاہیت میں ہوں یا فقر و افلاس میں۔

ارشادِ ربانی ہے :-

"کہہ دیجئے 'اگر آپ کے باپ بیٹے، بیویاں، عزیز و اقارب، دھن و دولت، کھیت کبار، باغ باغیچے، دکان اور تجارت، یا مکان اور جائیداد، اللہ اور اس کے رسول اور راہِ خدا میں جانفشانی اور جہاد کے مقابلہ میں زیادہ محبوب اور پسندیدہ ہیں۔ تو تم صاحبِ ایمان تو کیا ایک ایسی قوم ہو جو عذاب کی مستحق ہے؟" اب تمہیں اللہ کے عذاب کا انتظار کرنا چاہیے۔ (سورہ توبہ)

بہر حال ترک دنیا اصل میں ترکِ محبت ہے۔ شان و شوکت یا راحت و آرام کا ترک ہمیشہ ترک دنیا نہیں ہوا کرتا۔ بلکہ یہ ترک بھی بسا اوقات حبِ دنیا بن جاتا ہے۔
(معاذ اللہ)

چسیت دنیا از خدا غافل شدن
نے قماش و نقرہ و فرزند و زن

پس قلندر صاحب اس وقت بھی تارک دنیا تھے جب وہ "مسجد قوت الاسلام" میں شب و روز مطالعہ اور درس میں مصروف رہتے تھے۔ کیونکہ اس وقت بھی آپ کی بلند و بالا شخصیت حرص و طمع سے پاک اور ذاتی مفاد کی بندشوں سے آزاد تھی۔ غالباً آپ نے اسی زمانہ میں فرمایا تھا۔

زہد و تقویٰ چسیت اے مردِ فقیر
لا طمع بودن ز سلطان و امیر
پشت پا زن تخت کیکاؤس را
سر بدہ از کف مدہ ناموس را

لیکن اس سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ آپ نے آخر کار وہ صورت اختیار کی جس کو عام اصطلاح میں ترک دنیا کہا جاتا ہے اور سمجھا جاتا ہے۔ یعنی سامانِ درس و تدریس و اسبابِ قضا و فتویٰ کو دریا بُر و کر دیا۔ اور گوشہٴ صحرایہ کو اپنا مسکن بنایا۔ آپ نے ایسا کیوں کیا۔؟

ایک روایت یہ ہے کہ وہی درویشِ خمبول نے ولادت سے تیسرے روز مکانِ پرشرف لاکر وہ آیت پڑھی تھی جس کو سنکر اس "قلندر نومولود" نے گریہ بند کیا تھا، یہی بزرگ مسجد قوت الاسلام میں تشریف لائے حضرت قلندر صاحب درس میں مشغول تھے۔ درویش صاحب نے فرمایا۔ یہاں شرف الہین کب تک اس "قبلہ" میں

میں پڑے رہو گے۔ قلندر صاحب نے اس سوال کا جواب اپنے عمل سے دیا۔ یعنی کتاب بند، محفلِ درس ترک، صحرا نوردی اور آبلہ پیمائی کو لبیک۔

رخصت اے زنداں جنوں زنجیر و رکھڑ کائے ہے
مردہ خار و شت پھر تلوا مرا کھجلائے ہے

اس سلسلہ میں ایک عجیب و غریب واقعہ بھی بیان کیا گیا ہے جس کا تعلق اس زمانہ کے حکمران سے ہے۔ شیخ محمد صاحب عثمانی مصنف شرف المناقب نے صرف بادشاہ کا لفظ استعمال کیا ہے۔ اس کا نام نہیں لیا اور محمد مسیح اللہ صاحب پانی پتی نے اپنے غیر مطبوعہ رسالہ میں (جس کو انھوں نے "اَجڑے دیار" سے معنون کیا ہے) غیاث الدین بلبن کا نام لیا ہے کہ اس کے کوئی لڑکا نہیں تھا۔ بیگمات چاہتی تھیں کہ ان کے لڑکا ہو تاکہ بادشاہ کا تقرب زیادہ ہو اور دوسری جانب یہ واقعہ ہوا۔ کہ کوئی شخص حضرت شیخ شرف الدین صاحب کے پاس آیا۔ اور عرض کیا کہ ہمارے پیر کا انتقال ہو گیا ہے۔ اور انھوں نے مرنے وقت وصیت کی تھی کہ غسل جنازہ کے وقت ان کی لنگوٹی نہ کھولی جائے۔ آیا اس طرح غسل دینا جائز ہے یا نہیں۔ حضرت شیخ شرف الدین صاحب نے ناجائز قرار دیا۔ تو اس شخص نے عرض کیا کہ میں تو اپنے پیر کی وصیت کے خلاف نہیں کر سکتا۔ مہربانی فرما کر آپ زحمت گوارا فرمائیے اور تشریف لے چلئے۔ شریعت کے مطابق غسل کرا دیجئے۔

حضرت قلندر صاحب اس کے ساتھ ہوئے۔ تھوڑی دور چل کر دیکھا۔ کہ ایک سڑک کے کنارے پر ایک فقیر مرا پڑا ہے۔ لنگوٹی کسے ہوئے ہے۔ حضرت قلندر صاحب نے اس کو غسل دینا شروع کیا اور لنگوٹی کھولنی چاہی وہ مردہ فقیر اٹھ بیٹھا اور کہا: "جہاں نامرد لنگوٹ پر ہاتھ ڈالیں وہاں مرنا بھی مناسب نہیں ہے۔" یہ کہہ کر چل دیا۔

حضرت قلندر صاحب ششدر رہ گئے۔ اس شخص سے جو ساکت لے گیا تھا اصل معاملہ دریافت کرنا چاہا تو اس نے کہا۔ مولانا یہ فقیری ہے۔ تمہیں اگر یہ نکتہ معلوم ہوتا۔ تو تم باپ اور بیٹی کا نکاح ہی کیوں کرتے۔ اب تو شیخ بوعلی صاحب اور کبھی چکرائے اور سیدھے بادشاہ کے محل پر پہنچے۔ بادشاہ کو کل ماجرا سنایا۔ بادشاہ خود پریشان تھا۔ فوراً تحقیقات کی تو معاملہ کھل گیا۔ بادشاہ نے اللہ کا شکر ادا کیا کہ اس نے اپنے فضل و کرم سے ایک عظیم مصیبت سے بچایا۔

اس واقعہ نے مولانا شرف الدین بوعلی پر یہ اثر کیا کہ آپ نے کتابیں دریا میں غرق کیں اور فرمایا:-

جبہ و دستارِ علم و قیل و قال
 جملہ و رآبِ رواں اندا ختم
 یہ بھی کہا جاتا ہے کہ آپ نے ہندی کا یہ دوہا پڑھا:-
 پنڈت لیکھیا پانچ کر بولتی پانی پور
 سگرے انچھریٹ کر من میں سائیں توڑ
 پوتھی تو تھوتی بھئی پنڈت بھیا نہ کوئے
 ایک انچھریٹ پریم کا پڑھے سو پنڈت ہوئے

یہ واقعہ جس میں سراسر افسانوی رنگ ہے ممکن ہے اصلیت رکھتا ہو اور کسی لاعلمی کی بنا پر حضرت شیخ نے کوئی ایسا نکاح پڑھو دیا ہو جو شرعی جواز سے محروم ہو۔ مگر ہمارے خیال میں اس زمانہ کے سیاسی اور سماجی ماحول کو آپ کے اس فیصلہ اور عمل میں بہت بڑا دخل ہے۔ آپ کی ثنوی سے اس کی شہادت مہیا ہوتی ہو جو عنقریب پیش کی جائے گی۔ (النشار اللہ)

اگر "حاکمانہ" وغیرہ کی روایتوں پر اعتبار کیا جائے کہ آپ چالیس سال

کی عمر میں دہلی تشریف لائے۔ پھر چالیس سال آپ نے خدمت درس انجام دی۔ اور بیس سال عہدہ قضا پر فائز رہے تو اس طرح سو سال کی عمر کے بعد آپ پر وہ کیفیت طاری ہوئی جس کو قلندری سے تعبیر کیا جاتا ہے یعنی جب آپ کی عمر سو سال پورے کر چکی تبا آپ نے دنیا ترک کی۔ اور اگر عہدہ قضا کے بیس سال کو مدت درس میں شامل کر لیا جائے یعنی یہ تسلیم کیا جائے کہ بیس سال تک صرف درس دیتے رہے اور بیس سال درس کے ساتھ فرائض قضا بھی انجام دیئے جیسا کہ اس زمانہ کا عام دستور تھا کہ قاضی اور جج صاحبان عدالت سے فارغ ہو کر دوسرے اوقات میں درس بھی دیا کرتے تھے تو اس طرح آپ نے اسی سال کی عمر میں یہ "ترک" اختیار کیا۔

"گلزار ابرار" میں "حکمنامہ" کے بجائے "حکمت نامہ" تحریر ہے حکمت نامہ کے حوالہ سے یہ نقل کیا ہے کہ شیخ شرف الدین نے فرمایا۔ میری عمر چالیس سال تھی۔ جب میں دہلی پہنچا۔ حضرت خواجہ بختیار کاکی کے مزار پر حاضری دی۔ پھر درس افتار میں مشغول ہو گیا اور بیس سال تک یہ خدمت انجام دیتا رہا۔ پھر جذبہ ربانی طاری ہوا۔ درس و افتار بند کیا اور اللہ کی زمین کی سیاحت شروع کی۔ شیخ شمس الدین تبریزی اور شیخ جلال الدین رومی کی خدمت میں حاضر ہوا۔ ان دونوں سے خرقہ خلافت حاصل کیا۔ اس کے بعد ہندوستان واپس آیا اور جو کچھ سامان درس و تدریس تھا۔ اس کو "دریائے حین" کی نذر کر دیا۔ گلزار ابرار کی اس روایت کو اگرچہ مولانا عبدالحی صاحب نے بھی "نزہۃ الخواطر" میں نقل کر دیا ہے۔ مگر اس کے علاوہ کہ آپ کی عمر ۴۴ سال تھی جب آپ دہلی آئے۔ اس روایت کا باقی حصہ مجروح ہے۔ پہلی جرح تو یہ ہے کہ اس روایت میں "مدت درس" بیس سال بیان کی ہے۔ حالانکہ خود حکیم صاحب نے چند سطر اوپر تحریر فرمایا ہے کہ:-

”اشتغل بالعلم فدرس و افاد ثلاثین سنۃ“

(نزہۃ الخواطر ج ۳ صفحہ ۵)

ترجمہ :- زعلم میں مشغول رہے۔ تیس سال تک درس و تدریس کا فیض جاری رکھا۔
پھر اگر بیس سال بھی مدت درس تسلیم کر لی جائے۔ تو دوسری جرح یہ ہے کہ
زمانہ سیاحت میں تبریز پہنچ کر شیخ شمس الدین تبریزی سے خرقہ خلافت حاصل
کرنے کی بات کسی طرح بھی صحیح نہیں ہوتی۔ کیونکہ قلندر صاحب کا یہ سفر سیاحت
کم از کم ۶۲۴ھ میں شروع ہوا ہوگا۔ حالانکہ حضرت شمس الدین تبریزی اس سے
اٹھارہ سال پہلے ۶۲۵ھ میں شہید کئے جا چکے ہیں۔ بیشک حضرت جلال الدین
رومی کی وفات ۶۴۲ھ میں ہوئی۔ مگر کسی اور روایت سے اس کی تصدیق
نہیں ہوئی کہ قلندر صاحب کی ملاقات حضرت مولانا رومی سے ہوئی۔ ہاں یہ
درست ہے کہ قلندر صاحب نے اپنی ثنوی میں بار بار مولانا روم کا ذکر فرمایا ہے مگر
اس سے یہ ضروری نہیں ہو جاتا کہ مولانا روم سے ملاقات بھی ہوئی ہوگی۔

بہر حال جب قلندر صاحب کا سنہ ولادت ۶۰۰ھ ہے۔ اور چالیس سال
کی عمر میں آپ دہلی تشریف لائے تو اتنی بات تو ثابت ہوئی کہ دہلی میں آپ کی تشریف
آوری ۶۲۴ھ میں ہوئی ہے۔ اتفاق سے ہی وہ سال ہے جس کے پہلے مہینے یعنی
محرم الحرام سے سلطان ناصر الدین محمود اول کی سلطنت شروع ہوئی ہے۔

ناصر الدین محمود و سلطان شمس الدین التمش کا سب سے پہلا تعلق
شمس الدین التمش کی ۲۰ سالہ سلطنت ۶۱۵ھ میں ۶۲۴ھ میں اس
کی وفات پر ختم ہوئی۔ اس کے بعد اگر یہ قاعدہ کے مطابق اس کے بڑے لڑکے اور
ولی عہد رکن الدین فیروز شاہ کوئلن پہنایا گیا۔ مگر اس کی ناقابلیت نے سات ماہ
زیادہ اس کو سلطنت کی مہلت نہیں دی۔ ۶۲۴ھ کے وسط میں امرار دولت

اس کو معزول کر کے اس کی بہن رضیہ سلطانہ کو تخت نشین کر دیا۔ مگر اس کو بھی صرف تین سال کی مہلت ملی۔ ۶۳۷ھ میں اس قابل اور بہادر خاتون اور اس کے نئے شوہر دوزل کو تلوار کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ اس کی جگہ اس کے بھائی معز الدین بہرام شاہ کو تخت پر بٹھایا گیا لیکن دو ہی سال کے بعد اس کو بھی معزول کر کے قتل کر دیا گیا اور اس کی جگہ رکن الدین فیروز شاہ کے لڑکے علاء الدین مسعود شاہ کو سلطنت کی باگ ڈور دیدی گئی۔ مگر یہ غریب بھی دانش و جرأت سے محروم تھا زیادہ عرصہ زمام سلطنت نہ سنبھال سکا، صرف چار سال گزرنے پائے تھے کہ اراکین دولت اس سے بھی متنفر ہو گئے۔ ۶۴۲ھ محرم ۲۶ کو اسے معزول کر کے قید میں ڈال دیا۔ اب جس کو سلطنت کے لئے منتخب کیا گیا۔ وہ یہی ناصر الدین محمود اول تھا جس کا ذکر چند سطر پہلے آچکا ہے۔

ناصر الدین محمود وہ بادشاہ ہے جو نہ صرف اس خاندان میں جس کو "خاندان غلامان" کہا جاتا ہے سب سے زیادہ نیک نفس، عادل اور رحم پرور تھا۔ بلکہ دہلی کے تمام بادشاہوں میں اس کو وہ امتیاز حاصل ہے جو کسی دوسرے کو میسر نہیں آیا۔ اس بے چارے نے اپنے والد سلطان شمس الدین التمش کی وفات کے بعد سے اب تک گیارہ سال نظر بندی میں گزارے تھے۔ لیکن اس کی یہ دانشمندی تھی کہ نظر بندی کے اس دور کو اس نے خفیہ سازشوں یا خواب و راحت میں ضائع نہیں کیا۔ بلکہ اس نے اس فرصت کے ایک ایک لمحہ کو اپنی سیرت کی تعمیر میں صرف کیا۔ کتابوں کے مطالعہ سے اس کو شغف تھا اور اپنی محنت سے اپنا رزق فراہم کرنا اس نے اپنی زندگی کا پروگرام بنالیا تھا۔ یہ بہترین خطاط تھا۔ اس نے کتابت کو ذریعہ معاش بنایا۔ اسی کی آمدنی سے وہ گذراوقات کرتا تھا۔ وہ بادشاہ بن کر تخت پر بیٹھا تب بھی اس کے ہاتھ سے قلم نہیں چھوٹا۔ ایسی

تربیں بہت سی اختیار کیں جن سے اہل ملک کی زندگی کا معیار بلند ہو۔ مگر اپنی زندگی کا معیار وہی قائم رکھا جو نظر بندی کے زمانہ میں تھا۔ نوکر رکھنے کی استطاعت نظر بندی کے زمانہ میں نہیں تھی۔ گھر کا کھانا خود بیوی پکاتی تھی۔ جب یہ بادشاہ اور بیوی ملکہ جہاں بی بی۔ تب بھی اپنے خادم وہ خود ہی رہے۔ بیوی خود ہی رزنی پکاتی، گھر کا کام خود ہی کرتی اور بادشاہ کتابت کی مزدوری کرتا اور امور سلطنت سے فراغت پاتا تو اپنے کپڑے خود سینے لگتا تھا۔

یہ حسن اتفاق تھا کہ حضرت شاہ بوعلی قلندر دہلی پہنچے۔ تو دہلی کی قسمت بھی سلطان ناصر الدین محمود جیسے انصاف پسند، پاکیزہ سیرت، نیک بادشاہ کے آفتاب اقبال سے چمک اٹھی۔

قدرت کی فیاضیوں نے اس کو وزیر بھی ایسا ہی نیک نفس، نیک نیت، باتذیر اور وفادار دیا تھا۔ غیاث الدین بلبن جس کا نام آج تک عزت سے لیا جاتا ہے وہ اس کا وزیر تھا۔

وزیرے چنیں شہر یارے چنیاں

جہاں چوں نگیں و قرارے چنیاں

حضرت شیخ شرف الدین جب ۶۴۴ھ میں دہلی پہنچے۔ تو سلسلہ درس تو آپ نے کچھ دنوں بعد ہی شروع کر دیا۔ مگر عہدہ قضا یقیناً اس وقت نہیں ملا ہوگا اگرچہ مکالمہ کے الفاظ سے سمجھ میں آتا ہے۔ کہ چالیس سال بعد اس عہدہ پر فائز ہوئے مگر یہ یقیناً غلط ہے۔ کیونکہ چالیس سال بعد سیاست کا وہ گھناؤنا دور آتا ہے جس میں بوعلی شاہ قلندر تو کیا معمولی درجہ کا نیک سیرت انسان بھی عہدہ قضا قبول کرنے کے لئے تیار نہیں ہو سکتا تھا۔

مختلف روایتوں کے ملانے سے بطور قدر مشترک جو بات ثابت ہوتی ہے

وہ یہ ہے کہ قریباً چالیس سال آپ نے درس اور منصبِ قضا کی خدمت میں صرف کئے۔
قیاس یہ ہے کہ جس طرح آپ کا دہلی پہنچنا اس مبارک اور مسعود وقت
میں ہوا تھا جب سلطان ناصر الدین محمود جیسے سلطان عادل کے عروج سے دہلی
کی قسمت جاگی تھی۔ ایسے ہی جب یہ دور ختم ہوا اور سرزمینِ دہلی پر بادشاہوں کا
خون بہنے لگا۔ تو حضرت قلندر صاحب نے رختِ سفر باندھا اور نہ صرف شہرِ دہلی
کو خیر باد کہا۔ بلکہ شہری زندگی ہی کو "الوداع" کہہ دیا۔

سلطان ناصر الدین محمود بیس سال حکومت کر کے جمادی الاول ۶۶۲ھ

۲۶۶ھ میں اس دار فانی سے رخصت ہوا تو امرائے دولت نے اس کے وزیر

غیاث الدین بلبن کو جس کے عادلانہ جہر اور نفاذِ سلطنت کی بہترین قابلیت کا

تجربہ زیادہ دراز سے کرتے چلے آئے تھے، بادشاہ بنا دیا۔ یہ اسی طرح منصفانہ شان

اور بہادرانہ شوکت سے بائیس سال تک سلطنت کرتا رہا۔ ۶۸۶ھ (۲۸۷ھ)

میں جب اس کی عمر تقریباً ۸۵ سال تھی۔ اس نے بھی جان شیریں جان آفرین کے

حوالہ کی۔ لیکن اس کی وفات کے بعد فوراً ہی دہلی کا ستارہ اقبال گردش میں آ گیا۔

غیاث الدین بلبن نے سوچ سمجھ کر اپنے اپنے "کچھنر" کو دہلی عہد بنایا تھا لیکن اس

کے دوسرے پوتے "کیقباد" کی سازش غالب آئی۔ کیقباد نے خود تختِ سلطنت

پر قبضہ کیا اور ولی عہد کو تختہ دار پر لٹکا دیا۔ لیکن اس کی سازشی سلطنت کا میزاب

نہیں ہوئی۔ ایک فوج کا کمانڈر شائستہ خاں حلی سامنے آیا۔ اس نے کیقباد کو

"کلو کھڑی" کے محل میں قتل کروا کر اس کی لاش محل کی کھڑکی سے دریائے جمنا کی

ریتی میں پھینکوا دی۔

عوام کے ہیجان کو فرو کرنے کے لئے اس وقت کیقباد کے تین مہارٹے "کیو مر شاہ"

کو بادشاہ بنا دیا۔ اور جب حالانکہ کھیو مر معتدل ہوئے تو اس تین سالہ بچے کو بھی

وزح کرا کر ۶۸۹ھ (۱۲۹۵ء) میں خود تاج سلطنت اپنے سر پر رکھ لیا۔ مختصر یہ کہ سلطان غیاث الدین بلبن کی وفات سے صرف تین سال کے اندر نہ صرف یہ کہ دو بادشاہ قتل کئے گئے بلکہ اس خاندان کی سلطنت ہی ختم ہو گئی۔ اور اب بھی سلطنت کا آغاز ہوا جس کا بانی یہی شائستہ خاں ہے جس نے اپنا لقب اور خطاب جلال الدین فیروز شاہ اختیار کیا۔

چاہ کنڈہ را چاہ در پیش

چشمِ عبرت کے لئے کتنا عجیب و غریب سبب ہے کہ یہی شائستہ خاں اپنی تمام صلاحیتوں اور قابلیتوں کے باوجود پورے چھ سال بھی حکومت کرنے نہیں پایا، کہ ۶۹۵ھ میں خود اس کے پروردہ برادر زادہ اور داماد نے اس کو قتل کر کے تاج بادشاہت اپنے سر پر رکھا۔ اور بادشاہ کے سر کو جھنڈے پر آویزاں کر کے پورے لشکر میں گشت کرایا۔

یہ بھتیجے صاحب جس نے اپنے خسر اور چچا کو قتل کیا "غلام الدین خلجی" ہیں۔ شائستہ خاں نے اس کو گورنر بنا رکھا تھا۔ مگر غلام الدین کی نظریں بہت ادبچی تھیں وہ صرف گورنری پر قناعت نہیں کر سکتا تھا۔ اول اس نے جنوبی ہند پر حملہ کر کے برار اور خاندیش وغیرہ کو فتح کیا۔ اور جب وہاں سے پٹنہ تو اب اس کی نظر بادشاہت کے سوا کسی اور پر نہیں تھتی تھی۔ اس نے اپنے چچا شائستہ خاں کو اپنے قیام گاہ "کترہ مانکپور" آئے کی دعوت دی۔ چچا اگرچہ ہمیشہ داماو کے غلام الدین سے وابستہ نہیں تھا، کیونکہ میاں بیوی اور ساس داماو کے تعلقات اپنا نہیں تھے، لیکن ہونہار بھتیجے کی حیثیت سے بہت خوش تھا۔ بھتیجے جو غریب بیوی لے گیا تھا، اسے بعد واپس آیا تھا۔ جب اس نے ملاقات کے لئے دعوت دی تو شائستہ خاں جلال الدین فیروز شاہ سے نہیں رہا گیا۔ اعلان سلطنت نے منع بھی کیا۔ مگر اس کو اپنے بھتیجے اور خود اپنی

ہمت پر اتنا اعتماد تھا کہ گنگا کے راستہ "کٹرہ مانکپور" پہنچ گیا۔ کشتی وسط رمضان میں کٹرہ مانکپور کے قریب پہنچی۔ علامہ الدین استقبال کے لئے کشتی پر آیا۔ اور نخل گیر ہوتے ہی خنجر چچا کی نخل میں رسید کر دیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

دہلی میں بادشاہ کے حادثہ کی خبر پہنچی تو ملکہ جہاں نے اپنے بیٹے رکن الدین ابراہیم شاہ کو تخت نشین کر دیا۔ مگر یہ بادشاہت صرف اس وقت تک تھی۔ جب تک علامہ الدین کا لشکر جبار دہلی نہیں پہنچا تھا۔ لشکر کے پہنچنے میں چار ماہ صرف ہوئے۔ اور جب جنوبی ہند کا فاتح لشکر لے کر دہلی پہنچ گیا تو رکن الدین ابراہیم شاہ کی بادشاہت خس و خاشاک کی طرح بہہ گئی۔ رکن الدین کی زندگی کا تو سوال ہی کیا۔ ساتھ میں اس کی مال اور اس کے دوسرے عزیزوں کو بھی تہ تیغ کر دیا۔

یہی علامہ الدین ہے جس کا تذکرہ تمہاری مضمون میں گذر چکا ہے جس کے متعلق حضرت امیر خسرو کے الفاظ یہ تھے کہ "مہذب ڈاکو" ہیں۔

بادشاہت کے متعلق ان بادشاہوں کا نظریہ یہ تھا کہ "بادشاہت بانجھ ہوتی ہے" نہ اس کا کوئی رشتہ ہوتا ہے نہ قرابت، لہذا بادشاہت کے لئے ہر ایک کا خون مباح ہے خواہ کوئی ہو۔

بہر حال اس جرم کے بعد جو خود علامہ الدین کی نظر میں ممکن ہے جرم نہ ہو۔ اس کی بادشاہت ضابطہ اور قاعدہ کی بادشاہت رہی۔ چنانچہ اس کا شمار ہندوستان کے کامیاب بادشاہوں میں ہوتا ہے۔ اس کا دور حکومت ۱۶۱۶ء سے ۱۶۳۱ء تک رہا۔ شوال ۱۰۱۶ھ میں اس نے بھی عالم جاودانی کو خیرت سفر باندھا۔

جہاں را چنیں سدا آئین و داد

کہ جز مرگ کس را ز مادر نہ زاد

علامہ الدین کے بعد پھر انگریزی پسیلی اور طوائف الملکی کا دور ہوا۔ یہاں

تک کہ حضرت بوعلی شاہ قلندر کے سنہ وفات ۲۴، ۶۷ تک تخت شاہی کو تین مرتبہ
"قتل گاہ" بننا پڑا۔

سلطان علاء الدین کے بعد اس کے سرب سے چھوٹے لڑکے شہاب الدین عمر
کو تخت نشین کیا گیا جو صرف ایک سال سلطنت کر سکا۔ قطب الدین مبارک دل
نے اس کو قتل کر کے سر پر سلطنت پر قدم رکھا۔ وہ بھی ۴ سال سے زیادہ جم نہ سکا۔
۶۲ھ میں ناصر الدین خسرو نے اس کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ اور اس کے
ساتھ اس کے خاندان کے اور افراد کو بھی تہ تیغ کیا کہ کوئی اس کے مقابلہ پر نہ
آسکے۔ لیکن اپنی تمام تدبیروں کے باوجود قدرت کے دستِ قہر سے نجات نہ پاسکا۔
پنجاب کے گورنر غیاث الدین تغلق نے علم بغاوت بلند کیا اور خسرو کو گرفتار کر کے
حکم دیا کہ جس جگہ خسرو نے قطب الدین کو قتل کیا تھا۔ اسی مقام پر اس کو قتل کیا
جائے۔ خسرو خاں نے اپنی بادشاہت کے تحفظ کے لئے خاندانِ خلجی کے تمام ایسے
افراد کو قتل کروا دیا تھا جن سے مقابلہ کا خطرہ تھا۔ اب خسرو خاں کے قتل ہونے کا
نتیجہ یہ نکلا کہ اس پورے خاندان کی سلطنت ختم ہو گئی۔ اور ۶۲ھ سے یہ تخت
خاندانِ تغلق کے حوالہ ہوا جس کا بانی یہی غیاث الدین تھا۔ جو ۶۲ھ میں مکان
کے نیچے وب کر مر گیا۔ کہا جاتا ہے کہ اس کے بیٹے برنا شاہ نے وہ مکان بنوایا ہی
ایسا تھا کہ معمولی جھٹکے سے گر جائے۔ چنانچہ چند مسرت ہاتھیوں نے جو لڑ رہے تھے
مکان میں ٹکر ماری اور یہ محل اس طرح گر گیا کہ غیاث الدین تغلق کی بادشاہت کو
بھی لے بیٹھا۔

یہاں بادشاہوں کی سوانح عمری لکھنی مقصود نہیں ہے بلکہ اس سیاسی فرائضی
کا ایک نمونہ پیش کرنا ہے جس کے متعلق بہارا خیال ہے کہ وہ حضرت شاہ بوعلی قلندر
کے تارک ہونے کا برا سبب بنی۔

سیاسی بحران کا اثر علماء اور مشائخ پر | سیاسی بدعالی اور خود غرضی و خود پرستی کا بحران جس طرح ختم

ہونے والے بادشاہ اور اس کے خاندان کے لئے مصیبت ہونا تھا وہ ان کے لئے بھی آزمائش بن جاتا تھا جو عالم اور مفتی کہلاتے۔ باندھی لحاظ سے علوم میں اثر درسوخ رکھتے تھے۔ کیونکہ عوام کا رجحان مذہبی تھا۔ ہر ایک قاتل و سفاک بادشاہ اپنی خود غرضی کے راستہ پر قدم بڑھاتا ہوا یہ چاہتا کہ کوئی مذہبی نشان بھی اُس کے ہاتھ میں ہو جس سے وہ اپنی اس سفاکی اور خونریزی کا جواز ثابت کر سکے اور اس طرح عوام کے ہجوم کو اپنے ساتھ رکھ سکے۔

وہ نام کے علماء جن کی نظر اپنے اقتدار اپنے مفاد، شاہی وظیفہ اور جاگیر پر ہوتی تھی وہ پوری قابلیت صرف کرنے دریا کی تہ میں سے یہ کوری نکالتے تھے اور بادشاہ جہاں پناہ کے لئے کوئی نشان غماہم کرتے تھے۔ لیکن حق پرست و خدا ترس علماء کے لئے یہ مصیبت و دہری ہو جاتی تھی۔ ایک طرف بادشاہ کی ٹیڑھی ترچھی نگاہ جو بسا اوقات "برق خرمین سوز" کا کام کرتی تھی اور دوسری جانب شاہ پرست علماء کا طعن و تشنیع جو ان شکستہ دل علماء ررہانی کے لئے تیر و اشتر سے بھی زیادہ تیز ہوتا تھا۔ اس صورت حال کو سامنے رکھ کر جب حضرت قلندر صاحب کی شنوی سنگنی جاتی ہے تو معلوم ہوتا ہے وہ اسی پس منظر کی ایک تصویر ہے اور "گفتہ آید در حدیث دیگران" میں حضرت قلندر صاحب نے وہ سب کچھ کہہ دیا ہے جس کے دل شکن اور ہوش ربا اثر نے حضرت قلندر صاحب کو ترک دنیا پر مجبور کیا تھا۔

ان حالات نے معاشرہ اور سماجی زندگی پر کیا اثر ڈالا ہے۔ اور عوام کی حالت کس درجہ تباہ ہے۔ اس کی تصویر ملاحظہ فرمائیے۔

ارشاد ہے :-

از جہاں مہر و وفا معدوم شد
 حال مردم یک بیک معلوم شد
 ترجمہ :- محبت اور وفاداری دنیا سے معدوم ہو چکی ہے، لوگوں کی حالت یک بیک معلوم ہو گئی ہے
 اے دریغنا وضع نیکان شد بدل
 در دیار حکم افتادہ تسلل!
 ترجمہ :- افسوس نیک لوگوں کی وضع بدل گئی۔ دنیا سے بدل و انصاف میں خلل پڑ گیا۔
 تیغ ممسک شجرہ احساں برید
 ہم چو عنقا ہمت از عالم پرید
 ترجمہ :- بخیل کی تلوار نے حسن سلوک کے درخت کو کاٹ ڈالا۔ ہمت اور حوصلہ عالم سے
 ایسے ہی اڑ گیا۔ جیسے عنقار کی جنس فنا ہو گئی۔
 ہمے رفتت از شاہ و گدا
 منعمان گشتند گدائے بے نوا
 ترجمہ :- شاہ اور گدا دونوں سے ہمت اور حوصلہ کی جنس فنا ہو گئی۔ دولت مند بھی
 گدائے بے نوا بن گئے۔
 ہمنے برخاستت از صدا ہمدرد لال
 دارم از وسرت زمانہ صد فنال
 ترجمہ :- اہل دل اور روحانی لوگوں سے بھی ہمت مفقود ہو گئی۔ وسرت زمانہ سے اپنے کاروں
 بار آہ و فغاں حسرت و ماتم۔
 رحم از دلہائے مرد و مہر شہاں
 سخنیے پیداستدہ بر مردمان
 ترجمہ :- انسانوں کے دلوں سے رحم بھی پروردہ پوش ہو گیا۔ لوگوں میں ایک قسم کی سختی پیدا ہو گئی۔

خلق نیکو شد ز عالم تا پدید
طبع مردم سگ صفت گشت پلید

ترجمہ :- اچھے اخلاق دنیا سے ناپید ہو گئے۔ آدمیوں کی طبیعت کتوں کی طرح پلید ہو گئی۔
یہ تو عوام کی حالت تھی۔ اب رہے خواص تو دولت مند امرار کی حالت یہ ہے۔

نیست رحمے در دلِ اہلِ دول
شیوہ اہلِ دول باشد و غل

ترجمہ :- دولت مندوں کے دلوں میں رحم نہیں ہے۔ دولت مندوں کا طریقہ دھوکا
اور مکر و فریب ہے۔

اہلِ دنیا بہر سیم و مال و زر
گر بدست آید خورد خونِ جگر

ترجمہ :- دنیا داروں کی حالت یہ ہے کہ سونا چاندی اور مال کی خاطر اگر ہو سکے تو جگر کا خون
بھی پی لیں۔

آں شنیدی کہ ز برائے عز و جاہ
بے گنہ گردند یوسف را بچاہ

ترجمہ :- تم نے سنا ہو گا کہ عزت اور جاہ کی خاطر حضرت یوسف علیہ السلام کو بلا کسی تصور
کے کنوئیں میں ڈال دیا تھا۔

از حسد بے رحمیِ انخواں بسبب
حال زار یوسف کنعان بسبب

ترجمہ :- حسد کے باعث بھائیوں کی آپس کی بے رحمی دیکھنا چاہو تو یوسف کنعان کا حال زار
دیکھ لو۔

تاجدار بادشاہوں کی حالت ملاحظہ فرمائیے :-

برسرت باشد ترا گر تاج زر
 کس نیاید از تکبر و در نظر
 ترجمہ :- اگر تمہارے سر پر سونے کا تاج ہو تو تکبر کی یہ حالت ہو کہ کوئی بھی نظر میں نہ آئے
 بلکہ روتابی چونم رود از خدا
 گم کنی خود را نترسی از جزا
 ترجمہ :- بلکہ نمود کی طرح خدا سے بھی منہ موڑ لو۔ اپنے آپ کو ایسا دارفتہ کر لو کہ خدا کا خوف دل
 سے نکل جائے۔

حرص افزوں می شود از مال و زر
 قطع گردد حسب فرزند و پدر
 ترجمہ :- مال و زر سے حرص میں اور اضافہ ہوتا ہے (یہاں تک کہ) بیٹے اور باپ کی محبت بھی
 ختم ہو جاتی ہے۔

بیچ جاویدے گدار بے نوا
 رو بگرداند چو فرعون از خدا
 ترجمہ :- اگر کسی جگہ کوئی گدائے بے نوا نظر پڑ جائے تو اس سے اس طرح منہ موڑ لیتا ہے۔
 جیسے فرعون نے خدا سے منہ موڑ لیا تھا۔

ان تاجداروں کی سفاکی اور بربریت کی حالت ملاحظہ فرمائیے۔
 بادشاہاں را بہیں کز بہر مال
 خون اخوان و پدر و انس و حلال
 ترجمہ :- بادشاہوں کو دیکھو کہ مال کی خاطر بھائیوں اور باپ کے خون کو بھی جائز اور حلال
 سمجھتے ہیں۔

۱۔ غالباً علاء الدین خلجی کے واقعہ کی طرف اشارہ ہے۔ (بقیہ حاشیہ ۹۴ پر ملاحظہ ہو)

حکومت اور معاشرہ یعنی راج اور سماج کو یاد امن اور چولی ہیں۔ ایک کا اثر دوسرے پر پڑتا ہے۔ بادشاہ اور امرا اگر عظمت و اقتدار، عیش و عشرت اور دولت و ثروت کے حریص ہوتے ہیں تو عوام میں کبھی ان کی کمی نہیں ہوتی جو اپنے اپنے انداز میں عظمت و جاہ اور عیش و عشرت کے عاشق ہوتے ہیں۔ فرق یہ ہوتا ہے کہ بادشاہوں اور ارکانِ دولت کے ہاتھ میں تلوار ہوتی ہے۔ وہ اس کے بل بوتے پر اپنی آرزو میں پوری کرتے ہیں یا ان آرزوں کی راہ میں فنا ہو جاتے ہیں۔ وہ عوام جن کے ہاتھ میں

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۹۳ کے بعد ملاحظہ ہو)

کٹہہ ہانگ پور میں گنگا کے کنارے جلال الدین فیروز شاہ کے قتل کا واقعہ گذر چکا ہے کہ علاؤ الدین نے بغل گیر ہوتے ہوئے بغل میں خنجر رسید کر دیا تھا۔ بیشک اس کا سبب ایک وہ بھی تھا جس کی طرف وہاں اشارہ کیا تھا۔ یعنی علاؤ الدین کا شوق سلطنت اور گورنر کے بجائے بادشاہ بننے کا جذبہ۔ مگر مورخین نے اس کا سبب ایک اور ہی بیان کیا ہے۔ وہ یہ کہ علاؤ الدین خلجی نے جنوبی ہند کی فتوحات میں بے شمار دولت حاصل کی تھی۔ سونے اور چاندی کا تو ذکر ہی کیا ہے۔ سچے موتی، زمرد، لعل اور یاقوت منوں کی مقدار میں وصول کئے تھے۔ شاہ اسات من زمرہ۔ دس من موتی وغیرہ۔ اسلامی اصول کے مطابق یہ تمام مال غنیمت یکجا جمع ہوتا پھر اس کا ایک حصہ مجاہدین کو دیا جاتا۔ ایک حصہ فقرا اور سساکین کے لئے مخصوص ہوتا باقی بیت المال یعنی قومی فنڈ میں محفوظ کیا جاتا۔ مگر یہ بادشاہ، اسلامی اصول پر عمل پیرا نہیں تھے۔ اب علاؤ الدین نے کچھ حصہ شاہی خزانہ کے لئے دہلی بھیج دیا۔ باقی سب اپنے پاس رکھ لیا۔ بادشاہ نے امرار کے جانب بھی کوئی توجہ نہیں کی۔ آخر کار جلال الدین کو خیال ہوا کہ وہ خود علاؤ الدین کے پاس جائے تو میرے جانے کا لحاظ کر کے وہ یہ دولت مجھے دیدے گا۔ مگر علاؤ الدین نے بادشاہ کے اس حسن ظن کا یہ جواب دیا۔ کہ جب تک بادشاہ دہلی میں تھا اس کو اس طرح خوش آمدید کہا کہ بادشاہ نے اپنے ساتھ فوج لے جانے کی ضرورت بھی محسوس نہیں کی۔ اور جب بغل گیر ہوا تو اس کا استقبال خنجر آبدار سے کیا جس سے علاؤ الدین رکتے اور امداد نے صرف و دولت کو محفوظ رکھنے کی خاطر اپنے چچا اور خسر اور مربی کا خاتمہ کیا۔ قلندر صاحب غالباً اسی طرف اشارہ کر رہے ہیں۔

تلوار نہیں ہوتی یا سماجی نقطہ نظر سے شمشیر بکف ہونا ان کے لئے نازیبا ہوتا ہے وہ ان آرزوں اور غلط جذبات کی تکمیل کے لئے وہ راستے اختیار کرتے ہیں جن کو مکر و فریب و حیل اور نمائش کہا جاتا ہے۔ یہی پشت جذبات اور غلط آرزوئیں ہوتی ہیں۔ جو ایک ایسے شخص کو بڑا اپنی فطرت کے لحاظ سے ان عوام سے بھی کمتر ہوتا ہے۔ جن کو "کالانعام" کہا جاتا ہے۔ اس کو آمادہ کرتی ہیں کہ وہ اپنے آپ کو صوفی صدیقی، شیخ طریقت اور عالم و فاضل کے روپ میں پیش کرے۔ تاکہ لوگ اس کی تعظیم کریں اور یہ عزت و احترام کی کرسی حاصل کر سکے۔ یہ درحقیقت بدترین اغراض پرست ہوتے ہیں جو اپنی حیثیت و فطرت کے برخلاف رنگ برنگ آئینوں میں جلوہ گر ہوتے ہیں۔ بادشاہوں کی نفس پرستی نے جس طرح معاشرہ اور سماج کو تباہ کیا تھا۔ اور تباہ شدہ سماج میں جس طرح یہ ہوا پرست نمائشی زاہد و صوفی نمودار ہوتے تھے اور اپنی اس نمائش کو حقیقت ظاہر کرنے کے لئے جو جو تھکانڈے وہ استعمال کرتے تھے۔ معلوم ہوتا ہے قلندر صاحب کو ان تمام باتوں کا بارہا تجربہ ہوا تھا۔ اور جن چیزوں سے اکتا کر انھوں نے دنیا کو پس پشت ڈالا تھا۔ اس میں اس عنصر شیف و خبیث کا بھی حصہ کافی تھا۔ اس پس منظر کے مطالعہ کے بعد ثنوی کے اشعار ملاحظہ فرمائیے :-

فرماتے ہیں :-

زہد و تقویٰ نیست اینا کز بہر خلق

صوفی بائشی و پوشی کہنہ۔۔۔

ترجمہ :- زہد اور تقویٰ یہ نہیں ہے کہ مخلوق کی خاطر صوفی بند اور پرانی تہذیبی پہنو۔

شانہ و مسواک و تسبیح و ریا

جبہ و دستار و قدب بے صفا

ترجمہ :- شانہ بھی ہو، مسواک اور نمائشی تسبیح بھی ہو، جبہ و دستار بھی ہو مگر دل اسی طرح گنہ اور آلودہ ہے۔

پیش و پس گرد و مریدِ ناخلف
چوں خرابہ پئے آب و علف

ترجمہ :- آگے چھپے نالائق مریدوں کا ہجوم ہو جس طرح خرابہ گھاس اور پانی کے لئے دوڑتے پھرتے ہیں۔

چوں بہ بینی چند کس بہودہ گرد
خولش را گوئی منم مردانہ مرد

ترجمہ :- جب آگے چھپے چند بہودہ لوگوں کو دیکھو تو سمجھ لو کہ میں ہی مرد مرداں ہوں۔

وام اندازی برائے مرد و زن
خولش را گوئی منم شیخِ زمن

ترجمہ :- عورتوں اور مردوں کے لئے مکر کا جال بچھائے رکھو۔ اور یہ دعویٰ کرتے رہو کہ شیخِ زمن میں ہی ہوں۔

دعظ گوئی خود نیاری و عمل
چشم پوشی ہچو شیطانِ دغل

ترجمہ :- دوسروں کو دغظ اور خود عمل نہیں بعین و مکار شیطان کی طرح آنکھ بند کئے ہیں۔

مکر و تلبیس و ریا کارت بود
ہر نفس شیطان ترا یارت بود

ترجمہ :- مکر و تلبیس، نمود و نمائش تمہارا کام ہو۔ ہر دم شیطان تمہارا یار و مددگار ہے۔

خادماں گویند این شیخِ زمان
چشم پوشیدہ امت از خلق و جہاں

ترجمہ :- خادم یہ شہرت دیں کہ یہ زمانہ بھر کے شیخ طریقت ہیں۔ ساری مخلوق اور سارے جہاں سے
انکھ بند کر رکھی ہے۔

ایں خوشامد گوئے چندیں ابلہاں

رہزنا نند، رہزنا نند، رہزنا نال

ترجمہ :- یہ خوشامدی، بے وقوف، ڈاکو ہیں ڈاکو۔

از ستائش خویشتن را گم کن

غیب خود میں غیب بر مردم کن

ترجمہ :- ان کی تعریف سے اپنے آپ کو گم مت کر اپنے غیبوں پر نظر رکھو دوسروں کے
غیب نہ نکالو۔

خود بدہ انصاف اے اہل غسل

دل پر ست از کرو منصف در بغل

ترجمہ :- اے فریب خوردہ اگر ہو سکے تو خود انصاف کر۔ دل مکر سے بھرا ہوا ہے۔ اور قرآن شریف
بغل میں ہے۔

صوفیم گوئی نداری سینہ صاف

از کرامتہاں خود شنیا ملاف

ترجمہ :- دعویٰ ہے کہ میں صوفی ہوں اور سینہ صاف نہیں۔ شیخ محترم مہربانی فرمائیے۔ اپنی
کرامتوں کے دعوے مت بھاریئے۔

می کنی طاعت تو از بہر ریا

گر نکردی سجدہ از بہر خدا

ترجمہ :- تمہاری ساری عبادت ریا اور نمود کے لئے ہے۔ اگر خدا کے لئے سجدہ کی
توفیق نہیں ہوئی۔

نفس کا فرکشی واری درک میں
بہر شہرت سے نشینی اسے لعین

ترجمہ :- دل کے کہیں گاہ میں وہ نفس ہے جو کافرانہ انداز رکھتا ہے۔ اسے لعین و مردود تیری
گوشہ نشینی بھی اسی غرض سے ہے کہ تارک دنیا مشہور ہو۔

مے کشائی دست از بہر دعا
مزه خواہی از عبادات ریا

ترجمہ :- دعا رکے لئے ہاتھ پھیلاتے ہو اور واقعہ یہ ہے کہ اس نمائشی عبادت کی اجرت
بندوں سے وصول کرنا چاہتے ہو۔

مے کنی از سکر عالم را مطیع
مے وہی تسکین منم فردا شفیع

ترجمہ :- مکر و فریب سے دنیا کو مطیع کرنا چاہتے ہو اور لوگوں کو اطمینان دلاتے ہو کہ فردا
قیامت کو میں سفارش کروں گا۔

از تکبری می کنی ہر سو نظر
خولش را گوئی کہ ہستم باخبر

ترجمہ :- ہر طرف تکبر سے نظر ڈالتے ہو اور اپنے متعلق دعویٰ کرتے ہو کہ میں باخبر ہوں۔

بت پرستی مے کنی ہم بت گری
شد دولت رشک بتان آزی

ترجمہ :- تم بت پرست بھی ہو اور بت گر بھی، بتان آزی کے لئے بھی باعث رشک ہے

آرزو ہائے تو ہرگز کم نشد
قامت حرص و ہوا بت خم نشد

ترجمہ :- تیری آرزوئیں کبھی بھی کم نہیں ہوتیں۔ حرص و ہوا بت خم نہیں ہوا۔

تعجب ہوتا ہے آج ہر ایک نفس پرست اپنی نمائشی بدستی اور آوارہ گردی کے لئے حضرت قلندر صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی پناہ تلاش کرتا ہے۔ اس کا پُرپیگنڈہ یہ ہوتا ہے کہ معاذ اللہ حضرت بوعلی شاہ قلندر بھی اسی کی طرح تھے اور یہ ٹھیک ٹھیک انھیں کے مانند اور انھیں کے نمونہ پر ہے۔ اور اس کے نقش قدم پر چل رہا ہے مگر یہ اشعار جو اوپر ذکر کئے گئے اور اس مضمون کے بہت سے اشعار جن سے ثنوی کے صفحات رنگین ہیں۔ ان کی کھلی ہوئی شہادت ہے۔ کہ حضرت قلندر اس مسخ شدہ قلندری سے بیزار ہیں۔ یہ بیزاری یہاں تک بڑھتی ہے کہ تہذیب کا دامن بھی دست قلندر سے چھوٹ جاتا ہے۔

غور فرمائیے قلندر صاحب کس قدر برا فروختہ ہیں۔ فرماتے ہیں :-

نفس کافر تو بود ہمراہ تو

آتش دوزخ بود حبا نکاہ تو

ترجمہ :- تیرا کافر نفس تیرے ہمراہ رہے تو آتش دوزخ تیرے لئے جانکاہ ہوگی۔

گر تو مردی نفس کافر را بکش

درنداری دستریش بنشیں خمش

ترجمہ :- اگر واقعی مرد ہے تو نفس کافر کو ختم کر۔ اگر اس کی طاقت نہیں ہے تو خاموش

بیٹھو (شمع طریقت اور روحانی بزرگ ہونے کا دعویٰ مرت کر دو)

گرنداری ہمت مردانِ دین

چو زناں رو، و رپس پر وہ نشیں

ترجمہ :- اگر تمہارے اندر مردانِ دین جیسی ہمت نہیں ہے تو جاؤ اور عورتوں کی

طرت پر وہ کے پیچھے بیٹھ جاؤ۔

گر ز دست تو نیاید کار مرد

ہمچو ہیزاں در پس مرداں مگرد

ترجمہ :- اگر تمھارے ہاتھ سے مردوں کے کام نہیں ہو سکتے تو ہیزاں اور زنجوں کی طرح مردوں کے پیچھے نہ گھومو۔

اے مخنث نے تو مردی نے تو زن

مثل شیطان راہ مرداں را فرن

ترجمہ :- او مخنث نہ تو مرد ہے نہ عورت، تو اب شیطان کی طرح لوگوں کی راہ مت ماراں کو گمراہ مت کر

ان اشعار میں بھی اعتدال ہے۔ اب اور ملاحظہ فرمائیے :-

چوں نداری شرم اے پیمال شکن

باز می خواہی مراد خویشتن

ترجمہ :- اد پیمان شکن بد عہد جب تیرے اندر شرم نہیں ہے تو پھر اپنی مراد پوری ہونے کی تمنا بھی نہ رکھو۔

عمر باخامی طمع سر می زنی

بلکہ ازا بلیس ملعون کمتر می

ترجمہ :- تمنا رخام میں اپنی عمر صرف کر رہے ہو بلکہ واقعہ یہ ہے کہ تم ابلیس لعین سے بھی کمتر ہو۔

نفس بد کردار چوں تو سگ پلید

دست ایمانت بدنداں پس گزید

ترجمہ :- تجھ جیسے ناپاک کتے کا نفس بد کردار (معاذ اللہ) تیرے ایمان کے ہاتھوں کو دانتوں سے کاٹ رہا ہے۔

شہوت و خواب خورش داری مدام

از عبادت کاہلی و ناتمام

ترجمہ :- ہمیشہ ہمیشہ شہوت اور خواب و خور میں مصروف رہتے ہو اور جہاں تک عبادت کا تعلق ہے تو سراسر کاہلی اور سستی۔ اور جو کچھ عبادت ہوتی ہے وہ ناقص اور ناتمام۔

جہل خرداری تو اے بیہودہ گرد
انچہ تو کر دی گے شیطان نہ کرو

ترجمہ :- گدھوں جیسی جہالت کا تو مالک ہے۔ ایسے آزارہ گرد جو کچھ تو کر رہا ہے کبھی شیطان نے بھی ایسا نہیں کیا۔

یافت تعلیم از تو شیطان مکر و ریو
از تو آموزند بازی طفل و دیو

ترجمہ :- تجھ سے شیطان نے مکر و رہا کی تعلیم پائی ہے۔ شریر لڑکے اور دیو تجھ سے تعلیم پاتے ہیں
بہر لقمہ اے سگِ مردار خو
مے ردی صحرا بصر کو بکو

ترجمہ :- اے مردار طبیعت کتے تو لقمہ کے لئے دوڑتا ہے۔ صحرا بصر کو چہ بکو چہ۔

خواری گردی ز بہر آب و نان
در پے سگ تاجے باشی و دواں

ترجمہ :- تو روٹی اور پانی کے لئے ذلیل پھرتا ہے۔ آخر کب تک دنیا کے کتوں کے پیچھے دوڑتا رہے گا۔

دین و ایمان کے حق میں اندرونی خطرات

حفاظت کی صورتیں اور لائحہ عمل

چودھویں صدی ہجری کے لیل و نہار اس حالت میں گذر رہے ہیں کہ مسلمان

سخت ابتلا آزمائش میں ہیں۔ اور اسلام بدخواہوں اور مخالفین کے نرغہ میں گھرا ہوا ہے۔ لیکن حضرت قلندر صاحبؒ اور ان کے معاصرین کا دور جس کے کچھ اجمالی حالات پچھلے صفحات میں لکھے گئے ہیں۔ دین و ایمان کے لحاظ سے وہ بھی اسی طرح خطرات کے نرغہ میں تھا۔ اہل ایمان اس وقت بھی ابتلا و آزمائش میں تھے۔

چھٹی صدی ہجری کے تقریباً وسط میں فتنہ تاتار برپا ہو چکا تھا۔ جس میں دارالخلافہ بغداد تباہ کیا گیا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ ۱۶ لاکھ مسلمان تہ تیغ کئے گئے اور جہاں تک اسلامی تہذیب سے عداوت کا تعلق ہے تو مساجد اور مدارس سے گذر کر لائبریریوں اور کتب خانوں تک کو برباد کیا گیا۔ علوم و فنون کی کتابیں دریائے دجلہ میں بہا دی گئیں۔ یہاں تک کہ عرصہ تک دریائے دجلہ کا پانی سیاہ ہوتا رہا۔

بے شک۔ یہ اسلام کا اعجاز تھا کہ تھوڑے ہی دنوں بعد اس نے دشمنوں کو ویران بنا لیا اور جو اسلام کو مٹانے آئے تھے وہ خود اسلام کے لئے سنے لگے۔ مگر جہاں تک سیاست کا تعلق ہے اس میں کوئی خاص تبدیلی نہیں ہوئی یعنی وہی ملوکیت جو ٹٹنے والوں کے رگ و پے میں سرایت کر چکی تھی۔ اس کا سرطان ان نو مسلم فرمانرواؤں کے رگ و ریشہ کو بھی اسی طرح مسموم بنائے ہوئے تھا۔ تاج و تخت کے لئے برادر کشی، نسل کشی اور قتل و خون کی گرم بازاری اب بھی اسی طرح قائم رہی اور یہ اثر دہا اب بھی اسی طرح خاندان شاہ کے جگر پاروں کو دستار رہا۔ وہ اولوالعزم صاحب حوصلہ علماء اور مشائخ جنہوں نے اپنے اخلاقی اور روحانی کمالات سے سرکش کافروں کو یہاں تک مسخر کیا تھا کہ وہ فاتح اسلام ہونے کے بجائے مفتوح اسلام بن گئے تھے۔ انہوں نے سیاست

کی اس دہکتی ہوئی بھٹی کے قریب جانا پسند نہیں کیا۔ کیونکہ اس دور میں سیاست اور ملوکیت کچھ اس طرح جکڑ بند تھیں کہ ممکن نہیں تھا کہ سیاست کے بحر محیط میں غرق ہونے کے بعد کسی شخص کا دامن ملوکیت کی آلائش سے پاک رہ سکے۔ ان حامیان ملت اور ہمدردان دین کے لئے سب سے زیادہ قلق اور صدمہ کی بات یہ تھی کہ ملوکیت کے یہ وحشیانہ مظاہرے جو بسا اوقات اسلام کے نام پر ورنہ کم از کم ان کی طرف سے ہوتے تھے جن کی زبان پر حمایت اسلام کے دعوے اور جن کے خطابات میں اس مفہوم کے الفاظ شامل ہوتے تھے وہ کسی غیر مسلم کو اسلام کی طرف مائل تو کیا کرتے اسلام سے متنفر بناتے رہتے تھے۔ اسلام مذہب رحمت ہے وہ جبر و اکراہ برداشت نہیں کرتا۔ اس کی نظر میں زبانی اقرار کی کوئی اہمیت نہیں، جب تک ضمیر کی آواز اس کی تائید نہ کرے اور تسلیم و رضا اس کی لاشیت پر نہ ہو۔ وہ صرف یہی اعلان نہیں کرتا کہ دین اور دھرم کے بارے میں کسی زور زبردستی اور جبر و اکراہ کی قطعاً گنجائش نہیں (لا اکراہ فی الدین) بلکہ اس کو مطالبہ یہ ہے کہ جو لوگ دھرم اور دین کے بارے میں جبر و اکراہ کو کام میں لائیں ان سے جنگ کرو یہاں تک کہ یہ فتنہ ختم ہو۔ اور لوگوں کے دلوں کو یہ آزادی نصیب ہو کہ وہ دین کو کسی غلبہ تسلط یا کسی اقتدار کی وجہ سے نہیں بلکہ اپنی آزادانہ مرضی کے ساتھ خالص اللہ کے لئے اختیار کر سکیں۔

وقاتلوهم حتى لا تكون فتنة ويكون الایمان کاملًا

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

(ترجمہ :- ان سے جنگ کرتے رہو یہاں تک کہ نہ رہے فساد اور ہو جائے پورا دین اللہ کیلئے) پس اس دور میں اگرچہ ایشیا اور افریقہ کے بڑے حصہ میں سیاسی اقتدار مسلمانوں کو حاصل رہا۔ مگر واقعہ یہ ہے کہ ایمان و اسلام اب بھی نرغہ ہی میں تھا

اور مومنین با اخلاص کے لئے یہ دور بھی ابتلا و آزمائش کا دور تھا۔ ہاں یہ فرق ضرور ہے کہ آج یعنی چودھویں صدی ہجری میں ابتلا و آزمائش کے بیشتر اسباب خارجی ہیں اور اس دور میں یہ ابتلا و آزمائش زیادہ تر ان کی وجہ سے تھا جو خود بھی حامیان اسلام اور ظل اللہ کہلاتے تھے۔

قرآن حکیم میں رب العالمین نے بڑی نختگی سے فرمایا ہے:-

نشانِ راہ "والذین جاهدوا غیتا لنھدیتھم سبیلنا"

(جو لوگ ہماری راہ میں مجاہدے کرتے ہیں ہم ان کو اپنے راستوں کی ہدایت

کرتے رہتے ہیں)

چنانچہ مجاہدہ حق کے دلولہ صادق نے علماء ربانی اور مشائخ حق پرست کی رہنمائی کی۔ اور انھوں نے وہ راستہ اختیار کیا جس کے نتیجہ میں اسلام کی کشتی ڈوبنے کے بجائے ساحلِ مراد تک پہنچتی رہی اور کامیاب ہوتی رہی۔

تبلیغ و اشاعت کا لا عمل

مسلك عشق و محبت کا پرچار۔ استقامت کے ساتھ واداری
اسلام، اپنی انسانیت نوازی اور رحم پروری کے باعث اس کی گنجائش
رکھتا ہے کہ اس کو عشق و محبت کا مذہب قرار دیا جاسکے۔ ان مجاہدین فی سبیل اللہ
اور کشتگانِ خنجر تسلیم نے اس گنجائش سے فائدہ اٹھایا اور عشق و محبت کو اپنا
مذہب بنا دیا۔

ان کے فکر و عمل کی بنیاد دو باتوں پر تھی۔ اول یہ آیت کریمہ -

الذین آمنوا اشد حبا لله

اہل ایمان اللہ کی محبت (عشق سولی) میں سب سے بڑھے ہوئے ہیں

دوم - یہ حدیث مقدس :-

المخلوق عيال الله

(مخلوق خدا اللہ کا کنبہ ہے)

لائحہ عمل | اللہ تعالیٰ سے عشق و محبت کا تقاضا یہ ہے کہ اس کی رضا جوئی اور اطاعت و فرماں برداری کے لئے وہی راستہ اختیار کیا جائے جس کو اس نے "صراط مستقیم" قرار دیا ہے۔ اور جس کو تمام مہجبان خدا کا راستہ بتایا ہے۔ لیکن یہ صراط مستقیم تنگ و تاریک نہیں ہے۔ وہ کھلے ہوئے مہدالوں سے گذرتا ہے۔ اس کی فضا پر کیف اور خوشگوار ہے۔ وہ "زندہ رہو اور زندہ رہنے دو" کی لائنوں پر بہو اور کیا گیا ہے۔ اس کے بانی نے اعلان کر دیا ہے۔

لکل وجهة هو موليها (سورہ بقرہ ۱۲۸)

ہر ایک کے لئے ایک طرف ایک رخ ہے کہ وہ منحنی کرتا ہے اس طرف تمہارا

کام یہ ہے کہ نیک کاموں میں سبقت کرو۔ اور آگے بڑھو

لکل جعلنا منكم شرعة ومنهاجا۔ (سورہ مائدہ ۴۸)

ہر ایک کے لئے مقرر کر دیا ہے۔ ہم نے ایک دستور اور مقرر کر دی ہے ایک راہ

لکل امة جعلنا منسكاً هدها سكة (سورہ حج ۱۷)

ہر ایک فرقہ کی ٹھہرا دی ہم نے ایک راہ بندگی کی۔ کہ وہ اسی طرح کرتے ہیں بندگی

بہر حال یہ تین بنیادیں تھیں جن پر ان بندگان حق پرست کے فکر و عمل کی

تعمیر ہوئی تھی یعنی (۱) اللہ سے محبت۔ اور عشق مولیٰ (۲) بندگان خدا سے محبت

اور خلق خدا کی ہمدردی (۳) رواداری اور دوسری ملتوں کے لئے فراخی جوصلہ۔

اس کی مثال حضرت سلطان الاولیاء محبوب ربانی نظام الدین (بدایونی ثم

الدہلوی) کا وہ مشہور واقعہ ہے کہ آپ نے ایک برہمن کو دیکھا کہ وہ بھی اس کی پوجا

کر رہا ہے جس کی محبت میں سلطان الاولیاء کا دل پُرسوز ہے۔ تو غیض و غضب یا اشتعال کے بجائے آپ کی زبان مبارک پر جبتہ یہ مصرع موزوں ہو گیا۔

ہر قوم راست راہ ہے
دینے و قبلہ گاہ ہے

دہر قوم کے لئے ایک راہ ہے، ایک دین ہے اور ایک قبلہ گاہ ہے۔

قرآن حکیم کی آیت و لکل جعلنا منکم شرعۃ و منها جاہ کی تفسیر اس سے بہتر اور کیا ہو سکتی ہے۔

بیشک عشق و محبت اور رواداری کے نام پر غلطیاں بھی ہوئیں۔ کسی نے عشق و محبت کے بہانے بے قیدی اور آوارگی کو قلندری قرار دے لیا۔ کسی نے رقص و سرود کا نام چشتیت رکھ لیا۔ کبھی رواداری کو دامنیت کی حد تک پہنچا دیا گیا۔ اور ایسا بھی ہوا کہ عشق و محبت کے دائرہ کو (معاذ اللہ) نفس پرستی کی سرحد سے بلا دیا گیا۔ مگر جس حقیقت کا اذکار ممکن نہیں ہے وہ یہ ہے کہ وہ پیغام جو حضرت خاتم المرسلین، محبوب رب العالمین، رحمۃ اللعالمین علی اللہ علیہ وسلم کی بعثت مبارکہ کا مقصد بنتھا۔ اس دور میں انھیں محبت کے متوالوں کے ذریعہ بندگانِ خدا تک پہنچا۔ اور وہ یقیناً ان لاکھوں مجروح دلوں کے لئے مرہم شفا بنا جو ملوکانہ اقتدار کی جبر و تیرت و قہاریت سے مجروح تھے۔

۱۹۴۷ء کی مثال ہمارے سامنے ہے وہ لاکھوں مسلمان جو تقسیم ہند اور تبادولہ آبادی کے قیامت خیز ہنگاموں کا تختہ مشق بنے تھے وہ گاندھی جی کے فدائی اور جانشین بن گئے کیونکہ گاندھی جی نے اپنی ہمدردیوں اور پیچھے بولنے سے ان کے زخمی دلوں پر اطمینان کا مرہم رکھا تھا۔

یہ جو آپ دیکھتے ہیں کہ فرید الدین عطار (متوفی ۶۲۷ھ) شمس تبریز (۶۲۵ھ) سے

مولانا روم (م ۶۶۲ھ) امیر خسرو (م ۶۲۵ھ) خواجہ اجمیری (م ۶۳۳ھ) خواجہ
 قطب الدین بختیار کاکی (م ۶۶۱ھ) فرید الدین گنج شکر (م ۶۶۲ھ) مولانا
 حمید الدین صوفی (م ۶۶۳ھ) حسام الدین بدایونی (م ۶۸۶ھ) علاؤ الدین
 صابر کلیری (م ۶۹۰ھ) نظام الملک والدین بدایونی ثم الدیلوی (م ۶۲۵ھ)
 جیسے بزرگ جتنے بھی ہیں۔ وہ مے کدہ عشق و محبت کے ساتی بنے ہوئے ہیں۔
 تو یقین جائے "یہ بے خودی بے سبب نہیں غالب" یعنی محض جذبات اور
 بے مغز ہاؤ ہو نہیں ہے۔ بلکہ ایک مقصد ہے اور ایک پروگرام ہے جس پر نہایت
 پختگی اور ہوشمندی سے عمل ہو رہا ہے۔ "دیوانہ بکار خوشین ہوشیار"

حضرت قلندر صاحب اور مسلک عشق

یہ تو حدیث دیگران تھیں۔ اب خود قلندر صاحب کی سینے سے کس طرح عشق
 کو جو ہر حیات اور دین و دنیا کی متاع بے بہا قرار دیتے ہیں۔ اور کس طرح ان
 کی تمنا ہے کہ سوز عشق دم بدم بڑھتا رہے اور پروانہ کی طرح تن تن نظر سوز
 ہوتا رہے۔

ارشاد ہے:-

بہر دمے کز عشق جانے یافتہ	جز دل کے عشق سے زندگی حاصل کر لی۔
تا اید روح رواںے یافتہ	اس نے ابتدا تک روح رواں حاصل کر لی۔
بر دل ہر کس کہ نور عشق تافتہ	جس شخص کے دل پر عشق کا نور درخشاں ہوتا ہے
خولیش را با جان جانان زندہ یافتہ	وہ اپنے آپ کو جان جانان (حشویں حقیقی) کیسے زندہ پاتا ہے
دل کہ برد لبر رسد از ساز عشق	دل تو وہی ہے جو عشق کی ساز سے وابستہ پہنچ جائے
جان کہ بر جانان دہد آواز عشق	جان وہی ہے جو جانان کو عشق کا پیغام دے

دل ربا معشوق، تمہارے اندر دلبر کا عشق پیدا کرتا ہے
 وہ عشق جو جامہ ہستی کو چاک کر ڈالتا ہے۔
 عشق۔ وہ عشق جو بال و پیر کے بغیر ہواز کرتا ہے۔
 وہ عشق جو لامکان میں جولانی کرتا ہے۔
 ہاں عشق کی ضرورت ہے تاکہ تمہیں بادشاہت کا تلخ میسر آجائے
 ہاں وہ عشق جو حضرت سلیمانؑ کی وسیع ترین مملکت بخش دیتا ہے
 وہ عشق درکار ہے جو دل کی آنکھ کو بینا بنا دے۔
 ہاں عشق کی ضرورت ہے تاکہ سینہ سودا سے لبریز ہو جائے
 ہاں وہ عشق چاہیے جسکے آتے ہی عقل زائل ہو جاتی ہو
 ہاں عشق کی ضرورت ہے تاکہ عقل اور سمجھ میسر آجائے۔
 عشق ایک لازوال دولت ہے کیونکہ وہ حسن لازوال کا پرتو ہے جب تک
 اصل باقی ہے یہ پرتو بھی باقی ہے۔

تمہیں کچھ خبر ہے۔ عشق کی اصل بنیاد کیا ہے
 عشق کی اصل بنیاد حسنِ جانان ہے اسی سوا کسی زندگی ہے
 حسنِ جانان نے جب خود اپنے اوپر نظر کی۔

تو وہ خود شیدا اور مفتون ہو گیا۔ اور عشق کا عنوان سامنے کر دیا
 بس جبکہ عشق خود حسن اور حسن خود عشق ہی تو جو عشق کے شہید ہیں
 ہر زمان اور ایک نئی خوبی ہر وقت میسر آتی رہتی ہے
 لہذا فراست و بصیرت کی بات یہ ہے کہ :-

اے دل۔ اگر طاقت اور امکان ہے تو عشق کیلئے کوشش کرتا
 اور عاشق کی طرف یہ بات کان میں ڈالے رکھو۔ کہ

بیچ می دانی کہ اصل عشق چہیست
 عشق را از حسنِ جانان زندگی ست
 حسنِ جانان چون نظر در خویش کرد
 گذشت شیدا عشق را در پیش کرد
 کشندگانِ عشق را احسانِ دگر
 ہر زمان از غیب احسانِ دگر
 لہذا فراست و بصیرت کی بات یہ ہے کہ :-
 ارتوانی اے دلاور عشق کوشش
 این حکایت را ز عاشق وار گوش

دعا ہے اصحاب عشق اپنی عقل ہی کو عقل سمجھتے ہیں اور رباب ظاہر کی عقل کو نادانی قرار دیتے ہیں

اے خنک جانے کہ خود را باختہ
 سوختہ خود را و با حق ساختہ
 ہمت پروانہ میں اے بے خبر
 سوز چوں پروانہ تاییابی خبر
 در محبت تالسنوزی بال و پر
 کے شوی ہم رنگ آتش سر بسر
 دہ جان کس تدر اچھی اور مبارک ہے جس نے خود اپنی بازئی لگا دی
 اپنے آپ کو مبتلا سوز کیا اور حق کے ساتھ ساز کر لیا۔
 پروانہ کے جو عملہ کو دیکھ۔ اے نادان
 بس تم بھی پروانہ کی طرح بھسم ہو جاؤ تب تم کو محبوب کا پتہ لگیگا
 جی تک محبت میں اپنے بال پر نہ جلا ڈالو گے۔
 سوتے پاؤں تک آگ کے ہم رنگ کس طرح ہو سکتے ہو۔
 شنوی کا تقریباً ایک تہائی حصہ اسی قسم کے اشعار سے رنگین ہے۔ اس کے
 علاوہ اسی مضمون کی بہت سی غزلیں آپ کے دیوان میں ہیں۔ جو حضرت قلندر صاحب
 کے مسلک عشق کی ترجمانی کر رہی ہیں۔ مسلک عشق کا عکس خلق خدا پر لطف و رحم اور
 ہمدردی و غمخواری کی صورت میں نمودار ہوتا تھا۔ یہی قلندری کا جوہر ہوتا تھا۔ اور
 تبلیغ و اشاعت کے سلسلہ میں یہ حضرات اسی جوہر سے کام لیتے تھے۔

ایک سوال۔ اور۔ جواب

مسلک عشق کی دعوت دیتے ہوئے قلندر صاحب نے عشق کی جو خوبیاں
 بیان کی ہیں۔ ان کا پچوڑ یہ دو شعر ہیں۔

ہمت پروانہ میں اے بے خبر
 سوز چوں پروانہ تاییابی خبر
 در محبت تالسنوزی بال و پر
 کے شوی ہم رنگ آتش سر بسر

ترجمہ:- اے بے خبر پروانہ کی ہمت دیکھ، اگر تم باخبر ہونا چاہتے ہو تو پروانہ کی
 طرح بل جاؤ۔ محبت میں جب تک اپنے بال اور پر نہیں جلا لو گے۔ تو

پوری طرح آگ کے ہم رنگ کب ہو سکو گے۔

ہم رنگی کیا ہے؟ | یہ شعر جس طرح وجد آفریں اور کیف آور ہیں وہ ایک سوال کی تلقین بھی کرتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ ایک

پاک باطن جو اللہ تعالیٰ سے عشق و محبت کا دعویٰ کرتا ہے۔ وہ اگر اسی سوز و گداز میں پروانہ کی طرح بال و پر جلا کر ہم رنگ محبوب ہو جائے تو وہ ہم رنگی کیا ہوگی۔ آیا اللہ تعالیٰ کی طرح معبود و مسجود ہو جائے گا۔ اور جس طرح اللہ تعالیٰ احکام شریعت سے بلند و بالاتر ہے۔ نماز و روزہ وغیرہ کے احکام اس پر نافذ نہیں ہوتے یہ بھی شرعی تکلیفات سے آزاد ہو جائے گا۔ اور معاذ اللہ "انا الحق" جیسا دعویٰ اس کے لئے درست ہوگا۔؟

اس میں شک نہیں کہ ہذا پرستوں اور ملحدوں نے ہم رنگی کے یہی معنی لئے ہیں۔ اور اسی کو وہ شانِ قلندری سمجھتے ہیں۔ چنانچہ خود حضرت قلندر صاحب کے ان سوانح نگاروں نے جو مفہومات اور خرافات کو سوانح قرار دیتے ہیں۔ ان میں یہ قابلیت تو نہیں ہے کہ فلسفی اور منطقی طور پر کوئی بات سمجھ سکیں یا سمجھا سکیں۔ مگر جو بے سرو پا، لغو باتیں وہ نقل کرتے ہیں۔ غور کیا جائے تو ان کی بنیاد یہی تصور باطل ہوتا ہے۔

چنانچہ حکمت نامہ یا حکمنانہ جو قلندر صاحب کی طرف منسوب ہے جس کو حضرت مولانا عبدالحق صاحب محدث دہلوی نے "از اختراعات عوام" قرار دیا ہے اس میں تحریر ہے کہ:-

"محرم الحرام کی بیسٹھنٹھی کو موذنوں نے صبح کی اذان دی۔ نماز کی نیاری ہونے

لگی۔ مولانا سراج الدین صاحب رکوعی نے اس فقیر سے (قلندر صاحب سے)

کہا۔ سنتوں کا وقت ہے، میں نے ان سے کہا کہ ہاں تکبیر پڑھو ایسے تاکہ

فرض ادا کر لوں۔ جب فرض پڑھ چکے تو جتنے ورد لیش اور علماء وہاں موجود تھے وہ سب اس ورد لیش کے پاس آئے۔ اور عرض کیا۔

حضرت مخدوم! ایک بات نہایت ادب سے عرض کرتی ہے۔ جناب نے نماز صبح کی سنتیں کیوں نہیں پڑھیں؟

اس ورد لیش (قلندر صاحب) نے جواب دیا۔

”فرمان خواجہ کائنات سرور موجودات، رحمت عالمیان و صفوت آدمیان
دوئمہ دور زمان احمد مجتبیٰ محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم برائے ورد لیش ہم چہیں
سنت کہ اے شرف سنت خود بتو بخشیدم۔“

یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی اس احقر کے لئے یہی ہے
کہ اے شرف اپنی سنت میں نے تم کو بخش دیں۔

اس کے بعد چالیس سال تک صرف فرض پڑھتا رہا کہ حضرت ذوالجلال
کا فرمان اس ورد لیش کی پہنچا کہ۔

”اے ورد لیش تو ازاں مائی دمن ازاں تو۔ فریضہ خود بتو بخشیدم۔“

”یعنی اے ورد لیش جبکہ تو میں ہے اور میں تو ہوں۔ لہذا میں نے اپنا فرض
تجھ کو بخشید یا۔“

میں نے جیسے ہی یہ فرمان خداوندی سنا سر زمین پر رکھا اور اللہ تعالیٰ
کا شکر ادا کیا۔ پھر تمام ورد لیش اور علماء جیسے ”میر سید علی مفتی“ اور ان جیسے
علماء رحمہم اللہ۔ ان حضرات نے اعتراضات کیے۔ جس نے جوابات دیئے۔

اس کے بعد حکمنانہ میں ہے کہ قلندر صاحب نے یہ بھی فرمایا۔ کہ ”میر اور جبہ
علم و فضل میں اتنا بلند تھا کہ کسی کو میرے سامنے دم مارنے کی ہمت نہیں
ہوتی تھی۔“

(حکمنانہ)

نماز کی معافی کوئی معمولی بات نہیں جس کو شرف المناقب نظر انداز کر دیتے
لہذا آپ نے بھی اس منقبت کو ذکر فرمایا ہے۔ مگر اس کی نوعیت دوسری ہے۔
مولانا ضیاء الدین سیاحی عرف علی مفتی یا میر سید علی مفتی " کا واقعہ مونچھوں کے تراشنے
کے بارے میں پہلے گزر چکا ہے ماسی افسانہ کا ایک ٹکڑا یہ بھی ہے کہ مفتی نے آنحضرت
(قلندر صاحب) کو نماز کی ہدایت اور تاکید کی "

حضرت قلندر صاحب نے فرمایا: " نماز بارگاہِ الہی سے معاف ہو چکی ہے "۔
مفتی نے کہا: " پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم سے نماز معاف نہیں ہوئی۔ تم سے
کس طرح معاف ہوگی۔؟

قلندر صاحب: " میں خود اپنے اختیار میں نہیں ہوں۔ مسرت اُلسرت ہوں
دکھاوے کی نماز میں نہیں جانتا۔ نماز دوسرے کا حق ہے۔
مفتی نے کہا: " اس معاملہ میں حیلہ نہیں چل سکتا۔

مفتی صاحب کا یہ جواب سن کر حضرت قلندر صاحب کو جوش آگیا۔ فرمایا مفتی
صاحب اٹھئے کمر بند سنبھالئے اور فقیر کے اس کمر بند سے کمر مضبوط باندھ
دیجئے۔ اگر کمر بندھی رہے تو مجھ پر فرمانِ شریعت نافذ کیجئے۔ اور بندھی نہ
رہے تو مجھے معاف قرار دیجئے۔

مفتی صاحب اٹھے اٹھوں نے کمر بند کسنا چاہا۔ مگر جب بھی وہ کمر بند
کسنا چاہتے تھے۔ کمر بند مفتی صاحب کے ہاتھ میں رہ جاتا تھا۔ اور قلندر
صاحب اسی طرح " آزاد از کمر بند ایتادہ ماند " (کمر بند سے آزاد کمرے
رہتے تھے) آخر کار مفتی صاحب شرمندہ ہوئے۔ پھر بہت کچھ رو و بدل کے
بعد حضرت قلندر صاحب " شانِ جمالی " میں آئے تو آپ نے فرمایا: " مفتی
ضیاء الدین صاحب میں عاشق ہوں۔ اور اپنے عشق میں مبتلا ہوں۔ آپ

اٹھنے فرض ادا کیجئے میں بھی فرضوں میں شامل ہو جاؤں گا۔ چنانچہ تکبیر پڑھی گئی مفتی صاحب امام بنے۔ نماز پڑھنی شروع کی۔ جب حضرت مفتی صاحب نے قرات پڑھنی شروع کی تو قلندر صاحب بھی نماز میں شامل ہو گئے۔ مگر فوراً استغراقی کیفیت طاری ہو گئی۔ امام صاحب نے رکوع سجدہ وغیرہ سب کچھ کیا۔ تمام رکعتیں پڑھ کر سلام پھیرا۔ مگر قلندر صاحب اسی طرح سر جھکائے کھڑے رہے۔ جب مفتی صاحب نماز سے فارغ ہوئے دیکھا کہ قلندر صاحب اسی طرح سر جھکائے کھڑے ہیں۔

مفتی صاحب نے عرض کیا: "حضرت کیسے کھڑے ہیں؟" قلندر صاحب نے سر اٹھایا اور فرمایا۔ میاں مفتی ضیاء الدین۔

انکن کہاتی کرؤ دھادے

یہ نماز شرفا نہیں بھاوے

حاضرین نے قلندر صاحب سے عرض کیا۔ کہ حضرت کا ارشاد سمجھ میں نہیں آیا۔ قلندر صاحب نے فرمایا۔

"لا صلوة الا بحضور القلب" (جب تک دل حاضر نہ ہو نماز نہیں ہوتی)

حاضرین نے عرض کیا کہ بات اب بھی سمجھ میں نہیں آئی۔ کچھ وضاحت فرمائیے۔

حضرت قلندر صاحب:۔ بات یہ ہے کہ مفتی صاحب کے یہاں گھوڑی کے بچہ ہوا

ہے۔ مفتی صاحب کے مکان میں ایک کھاتی بھی ہے (جہاں جاہ گندم جن میں

گندم حفاظت کے لئے بھرویئے جاتے ہیں) مفتی صاحب نماز پڑھا رہے تھے

اور ان کا دل ان کے مکان پر تھا کہ بچہ (گھوڑی کا بچہ) کھاتی میں نہ گر جائے۔

پھر قلندر صاحب نے فرمایا:۔

"عاشقم گاہے در جوش و خروش و گاہے بندہ شوم جز عشق بیچہ ندامم۔"

دیں عاشق ہوں۔ کبھی جوشِ زخروش میں رہتا ہوں اور کبھی بندہ نیازمند
بن جاتا ہوں۔ عشق کے سوا میں کچھ نہیں جانتا،
اے عاشقِ الہی یعنی قلندر صاحب کی یہ حالت دیکھ کر مفتی صاحب
شرمندہ ہوئے۔

بہر حال صاحبِ شرف المناقب کی نظر اس گہرائی تک نہیں پہنچی۔ آپ نے
صرف ایک قصہ نقل کر دیا۔ البتہ مکالمہ کی عبارت میں اس نظر پر کو پیش کر دیا ہے۔
جو بے دین مصنوعی قلندروں کا نظریہ بن جاتا ہے یعنی یہ دعویٰ کہ ہمارا تعلق اللہ تعالیٰ
سے یہ ہے کہ "من تو شدم تو من شدی"!

معاذ اللہ جب تصور یا دعویٰ یہ ہو کہ "اللہ بندہ بن گیا اور بندہ اللہ" تو عبادت
کس کی اور سجدہ کس کو۔ (معاذ اللہ)

صاحبِ مکالمہ نے ہم رنگی کا مظاہرہ ہی لیا۔ مگر ان کی فہم مصنوعی قلندروں
نے یہ نہیں خیال کیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو سنتیں معاف کرنے کا حق کہاں
سے ملا۔ کیا سنتوں کے وقت معبود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو مانا جاتا ہے۔ کیا
کسی بھی نمازی کے ذہن میں یہ بات ہوتی ہے کہ فرض نماز کا سجدہ تو اللہ کو کیا جاتا
ہے اور سنتوں کا سجدہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے ہوتا ہے۔

اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھی معبود و مسجود ہوں اور سنتوں کا رکیع سجدہ
محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کیا جاتا ہوتا تو یہ ہو سکتا ہے کہ معبود نے اپنا
حق معاف کر دیا۔

لیکن جب مسجود و معبود ہر نماز میں اللہ ہی ہے اور سنت اور فرض کا فرق
صرف یہ ہے کہ فرض کی فرضیت دلیل قطعی سے ثابت ہے۔ اس پر عمل کرنا فرض، ترک
کرنا گناہ کبیرہ اور اس سے انکار کرنا کفر ہے اور سنتوں کا ثبوت اس درجہ قطعی نہیں

ہوتا۔ اسی بنا پر ان کے ایک دوسرے ترک سے گناہ کبیرہ نہیں ہوتا۔
 اگر کوئی انکار کر بیٹھے تو اس پر کفر کا فتویٰ بھی نافذ نہیں کیا جاتا۔ بالفاظ دیگر
 فرق یہ ہے کہ فرض کی اہمیت زیادہ ہے۔ اس کا انکار کر دینا کفر ہے یہ اہمیت
 سنتوں کو حاصل نہیں ہے۔ اصل نماز یا اصل روزہ وہ ہے جو فرض ہے۔ اور
 مسنون نماز یا مسنون مستحب روزہ اس کے لئے تکملہ اور تمہ ہیں۔ باقی معبود
 دونوں میں ایک ہی ہے یعنی اللہ تعالیٰ۔ تو پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی
 کیا مجال کہ وہ سنتیں کسی کو بخش دیں۔

باقی عام طور پر نیت کے وقت جو کہا جاتا ہے "سنت رسول اللہ کی"۔ تو
 اول تو یہ بھی عوام کی بات ہے۔ محقق علماء زبان سے نیت کرتے کو کوئی حیثیت
 ہی نہیں دیتے۔ کیونکہ نیت دل کے ارادہ کو کہتے ہیں۔ لہذا نیت کے وقت دل کا
 حاضر ہونا اور توجہ کا جم جانا ضروری ہے۔ زبان سے ادا کرنا ضروری بھی نہیں۔ اگر
 زبان سے الفاظ ادا کر دیئے اور دل اور بالوں میں مشغول رہا۔ اس کو نماز کا
 خیال کسی نہیں آیا تو نہ وہ نیت و نیت ہوگی۔ اور نہ وہ نماز قابل التفات ہوگی۔
 علاوہ ازیں مطلب یہ ہوتا ہے کہ جس اہمیت کے ساتھ من جانب اللہ
 فرضوں کا حکم ہے وہ اہمیت اس کو حاصل نہیں جو سنت ہے۔ یہ صرف آنحضرت
 صلی اللہ علیہ وسلم کا قائم کیا ہوا طریقہ ہے جس کو آپ نے اس لئے کیا تاکہ فرضوں
 کے رونے زیبا میں چمک دک زیادہ ہو جائے۔ اور اگر کچھ خافی تھی تو اس کے
 تلافی ہو جائے۔

بہر حال یہ تکرار کہ سنت نماز کے معبود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
 ہوتے ہیں۔ یہ تو ایک عامی کا لہجہ ہے جو نہیں ہو سکتا۔ چہ جائیکہ شرف الین
 بوعلی شاہ جیسا عالم و فاضل جس کے سامنے زمانہ کے علماء اور فضلاء کو دم مارنے

کی تہمت و جرات نہ ہوتی تھی۔ ایسا غلط خیال قائم کرے اور اس کو ضبط تحریر میں لائے۔

پھر یہ بھی قابل لحاظ ہے کہ اولیاء اللہ کے کشف کی حیثیت یہ ہرگز نہیں کہ وہ اس فرض کو ساقط کر دے۔ جس کو اللہ تعالیٰ کی وحی نے لازم کیا ہے۔ یہ تو اصولی بحث ہے جس کا یہ موقع نہیں۔ یہاں تو قابل توجہ یہ ہے کہ اگر ان واقعات کو کچھ بھی اہمیت دی جاتی ہے تو خود ان میں تضاد موجود ہے۔

سوانح نگاروں کے بیان میں تعارض اور تضاد | ایک طرف یہ عذر کہ میں

”مست الست ہو میں اپنے اختیار میں نہیں۔ پھر یہ دعویٰ کہ خدا نے فرض معاف کئے تو میں نے سجدہ شکر ادا کیا۔۔۔۔۔ اگر یہ صحیح ہے کہ معافی باضابطہ ہوئی ہے تو مستی کے عذر کے کیا معنی؟“

ہاں اس سلسلہ میں اگر کوئی بات صحیح ہے تو وہ صرف وہ واقعہ جس کو صاحب ”شرف المناقب“ نے خاتمہ کتاب کے قریب بیان کیا ہے۔ اور تعجب ہے مصنف کو یہ احساس نہیں ہوا کہ یہ واقعہ ”میر سیدی علی مفتی“ کے واقعہ کی تردید کرتا ہے۔ مصنف شرف المناقب تحریر فرماتے ہیں:-

نقل ہے کہ عاشق الہی (حضرت قلندر صاحب) شمس الدین ایک باؤشاہ دہلی کے عہد میں (زمانہ حکومت میں) سیر کرتے ہوئے اپنے والدین کی زیارت کے لئے پانی پت تشریف لے آئے والدین کی زیارت سے مشرف ہونے کے بعد کچھ دنوں مشغول بخدا رہے اور ایسے مستغرق ہو گئے کہ ایک لمحہ کے لئے بھی افاقہ نہیں ہوتا تھا (ہوش میں نہیں آتے تھے) پانی پت کے بہت سے لوگ جو قلندر صاحب کی اس استغراقی کیفیت سے واقف نہیں تھے۔ آپ کے پاس

آکر سوالات کرتے تھے کہ آپ نماز کیوں نہیں پڑھتے۔ قلندر صاحب جواب دیتے تھے کہ ہم اپنے اختیار میں نہیں ہیں۔ بالآخر ان ظاہر بینیوں نے ایک محضر نامہ تیار کیا کہ یہ شخص خلافت شرع ہے، نماز بھی نہیں پڑھتا، اس کو سزا ملنی چاہیے کہ دوسرے اس طرح کی حرکت نہ کریں اور شرع شریف کے خلافت قدم نہ رکھیں۔ القصہ اس محضر نامہ پر اس زمانہ کے قاضی اور مفتی وغیرہ اور جملہ اکابر و مشاہیر کے دستخط اور مہر میں ہو گئیں۔ آخر میں کسی وجہ سے یہ محضر نامہ خواجہ نصیر الدین اور خواجہ مسعود کے سامنے آیا۔ یہ دونوں بھائی بھائی تھے۔ ان کے والد ماجد کا اسم گرامی خواجہ ملک علی انصاری تھا۔ ابن خواجہ ترک علی بن مسعود ثانی بن شیخ خواجہ عمر بن خواجہ ابراہیم بن شیخ عثمان بن ابوطاہر بن احنف بن نافع بن نافع بن محمود شاہ بن مسعود بن شیخ عبداللہ انصاری۔

یہ دونوں (خواجہ نصیر الدین اور خواجہ مسعود) ابھی طالب علم تھے قصبہ بابل سے آکر پانی پت کی ایک مسجد میں مقیم تھے۔ انھوں نے محضر نامہ دیکھا تو اس کو چاک کر ڈالا۔

ظاہر سے محضر نامہ مرتب کرنے والے اس حرکت سے بہت مشتعل ہوئے انھوں نے ان دونوں کے برخلاف "قاضی" کے یہاں دعویٰ دائر کر دیا۔ قاضی صاحب کے یہاں یہ دونوں بھائی پیش ہوئے۔ تو قاضی صاحب نے اس حرکت کا سبب دریافت کیا۔ ان دونوں نے کہا۔

"ایں دردیش قلندر بوعلی مست و مجذوب سمت۔ احکام شرع شریف بریں چنیں کس جاری نیست۔"

(یہ دردیش، یعنی قلندر بوعلی مست اور مجذوب ہیں۔ ایسے مجذوبوں پر شرع شریف کے احکام جاری نہیں ہوتے۔)

القصد بہت کچھ گفتگو کے بعد یہ قصہ رفع و فتح ہوا، اور یہ دونوں بھائی اپنی مسجد میں گئے۔ ایک روز حضرت قلندر صاحب اس مسجد کی طرف تشریف لے آئے۔ یہ دونوں بھائی قلندر صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ انکی قدم بوسی کی اور مسجد میں لے آئے۔ جو حاضر تھا وہ پیش کیا۔ حضرت قلندر صاحب نے اس وقت خوش ہو کر ان کے لئے دعا فرمائی اور بشارت دی۔ کہ :-

”شما بخاطر جمع این جادو پانی پت با شید“

(تم دل جمعی اور اطمینان سے اس جگہ یعنی پانی پت میں رہو گے)

غرض حضرت قلندر صاحب کی دعا کی برکت ہے۔ کہ ان دونوں بزرگوں کی (جو اس وقت طالب علم تھے) اولاد (انصاری خاندان) آج تک پانی پت میں آباد ہے اور ترقی کر رہا ہے۔ اور ان کے بعض بزرگ جیسے شیخ امان اور شیخ حسین وغیرہ بہت زیادہ صاحب تاثیر اور صاحب کرامات درویش ہوئے ہیں۔

واللہ اعلم بالصواب۔
(انہی شرف المناقب)

شرف المناقب کی اس روایت میں یہ غلطی تو ضرور ہے کہ اس کو شمس الدین ایک کے زمانہ کا واقعہ بیان کیا ہے۔ حالانکہ وہ ۶۳۵ھ میں قلندر صاحب کے دہلی جہانے سے بھی پہلے وفات پا چکا تھا۔ اس کے علاوہ باقی مضمون اصول زوا کے لحاظ سے بھی درست معلوم ہوتا ہے اور روایت کے لحاظ سے بھی صحیح ہے۔ کیونکہ متعدد ذرائع سے یہ ثابت ہے کہ حضرت قلندر صاحب نے حضرات انصار کے مورث علی کو جو پانی پت میں اقامت گزیں ہوئے تھے۔ دعا دی تھی۔ اور اس خاندان کی بقا و ترقی اس دعا کی برکت ہے۔ مثلاً عبد السلام صاحب حشتی صابری پانی پتی کا ایک قلمی رسالہ ہمارے سامنے ہے۔ یہ رسالہ تیرہویں صدی کے آخری ربیع ۱۲۸۸ھ میں مصنف نے تحریر کیا تھا۔ اور حضرت مولانا نقار اللہ صاحب عثمانی کے

خاندانی مخطوطات میں محفوظ تھا۔ یہ رسالہ اردو میں ہے اور اس میں چند سوالات کے جوابات دیئے گئے ہیں۔ ساتویں سوال کے جواب کے آخر میں تحریر ہے۔ واضح ہو کہ زال جناب حضرت خواجہ شرف الدین میں خواجہ ملک علی انصاری بہت ذی علم اور ذی فضل (اولاد میں ۶) خواجہ عبداللہ انصار کے مع پسران خواجہ نصیر و خواجہ مسعود) وارد پانی پت ہوئے۔ پیشہ درس و تدریس گرم رکھتے تھے۔ ان کو ساتھ حضرت شرف الدین کے ایک طرح کی عقیدت ہو گئی۔ حضرت نے فرمایا تم سکونت اس دیار میں اختیار کرو۔ اور عصادستی اپنا عطا کیا۔ اور اولاد و نسل کی افزائی کی دعا دی۔ پس وہ بزرگ بطوع و رغبت سکونت پذیر پانی پت ہوئے۔ اولاد ان کی انصار ماشار اللہ تا حال قائم و برقرار ہے۔

اسی طرح مولانا قاری عبدالحلیم صاحب انصاری نے "تذکرہ رحمانیہ" میں انھیں خواجہ ملک علی کے متعلق تحریر فرمایا ہے:-

"پانی پتی انصاریوں کے جدا علی خواجہ ملک علی رحمۃ اللہ علیہ کے صاحبزادوں (خواجہ نصیر الدین و خواجہ مسعود) کی شادی حضرت خواجہ قطب الدین ابو علی قلندر پانی پتی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت مخدوم صاحب شیخ جلال الدین کبیر اللادلیہ (رحمۃ اللہ علیہ) کی صاحبزادیوں سے کرا کر یہ دعا دی تھی کہ تمھاری اولاد قیامت تک یہاں بسے گی۔ اور بڑے بڑے علماء اور ذی وقار لوگ تمھاری نسل میں پیدا ہوں گے۔

تذکرۃ الصالحین عرف تذکرہ رحمانیہ ص ۱۱۱

بہر حال تحریری وثیقوں اور خاندانی روایات سے یہ بات تو اثر کے درجہ میں ثابت ہے۔ کہ حضرات انصار کے مورث اعلیٰ جو پانی پت میں فرودکش ہوئے تھے۔ ان کو حضرت قلندر صاحب نے دعا دی تھی۔ اور اس دعا کی وجہ بھی تقریباً مسلم ہے۔ یعنی مورث اعلیٰ کی مخلصانہ عقیدت و محبت حضرت قلندر صاحب سے۔

اس مخلصانہ عقیدت کا ایک مظاہرہ یہ تھا کہ خواجہ نصیر اور خواجہ مسعود نے اس محضر نامہ کو چاک کر دیا۔ پھر جب حضرت قلندر صاحب ان کی مسجد میں اتفاقاً پہنچ گئے۔ تو ان صاحبزادوں نے قلندر صاحب کی بہت زیادہ مدارات کی وغیرہ۔

بہر حال اس روایت کے بموجب سکر وائٹ اور استغراق مسلسل اور جذب مستقل وہ عارضہ تھا جس نے اس آخری دور میں حضرت قلندر صاحب کو مرفوع القلم کر دیا تھا۔

عبدالسلام صاحب چشتی صابری کا تذکرہ پہلے گذر چکا ہے۔ ان کا سادہ بیان حضرت قلندر صاحب کے متعلق خود ان کے الفاظ میں یہ ہے:-

”بیچ اد ائل عمر حضرت نے جملہ علوم و فنون کمال حاصل کئے اور بروایت اقتباس الانوار۔ مدت تیس سال تک پیارینار مسجد قوۃ الاسلام بیچ درس و تدریس و افتادہ خلایق کے مشغول رہے اور طریقہ مجاہدہ و ریاضت سلوک فرماتے رہے۔ آخر کار حضرت پر عالم جذب طاری ہو گیا۔ بہر حال باقی عمر بیچ جذب کے گذاری۔“

کیا یہ جذب مقصود ہے؟

یہاں سوانح نگاروں کی ایک کمزوری ظاہر ہوتی ہے کہ وہ اپنے ممدوح کی شان کو بلند کرنے کے لئے احکام شریعت میں توڑ مروڑ شروع کر دیتے ہیں۔ کیونکہ وہ اس کو گوارا نہیں کرتے کہ ان کے ممدوح کو مرفوع القلم قرار دیا جائے۔ اس کے برخلاف وہ اس کے لئے آمادہ ہو جاتے ہیں کہ ان کے حق میں احکام شریعت کو منسوخ قرار دیا جائے۔ ایک دوسری غلطی اس سے یہ پیدا ہوتی ہے کہ اس جذب و استغراق کو مقصود سمجھا جانے لگتا ہے۔ حالانکہ یہ ایک عارضہ ہے مقصود نہیں ہے۔

چنانچہ یہی صاحب شرف المناقب جو اس استغراق اور مدہوشی کو حضرت

قلندر صاحب کے مناقب میں شمار کراتے ہوئے مولانا مفتی ضیاء الدین صاحب عرف
"میر سید علی مفتی" کا مذاق بنا رہے ہیں۔ شرف المناقب کے شروع میں تحریر فرماتے ہیں۔

"قطب الاخیار مولانا عبد الرحمن جامی رحمۃ اللہ علیہ در کتاب نفحات آوردہ کہ

اہل وصول بعد از انبیاء علیہم السلام دو طائفہ اند۔ اول صوفیہ کہ بواسطہ متابعت

خلاصہ کائنات علیہ الصلوٰۃ والسلام رتبہ وصول یافتہ اند و بعدہ در رجوع

برائے دعوت خلق بطریق متابعت مامور شدہ و این طائفہ کا مذاں مکمل اند کہ

فیض الہی ایشاں را بعد استغراق در عین جمیع و لجبہ توحید۔ از شکم ماہی فنا بسا حل

بقا خلوص ارزانی فرمود تا خلق را بہ نجات دلالت کنند۔

دویم طائفہ آن جماعت اند کہ بعد از وصول بدرجہ کمال غرق بحر جمیع گشتند

و از شکم ماہی فنا چنان ناچیز مستہلک شدند کہ ایشاں را بہرگز خبر و اثر بسا حل

تفرقہ بقا نہ رسیدہ حضرت شاہ شرف الدین بوعلی قلندر عاشق الہی از طائفہ ثانیہ لوبند۔

ترجمہ :- مولانا عبد الرحمن جامی رحمۃ اللہ علیہ نے مشہور تصنیف "نفحات" میں تحریر

فرمایا ہے کہ انبیاء علیہم السلام کو مستثنیٰ کر کے باقی اہل وصول اور خدا رسیدہ

دو قسم کے ہوتے ہیں۔ اول صوفیائے کرام، جو خلاصہ کائنات فخر موجودات

صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت اور آپ کے نقش قدم پر چل کر رتبہ وصول (درجہ خدا

رسی) حاصل کرتے ہیں۔ اس کے بعد مناسب صورت سے خلق خدا کی اصلاح

اور تبلیغ کی طرف رجوع کرنے کا ان کو حکم ہوتا ہے۔ یہ حضرات دعوت و ارشاد میں

مصروف ہو جاتے ہیں۔ یہ کامل و مکمل اولیاء اللہ ہوتے ہیں کہ فیض الہی ان کو

سرچشمہ جمیع اور گرواب توحید میں غرق کرنے کے بعد ماہی فنا کے شکم سے نکال

کر ساحل بقا پر پہنچاتا ہے۔ تاکہ خلق خدا کو نجات کے راستے بتائیں۔

دوسری وہ جماعت ہے کہ درجہ کمال پر پہنچنے کے بعد دربار جمیع میں غرق

ہو جاتے ہیں۔ اور ماہی فنا کے شکنجے میں لیسے گم ہو جاتے ہیں کہ تفرقہ بقا کے ساحل کی انھیں کوئی خبر نہیں رہتی۔ حضرت شاہ شرف الدین بوعلی قلندر عاشق الہی اسی دوسری جماعت میں ہیں۔

ہمیں اس سے بحث نہیں ہے کہ میر علی مفتی صرف ایک دنیا دار عالم تھے۔ یا خدا رسیدہ بزرگ اور سلسلہ طریقت کے سالک تھے۔ ہمارا نشانہ یہ ہے کہ جذب و استغراق دائم ایک عذر تو ہو سکتا ہے مقصود نہیں ہوتا اور سوانح نگاروں کی یہ غلطی ہے کہ اس کو ایسے انداز سے بیان کرتے ہیں کہ گویا وہ مقصود ہے۔ اور یہ نہیں خیال فرماتے کہ احکام شریعت کو کسی شخص کے حق میں منسوخ اور مرفوع قرار دینے کے مقابلہ میں یہ بات بہت آسان ہے کہ اس شخص کو مرفوع القلم کہا جائے۔ تاہم ان کی یہ غلطی غیر شعوری ہے جو اس بزرگ کی فرطِ محبت اور عقیدت میں سرزد ہوتی ہے جس کی وہ سوانح لکھ رہے ہیں۔ اور اس سے زیادہ گمراہ کن اور مستردانہ و باغیانہ غلطی ان کی ہے جو ایک طرف قلندری کے بہانہ کفر و الحاد اور معاذ اللہ شانِ خدا میں گستاخی اور بے ادبی کی راہ ہموار کرتے ہیں اور دوسری جانب شرمناک ہوا پرستی کو چھپانے کے لئے ایک مقدس لبادہ بنا لیتے ہیں۔ ان کے نزدیک قلندری یا عشق و محبت کے لئے اس طرح کی حسن پرستی لازم اور ضروری ہے۔ جس کو مہذب الفاظ میں بولا ہو سہی کہا جاتا ہے۔ اس کی چند مثالیں خود قلندر صاحب کی سوانح سے آئندہ نقل کی جائیں گی۔ (النشر اللہ) ہم یہاں اس طویل بحث کے دامن کو سمیٹ کر اصل موضوع کی طرف رجوع کرتے ہیں۔

ہم رنگی محبوب کی حقیقت اور اس کی صحیح تصویر

قلندر صاحب کا یہ شعر موضوعِ کلام تھا۔

در محبت تانسوزی بال و پر
کے شوی ہم رنگ عاشق سرسپر

رجب تک محبت میں بال و پر نہ جلا دو، پوری طرح عاشق کے ہم رنگ کیسے
ہو سکتے ہو۔

سوال یہ تھا کہ ہم رنگی کے کیا معنی ہیں۔ اور ایک فانی انسان محبوب حقیقی یعنی
حضرت حق جل مجدہ کے ہم رنگ کس طرح ہو سکتا ہے۔ پہلی قسطوں کے طویل
سلسلہ کلام میں یہ بتایا گیا ہے کہ بوالہوس مصنوعی قلندروں نے ہم رنگی کے وہ
معنی لئے جو سراسر زندقہ، الحاد اور بے دینی ہے یعنی احکام شریعت سے آزادی اور
جامہ تہذیب و شرافت سے برہنگی (معاذ اللہ) لیکن وہ ہم رنگی جو صبغة اللہ
ومن احسن من اللہ صبغة سے ثابت ہوتی ہے۔ وہ ہم رنگی وہ ہے جس کی
تعلیم تخلقوا باخلاق اللہ۔ سے دی گئی ہے تم بھی ان اخلاق سے آراستہ
ہو جاؤ جو اللہ کے اخلاق ہیں، وہ ربانی اخلاق جن سے ایک انسان آراستہ ہو سکتا
ہے۔ وہ وہ ہیں جن کی تعلیم و تمرین اور جن کا عملی تجربہ کرانے کے لئے آنحضرت صلی اللہ
علیہ وسلم کو رحمتہ للعالمین بنا کر مبعوث کیا گیا تھا۔ مثلاً اللہ تعالیٰ رب العالمین،
ارحم الراحمین ہے۔ تم رب نہیں بن سکتے مگر مرنی بن سکتے ہو۔ بس مخلوق خدا کے
لئے مربیانہ اخلاق اختیار کرو۔ پرورش، ہمدردی، غمخواری، تقاضا و رربوبیت
ہے۔ تم اپنے اندر محتاجوں کی حاجت روائی برصیدت زودوں کی ہمدردی،
بے کسوں اور بے بسوں کی غمخواری کا جذبہ پیدا کرو۔ ہر ایک مخلوق کے ہمدرد بن
جاؤ۔ رحم و کرم کو ہر جاندار کے لئے عام کرو۔ اپنے پرانے ہر ایک سے انصاف
کرو۔ یہ ہیں وہ اخلاق جن کو صبغة اللہ کہا جا سکتا ہے۔ جو تخلقوا
باخلاق اللہ اور اخلاق خداوندی سے آراستہ ہونے کی عملی تصویر ہیں۔

ان بزرگانِ پاک باطن نے اس مفہوم اور مقصود کے لئے ایک چمکتا ہوا جامع لفظ استعمال کیا ہے وہ لفظ ہے عشق، عشق، عشق۔

احکامِ شریعت کی پابندی کے لئے قلندرانہ جذبات ان اشعار سے ظاہر ہوتے ہیں جو قلندر صاحب کی مثنوی سے منتخب کر کے پہلے نقل کئے جا چکے ہیں۔ اسی طرح قلندر صاحب کے ایک مکتوب کے اقتباسات بھی پہلے بیان کئے جا چکے ہیں۔ یہ مکتوب بقول مولانا عبدالحق صاحب محدث، عشق و محبت کی زبان میں لکھا گیا تھا۔ اس میں معشوق حقیقی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو قرار دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کو عاشق حقیقی ثابت کیا ہے۔ اور تخلقوا باخلاق اللہ کی تفسیر یہ کی گئی ہے کہ تم بھی عاشق بن جاؤ اور جس طرح عاشق حقیقی یعنی اللہ تعالیٰ کا عشق اپنی ہر مخلوق کے لئے عام ہے۔ تمہارا عشق بھی اس کی مخلوق میں کوئی امتیاز نہ پیدا کرے۔ تبلیغ و اصلاح بھی ہو تو عاشقانہ اور ہمدردانہ انداز میں ہو۔ قلندر صاحب کا ایک جملہ یاد رکھئے اور لطف اندوز ہوتے رہیے۔ وہ جملہ یہ ہے۔

”اے برادر عاشق شو ہر دو عالم را حسن معشوق داں“

(بھائی! عاشق بن جاؤ۔ دونوں جہانوں کو معشوق کا حسن سمجھو)

اس عشق و محبت کے ساتھ جہاں تک خود تمہاری ذات کا تعلق ہے تو تقاضا عشق یہ نہیں ہے کہ ”انا الحق“ کہو۔ معاذ اللہ یہ تو خود پرستی ہے۔ عاشق کے پاس ”انا“ (میں) کہاں، وہ تو فنا ہو چکا۔ یہ فنا ہی اس کا کمال ہے۔ یہی اس کا سرمایہ ہے۔ ”انا“ اس کی زبان پر آئے تو کس طرح آئے؟ متاعِ عشق برباد ہو تو ”انا“ زبان پر آسکتا ہے۔ مگر متاعِ عشق وہ دولتِ جاوداں ہے جس کے خاتمہ کے تصور سے ہی پتہ پانی ہو جاتا ہے۔

قلندر صاحب کا یہ ارشاد کبھی کبھی فراموش نہ ہونا چاہئے۔

تا توئی کے یار گرد و یار تو
چوں نباشی، یار باشد یار تو

ترجمہ :- جب تک تم تم ہو اپنی انانیت کو باقی رکھے ہوئے ہو یعنی اس تصور کو باقی رکھے ہوئے ہو کہ میں بھی ایک چیز ہوں، اس وقت تک یار کب یار ہو سکتا ہے۔ تم اس تصور کو ختم کر دو کہ میں بھی کچھ ہوں اس وقت یار واقعی یار بن جائیگا۔

تو مباح اصلاً، کمال این مست و لبس
تو درو گم شو، وصال این مست و لبس

ترجمہ :- تم بالکل نہ رہو یہ تصویر ہی ختم کر دو کہ میں بھی کچھ ہوں۔ بس یہ ہے کمال؛ تم اس (محبوب) میں گم ہو جاؤ، یہی وصال ہے اور بس۔

مولانا حکیم عبدالحی صاحب نے "نزهۃ الخواطر" میں حضرت قلندر صاحب کا

قول نقل کیا ہے۔ ملاحظہ فرمائیے :- اور محفوظ ہو جائیے۔

"درویشی چسیت؟ نفس کشتن، طلسم ہستی شکستن، و ترک از غیر کشتن،

و از خود رستن، و بد دست پیوستن، و در آتش محبت سوختن، و

خاکستر شدن" (ص ۶ ج ۲)

ترجمہ :- (درویشی کیا ہے؟ نفس کو مارنا، ہستی کے طلسم کو توڑ دینا، اس تصور کو

مٹا دینا کہ میں کچھ ہوں) جو کبھی غیر ہے اس کو ترک کر دیتا خود اپنے اپنے آپ سے

بھی رہائی پالینا۔ اور بد دست سے پیوست ہو جانا۔ آتش محبت میں جلنا

اور خاک بن جانا۔)

مذہب، عشق، تبلیغ و اصلاح کا لائحہ عمل

بات بہت دور جا پڑی۔ اصل مقصد یہ ہے کہ اس دور میں جو اگرچہ مسلمانوں

کی حکومت کا دور تھا۔ مگر حکومت وہ تھی جس کو صادق مصدوق خاتم الانبیاء علیہ
 وعلیہم السلام کی زبان حقیقت ترجمان نے "ملک عضو" فرمایا تھا "ورندہ صفت
 حکومت"۔ کٹکھنی حکومت اس دور میں ان شاہنشاہوں کے کردار سے اگر بالفرض
 اسلام کی اشاعت ہوئی تو وہ جبر و قہر کے انداز میں ہوئی۔ جو فطرتِ اسلام کے سراسر
 مخالف ہے۔ ان بزرگوں نے فطرتِ اسلام کو اس کے اصلی روپ میں پیش کیا۔

کو رباطن نکتہ چیں کہتے ہیں کہ اسلام تلوار کے زور سے پھیلا۔ مگر جو حقیقت
 آفتاب کی طرح نمایاں ہے وہ یہ ہے کہ تلوار الگ رہی۔ تلوار اٹھانے والے کبھی لگ
 رہے۔ خلقِ خدا ان سے وابستہ رہی جو گڈری پوش تھے۔ جن کو تلوار اٹھانے والوں
 سے یہاں تک نفرت تھی کہ ان سے ملنا بھی پسند نہیں کرتے تھے جو فقیر کے لقب
 پہنچتے تھے (اگرچہ عوام کی عقیدت کا یہ حال تھا کہ وہ ان کو شاہ اور شاہ صاحب
 کہتے تھے) انہی فقیروں نے عشق کو اپنا مذہب قرار دیا۔ محبت کے ترانے گائے۔
 خلقِ خدا کو مانوس کیا۔ بادۂ اُفت سے انھیں سرشار کیا۔ شاہی محلات میں نہیں،
 بلکہ خلقِ خدا کے دلوں میں گھر کیا۔ اور اس طرح اسلام کی کشش کو باقی رکھ کر
 بچھڑے ہوؤں کو ملایا۔ ٹوٹنے والے دلوں کو جوڑا اور کلمۃ اللہ کو بلند کیا۔

خدا رحمت کند ان عاشقانِ پاک طینت را

مسک عشق کی غلط تفسیر

آج کل ایک خاص فن یہ ہے کہ غالب اور حافظ شیرازی کے اشعار کے مرقعات
 تیار کئے جا رہے ہیں۔ یہ مرقعات با تصویر ہوتے ہیں۔ آپ کو تعجب ہوگا۔ کہ حضرت
 قلندر صاحب جیسے عاشقانِ سر مست کے بھی مرقعات تیار کئے گئے۔ مگر تصاویر
 کے ذریعہ نہیں بلکہ افسانوں کے ذریعہ۔ اور چونکہ ان افسانوں کے مصنف جو خود

اغراض پرست بوالہوس تھے جوٹی کی آڑ میں شکار کھیلنے کو اپنا فن سمجھتے تھے تو یہ
افسانے بھی ایسے ہی ہیں جن کو بوالہوسی کی قلمی تصویر کہنی چاہیے۔
مثال ملاحظہ ہو:- حضرت قلندر صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی ایک غزل ہے۔

غیرت از چشم برم روئے تو دیدن ندہم
گوش را نیز حدیث تو شنیدن ندہم
مجھے اپنی آنکھ پر بھی غیرت آتی ہے۔ اس لئے آنکھ کو اجازت نہیں دے سکتا کہ
وہ تجھ کو دیکھ سکے۔ کان کو بھی اجازت نہیں کہ وہ تیری بات سن سکے۔

گر شبے دست و ہر وصل تو از غایت شوق
تا قیامت نشو و نج و صبح دمیدن ندہم
اگر کسی رات آپ کا وصال حاصل ہو جائے تو انتہائی شوق کے باعث صبح کو
اجازت نہیں دوں گا کہ وہ طلوع ہو جائے یہاں تک کہ قیامت قائم ہو۔

گر بیا پد ملک الموت کہ جانم برود
تا نہ بینم رُخ تو روح رمیدن ندہم
اگر ملک الموت میری جان لینے آئے تو جب تک تیری صورت نہ دیکھ لوں۔
روح کو پرواز کرنے کی اجازت نہیں دوں گا۔

ہد یہ زلف تو گر ملک دو عالم بدہد
لعلم اللہ کے سر موئے تو دیدن ندہم
تیری زلف کے بہ یہ قیمت میں اگر دونوں جہان کی حکومت بھی دی جائے
تو اللہ جانتا ہے کہ ایک بال کا کنارہ بھی دیکھنے کی اجازت نہیں دے سکتا۔

گر بدام دل من افتد آں عنقا باز
گر چہ صد حملہ کند باز پریدن ندہم

راگر میرے دل کے جال میں وہ عنقا دوبارہ بچھنس جائے تو اگر سو بار جملہ
کرے تو دوبارہ اڑنے کا موقع نہ دوں۔

شرف گرباد وزو بوئے از نفس برد

باد را نیز دریں دیر وزیدن ندہم

اے شرف اگر ہو اتیرے سانس کی بو باہرے جلنے لگے۔ تو ہوا کو بھی اس
کی اجازت نہ دوں کہ وہ چلے۔

عشق الہی اور محبوب حقیقی کے بارے میں کتنے عمدہ اشعار ہیں۔ ظاہر ہے۔
حضرت حق جل مجدہ نہ ان آنکھوں سے نظر آسکتے ہیں نہ ان کا کلام ان کانوں سے
سنا جاسکتا ہے۔ حضرت قلندر صاحب اس کی توجیہ یہ کر رہے ہیں۔ کہ عاشق انتہا
سے زیادہ غیرت مند ہے۔ تصویر جاناں دل میں سموئے ہوئے ہے۔ وہ اسی میں
محو ہے۔ اور اسی طرح مگن ہے کہ چاہتا ہے کہ جو کچھ ہو وہی وہ ہو۔ اسے شرکت غیر
قطعاً گوارا نہیں ہے۔ یہاں تک کہ وہ خود اپنی آنکھوں اور اپنے کانوں کو بھی اپنا
رقیب سمجھتا ہے۔ اسے یہ بھی گوارا نہیں کہ آنکھ اس کے رخِ زیبا کو دیکھ سکے۔ یا
کان اس کی صدائے دلکش کو سُن سکے۔ اسی طرح جملہ اشعار کی توجیہ اور تشریح
کی جاتی ہے۔

اب بوالہوس مصنوعی قلندروں کی فنکاری ملاحظہ فرمائیے:-

کہ مبارک خال جو خاندان شاری کا ایک فرد تھا۔ اور اس کے ایشارہ قربانی
اور جذبہ خدا طلبی کی بنا پر حضرت قلندر صاحب اس پر شفقت فرمایا کرتے تھے اس
کے اس ارادتمندانہ تعلق اور بے لوث رابطہ کو کس طرح ملوث کیا ہے۔ اور تعجب
ہے کہ مصنف شرف المناقب جیسے حضرات نے بھی جو حضرت قلندر صاحب سے
مخلصانہ عقیدت رکھتے ہیں۔ اس افسانہ کو بلا تنقید و تبصرہ نقل کر دیا ہے:-

افسانہ یہ تراشا گیا ہے کہ پانی پت میں کوئی فوجی افسر تھا اس کو کبھی مبارک خاں سے دلچسپی تھی۔ ایک روز مبارک خاں سیر و شکار کے لئے گئے ہوئے تھے۔ فوجی افسر نے موقع پا کر ان کو اپنے قبضہ میں کر لیا۔ حضرت قلندر صاحب شام تک مبارک خاں کے منتظر رہے۔

"چوں روز آخر شد و شرب رسید قلندر بوعلی را اشتیاق محبوب

غالب شد۔"

رجب دن ختم ہو گیا اور رات آپہنچی تو قلندر بوعلی پر محبوب کا اشتیاق غالب ہو گیا۔ بالآخر اشتیاق محبوب نے یہاں تک مضطرب کیا کہ آپ اس فوجی افسر کی ڈپور بھی پر پہنچ گئے۔ اور ویدار محبوب کے اشتیاق میں یہ اشعار گنگنانے لگے۔
(جواو پر نقل کئے گئے ہیں)

حضرت قلندر صاحب غزل پڑھ رہے تھے اور تاریکی شب بڑھ رہی تھی۔ چنانچہ روایت ہے کہ وہ رات بہت دراز ہو گئی۔ یہاں تک کہ وہ فوجدار بھی عاجز ہو گیا۔ اور "ورازی شب و بسیاری خواب" سے سارا عالم تنگ ہو گیا۔ آخر کار پانی پت کے عامل (کلکٹر) کو اس کا احساس ہوا۔ اُس نے تحقیق و تفتیش شروع کر دی کہ آخر ورازی شب کا سبب کیا ہے؟ عامل (کلکٹر) کو تحقیق کے بعد پتہ چلا کہ قلندر صاحب فوجدار کے دروازے پر کھڑے ہوئے ہیں۔ اور فرما رہے ہیں کہ جب تک مبارک خاں میرے پاس نہیں پہنچیں گے صبح نہیں ہوگی (خدا جانے حضرت قلندر صاحب نے یہ الٹی شرط کیوں لگائی۔ حالانکہ شب فراق کی طوالت مطلوب نہیں ہوتی۔ شب وصال کی طوالت مقصود ہوتی ہے۔ محمد میاں) قصہ مختصر جب فوجدار عاجز ہو گیا تو اس نے مبارک خاں کو قلندر صاحب کی خدمت میں پیش کر دیا۔ اور جیسے ہی مبارک خاں حضرت قلندر صاحب کے

پاس پہنچے آفتاب برآمد ہو گیا۔ حضرت قلندر صاحب نے مبارک خاں کا ہاتھ پکڑا۔
اور اس کو اپنے ساتھ لے آئے۔

وہاں ایک مطرب بچہ (نوجوان قوال) حاضر تھا۔ اس نے یہ اشعار گائے۔

اگر بنیم شبے ناگہ من آل سلطان خوباں را
سرے در پار وئے آرم فداسازم دل جان

اگر دفعۃً کسی رات میں اس معشوقوں کے بادشاہ کو دیکھ لوں تو اس کے پیروں
میں سرداں دہوں دل اور جان کو قربان کر دوں۔

بپرسم از رہ یاری کہ جاناں چوں نہ آخر
کجائی کت نمے بنیم و چشم مسرت غلطاں را

ریاری اور دوستی کی راہ سے میں اس سے دریافت کروں کہ جاناں آخر تم آتے
کیوں نہیں تم کہاں ہو کہ میں تمہاری چشم غلطاں کو دیکھ بھی نہیں سکتا۔
قوال یہ اشعار پڑھ رہا تھا کہ حضرت قلندر صاحب :-
" از عالم معرفت بدریا وحدت مستغرق شد۔"

(عالم معرفت سے دریا وحدت میں غرق ہو گئے)

جب یہ استغراق کیفیت ختم ہوئی تو آپ نے اس "مطرب بچہ" پر نظر کر م فرمائی
اپنا گھوڑا اس کو بخش دیا۔ پھر وہاں سے اٹھے۔ مبارک خاں کا ہاتھ پکڑ کر پانی پت
سے کرنال کی طرف روانہ ہو گئے۔ پھر کرنال کے قریب موضع "بوڈہ کھیرہ" میں جا کر
قیام فرما ہوئے اور یہیں سکونت اختیار کر لی۔ حتیٰ کہ داعی اجل کو لبیک کہا۔

مبارک خاں کے متعلق مشہور ہے کہ یہ شہزادہ تھا بچپن ہی میں اس کو خدا طلبی
کا شوق پیدا ہوا۔ اور حضرت قلندر صاحب کی خدمت سے فیضیاب ہونے لگا۔
اس کی بہتر صلاحیتوں نے حضرت قلندر صاحب کی توجہات اور آپ کی شفقتوں

کو بھی اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ آپ کو ان سے بہت زیادہ انس ہو گیا۔ آپ کو بھی گوارا نہیں تھا کہ یہ آپ کی خدمت سے غیر حاضر ہوں۔ ظاہر ہے کہ یہ انس اور الفت وہی ہے جو ایک جوہر شناس کو کسی بہتر جوہر سے ہونی چاہیے۔ مگر خدا محفوظ رکھے۔

یارانِ طریقت نے اس کو کچھ اور ہی رنگ دے دیا۔ اور وہ اشعار جو عاشقانِ پاک طینت نے اپنے محبوب حقیقی کے شوق میں کہے تھے۔ ان کو اس مفروضہ عشق پر چسپاں کر دیا۔

اتفاق سے حضرت قلندر صاحب کی زندگی میں مبارک خاں کی وفات ہو گئی۔ اس لئے ان سے فیضیاب ہونے کا موقع لوگوں کو نہیں مل سکا۔ اور یہ جوہر قابلِ اسی طرح زیر زمین دفن ہو گیا۔ لیکن قدردان جوہری کو اب بھی اس کی قدر تھی۔ چنانچہ جو جگہ حضرت قلندر صاحب نے اپنی قبر کے لئے تجویز کر رکھی تھی۔ اس کے قریب ہی ان کو دفن کرایا۔ اور یہ بھی روایت ہے کہ سلطان علاء الدین بادشاہِ دہلی سے فرمائش کر کے مبارک خاں کی قبر پر قبہ اور گنبد بھی حضرت قلندر صاحب نے ہی اپنی زندگی میں بنوایا تھا۔ بہر حال سجادہ صاحبان کی روایت یہ ہی ہے کہ قلندر صاحب نے یہ بھی فرمائش کی تھی کہ ان کے مزار پر حاضر ہونے والا پہلے..... مبارک خاں کے مزار پر حاضر ہو۔ (واللہ اعلم بالصواب) (شرف المناقب وغیرہ)

گوہری کا افسانہ

اسی قسم کا ایک افسانہ ایک گوہری کا بھی ہے۔ سوانح نگاروں نے اس کو حضرت قلندر صاحب کے کرامات اور آپ کے مناقب میں شمار کیا ہے۔ کیونکہ جس طرح مبارک خاں کے مذکورہ بالا افسانہ میں قلندر صاحب نے آفتاب کو باندھ دیا تھا۔ کہ جب تک مبارک خاں رہا نہیں ہوئے آفتاب نہیں نکلا۔ اسی طرح

اس افسانہ میں اولاد بخشنے کی کرامات ظاہر ہوئی ہے اور صرف عورت کے لطف سے ہی نہیں بلکہ ایک بچہ تو پتھر کے نیچے سے برآمد کرایا ہے۔ پورا افسانہ ملاحظہ فرمائیے۔
 حضرت قلندر صاحبؒ "بوڑھ کھڑا" میں قیام فرما ہیں۔ ایک حسین و جمیل گوجری وہی کا گھڑا سر پر رکھے ہوئے اس طرف سے گذر رہی ہے۔ حضرت قلندر صاحب کی نظر اس پر پڑتی ہے تو آپ فرماتے ہیں: "گوجری وہی بھتی ہو۔"؟
 گوجری: "ہاں صاحب بھتی ہوں" اور بچنے کے لئے ہی یہ بوجھا اٹھائے پھر رہی ہوں۔ مگر میاں صاحب آپ میری وہی خرید سکیں گے۔ وہی قیمتی ہے۔

قلندر صاحب: ضرور، بتاؤ کیا قیمت ہے؟

گوجری: "زر سرخ کا ایک تنکہ" (یہ سونے کا ایک سکہ ہوتا تھا۔)

قلندر صاحب نے زالتو کے نیچے سے سونے کا یہ سکہ نکالا۔ اور گوجری کو دیدیا۔

اور فرمایا: "یہ تنکہ بھی تمہارا اور یہ وہی بھی تمہیں کو بخشی" لے جاؤ۔"

گوجری دعائیں دیتی ہوئی خوشی خوشی چلی گئی۔ دو چار روز بعد پھر اسی طرح

آئی اور ایک تنکہ لے گئی۔ اسی طرح وہ آتی جاتی رہتی تھی۔ اور اپنے گھر والوں سے

اس ورڈش (قلندر) کی تعریف کیا کرتی تھی۔

اتفاق سے اس گوجری کے کوئی بچہ نہیں تھا۔ ایک روز اس کے شوہرنے

کہا تو اس بزرگ کی بہت تعریف کرتی ہے۔ اُس سے سونے کا "تنکہ" لاتی ہے

اس سے بیٹا بھی تو مانگ۔

اگلے روز گوجری بن ٹھن کر "لباس فاخرہ پوشیدہ" (اچھا لباس پہن کر) اور

وہی کی ٹھلیا سر پر رکھ کر قلندر صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئی۔ اور نہایت

ادب سے سلام کیا۔

"بوعلی را ادائش پسند آمد" (قلندر صاحب کو اس کی ادائش پسند آئی) اور خوش

ہو کر یہ رباعی پڑھی۔

اے گوجری درحسُن لطافت چو مہی ! اے گوجری حُسنِ لطافت میں چاند جیسی
 این دیگ دہی بر سر تو تاجِ شہی ! دہی کی ہنڈیا تیرے سر پر جیسے بادشاہی تاج
 از لعل لبّت شیر و شکر می بارد تیرے لعل جیسے ہونٹوں سے شیر و شکر برستا ہے
 ہر گاہ بگوئی کہ دہی لیو دہی ! جب تو کہتی ہے دہی لو دہی
 حضرت قلندر صاحب کو خوش دیکھ کر گوجری نے اپنی درخواست پیش کر دی۔
 کہ مدت است کہ طلب فرزند می دارم۔ توجہ فرمایید و دعا کنید۔ مرا فرزند عطا
 شود۔ (عرصہ سے فرزند کی طلب میں ہوں۔ آپ توجہ فرمائیے۔ اور دعا کیجئے مجھے لڑکا نصیب ہو)
 آپ نے گوجری سے فرمایا کہ۔ فوراً جاؤ اور اپنے محلہ میں "آواز لگا دو" کہ جس کے
 اولاد نہ ہو۔ وہ کل کو میرے ساتھ چلے۔ گوجری نے ایسا ہی کیا۔ اور اگلے روز عورتوں
 کی ایک بھیڑے کر وہ قلندر صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئی۔

شرف المناقب کی روایت ہے :-

"چوں حضرت جماعت زناں را ہمراہ آں معشوقہ دید۔ قدرے پس خوردہ
 برگِ تنبول بدست ہر یک زن داد و گفت بخورید۔"

حضرت قلندر صاحب نے جب اس معشوقہ (گوجری) کے ساتھ جب عورتوں
 کی جماعت کو دیکھا تو پان کی گلوری چبائی ہوئی مٹھوڑی مٹھوڑی ہر ایک عورت

کو دے دی اور فرمایا اسے کھا لو۔

حضرت قلندر صاحب کی اس پس خوردہ گلوری کو تمام عورتوں نے کھا لیا۔

مگر ایک عورت نے کھانے کے بجائے اس کو پتھر کے نیچے رکھ دیا۔ پس قلندر
 عاشقِ الہی کی زبان کی برکت سے تمام عورتوں کو اسی روز سے اُمید ہو گئی۔ اور نو ماہ
 چند روز بعد ہر ایک کے لڑکا ہوا۔ مگر وہ عورت جس نے گلوری کے ریزہ کو چبانے

کے بجائے پتھر کے نیچے دبا دیا تھا؛ محروم رہی۔ چالیس روز بعد جب یہ عورتیں چپلہ
نہا چکیں تو ہر ایک نے اپنے بچہ کو گود میں لیا۔ اور وہی کی ہنڈیا سر پر رکھی اور قلندر
صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئیں۔

”آں معشوقہ نیاز ہر یک را در پیش حضرت گذرا بند“

(اس گوجری معشوقہ) نے ہر ایک عورت کی نیاز قلندر صاحب کی خدمت

میں پیش کی۔

حضرت قلندر صاحب نے ہر ایک کی نیاز قبول فرمائی۔ ان عورتوں میں وہ بھی
تھی جس نے گلوری نہیں چبائی تھی اور اولاد سے محروم رہی تھی۔ وہ اس وقت نہایت
آزادہ اور غمگین کھڑی ہوئی تھی جب حضرت قلندر صاحب کی نظر اس پر پڑی۔ تو
فرمایا۔ غمگین کیوں ہو؟

اس محروم عورت نے سارا ماجرا سنا دیا۔ تب حضرت قلندر صاحب نے فرمایا۔

جاؤ پتھر اٹھاؤ۔ تمہارا لڑکا اسی پتھر کے نیچے ہے۔ جہاں تم نے ہمارا پس خوردہ پان
دبا دیا تھا۔ عورت یہ سنتے ہی تیزی سے پتھر کے پاس گئی۔ دیکھتی کیا ہے کہ اسی جگہ
جہاں یہ گلوری دبائی تھی، ایک لڑکا پڑا ہوا کھیل رہا ہے۔ عورت کی جیسے ہی اس بچہ
پر نظر پڑی۔ ماورا نہ شفقت جوش مارتے لگی۔ چھاتیوں میں دودھ بھر آیا۔ عورت نے
بچہ کو گود میں لیا اور قلندر صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئی۔ ارشاد ہوا۔ لڑکا تمہیں
مبارک ہو۔

ایسے افسانے روایت اور روایت کے لحاظ سے جو بھی حیثیت رکھتے ہوں

اس سے قطع نظر ہمارا منشا یہ ہے کہ ایسے بیانات میں عشق و معاشقہ کا لفظ غیر محتاط
ہی نہیں ہے۔ بلکہ سوراہی اور گستاخی ہے۔ یہ مصنوعی قلندر جو قلندری کے خروتہ
اور پوستان میں اپنی اغراض پوری کرنے کے عادی رہے ہیں۔ وہ ایسے افسانوں کے
موجد ہیں۔ جن کا حقیقت اور واقعیت سے دور کا بھی واسطہ نہیں ہے۔

حضرت قلندر صاحب کی وفات اور اس کا مزار

آٹھویں صدی ہجری کے چوبیسویں رمضان کا پہلا عشرہ ابھی پورا نہیں ہوا تھا کہ یہ تارک دنیا جو شہروں کی رونق اور آبادیوں کی جہل پہل چھوڑ کر عرصہ سے بوڑھ کھیرہ کے جنگل میں اپنی جھونپڑی ڈلے ہوئے تھا۔ ۹ رمضان کی شرب کو اس نے زندگی کے دھاگہ کو بھی توڑ دیا۔ اور تن تنہا عالم جاودانی کی طرف رخصت ہو گیا۔ تاریخ وفات اور مقام وفات میں اختلاف نہیں ہے۔ شرف المناقب کی روایت ہے کہ وفات کے وقت آپ تنہا تھے حتیٰ کہ وہ رات اور اگلا دن گزر گیا۔ اور آپ کی لاش تنہا پڑی رہی۔ شام کے وقت کچھ لکڑہارے اپنے معمول کے مطابق حضرت قلندر صاحب کی قدمبوسی کے لئے گئے تو دیکھا کہ حضرت قلندر صاحب رخصت ہو چکے ہیں۔ اور ان کا "کالبد خاکی" بے جان پڑا ہوا ہے۔ انھوں نے فوراً کرنال آ کر خبر دی۔ ۱۱ رمضان کو کرنال کے حضرات بوڑھ کھیرہ پہنچے۔

آپ کی لاش جہاں کے درخت کے نیچے ایک چبوترے پر جو "زیر زیوہ" کے نام سے مشہور ہو گیا ہے۔ رو بقیہ پڑی ہوئی تھی۔ کرنال کے ان ارادتمندوں نے لاش اٹھائی اور کرنال لے آئے۔ جہاں غسل دیا گیا۔

ابھی غسل سے فراغت نہیں ہوئی تھی کہ پانی پت کے حضرات پہنچ گئے اور اصرار کیا کہ وہ جنازہ کو پانی پت لے جائیں گے۔ کرنال والوں کی خواہش یہ تھی کہ مزار کرنال ہی میں ہو۔ مگر وہ رشتہ دار جو دلی کی حیثیت رکھتے تھے راضی نہیں ہوئے۔ اور دلیل یہ تھی کہ خود حضرت قلندر صاحب پانی پت اپنی قبر کی جگہ تجویز کر چکے ہیں چنانچہ "سہ واہ" بھی بنا چکے ہیں۔ لہذا آپ کو آپ کی پسندیدہ سرزمین میں دفن کرنا چاہیے۔ بالآخر ان کی تمنا اور ان کی کوشش کامیاب ہوئی۔ کرنال والوں نے

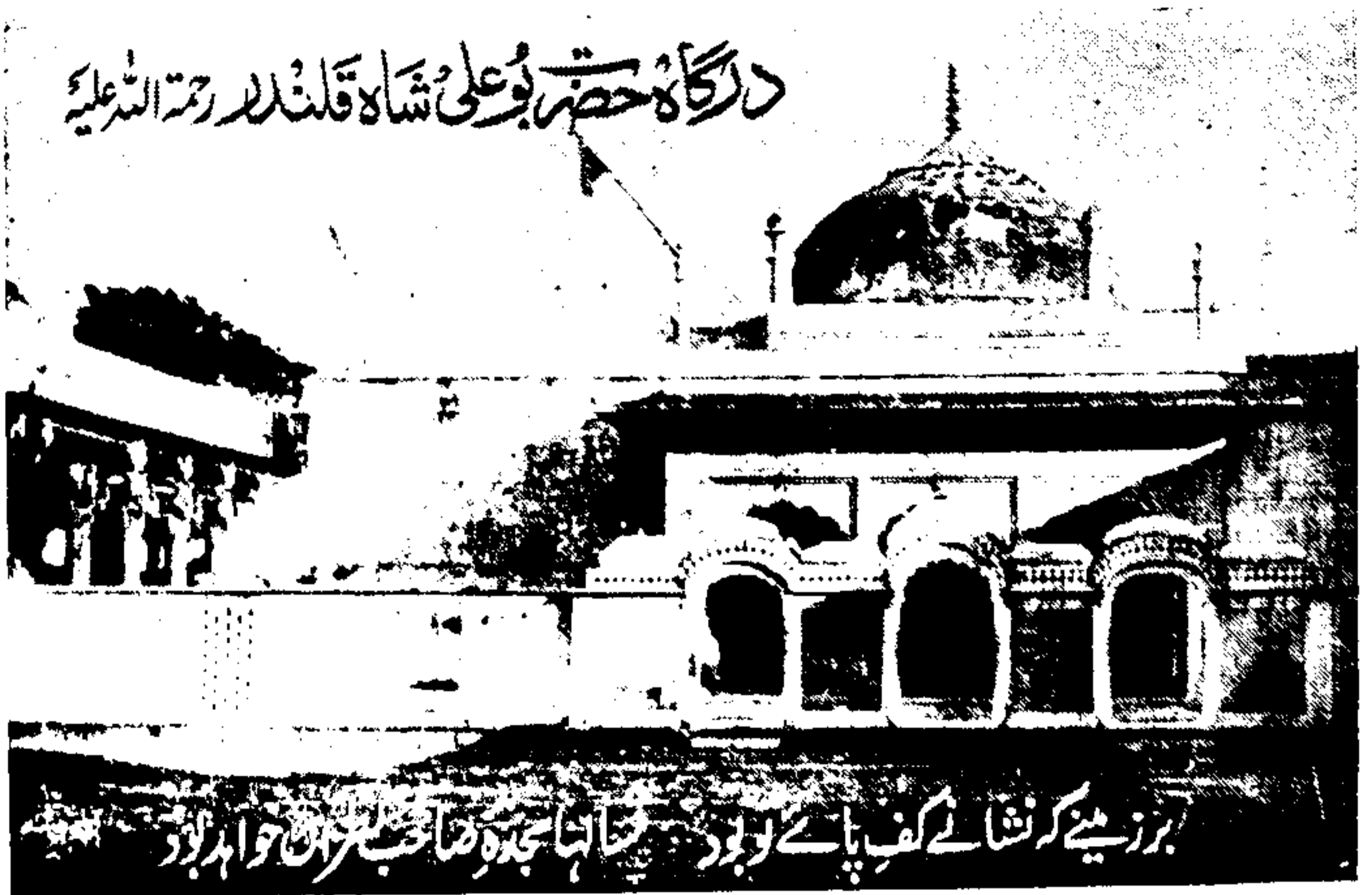
اجازت دی اور پانی پت کے حضرات جنازہ کو پانی پت لے آئے۔ جہاں آپ کو آپ کی بنوائی ہوئی قبر میں دفن کر دیا گیا۔

پانی پت سے کرنال پہنچنے والے حضرات ذریعہ اطلاع

پانی پت اور کرنال میں تقریباً اٹھارہ میل کا فاصلہ ہے۔ ماویات کے موجودہ ترقی یافتہ دور میں اٹھارہ میل تو کیا اٹھارہ سو میل کے فاصلہ پر بھی چند سکند میں اطلاع پہنچائی جاسکتی ہے۔ لیکن اُس زمانہ میں کہ خبر رسائی کا ذریعہ صرف قاصد ہوا کرتے تھے۔ اور اٹھارہ میل کی مسافت پر خیر پہنچانے کے لئے "پیک تیز رفتار" کو بھی پورا دن صرف کرنا پڑتا تھا۔ اور جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا ہے صورت یہ ہوئی۔ کہ ۹ رمضان کا دن گزار کر شب کو وفات ہوئی۔ ۱۰ کی شام کو اس کی اطلاع لکڑھاروں کے ذریعہ کرنال پہنچی۔ ۱۱ کی صبح کو کرنال کے حضرات بوڑھ کھیرہ پہنچے اور شام تک جنازہ کو کرنال لائے۔ اب تک یہ خبر کرنال ہی تک محدود تھی مگر کرنال کے حضرات نے رات گزار کر جیسے ہی صبح کو غسل دینا شروع کیا۔ پانی پت کے حضرات پہنچ گئے۔

سوال یہ ہے کہ جب خبر پہنچنا ممکن نہیں تھا۔ اور جس قدر ممکن تھا اس کا کوئی اہتمام بھی نہیں کیا گیا تھا۔ تو یہ کیسے ہوا کہ شام سے لیکر صبح تک صرف رات میں پانی پت خبر پہنچ گئی۔ اور نہ صرف خبر پہنچی، بلکہ وہاں کے حضرات چل بھی دیئے اور صبح کے وقت کرنال پہنچ بھی گئے۔ اُس زمانہ کے ذرائع کے لحاظ سے یہ سوال نہایت اہم ہے۔ اور غالباً یہی وجہ ہے کہ یہ یقین کر لیا گیا کہ کرنال سے پانی پت خبر پہنچانے کا ذریعہ "الہامی" تھا۔

چنانچہ محمد بن احمد صاحب نے شرف المناقب میں اور عبد السلام صاحب



چشتی صابری نے اپنے "جوابی" رسالہ میں تحریر کیا ہے کہ مولانا سراج الدین صاحب کی جو پانی پت کے اولیاء اللہ میں سے تھے۔ اور حضرت قلندر صاحب سے خالص تعلق رکھتے تھے۔ آپ نے ایسی حالت میں جس کو نہ نیند کہہ سکتے ہیں نہ بیداری۔ (اور باصطلاح صوفیاء کرام "معاملہ") میں دیکھا کہ حضرت قلندر صاحب فرما رہے ہیں۔

"مولانا جلد تشریف لائے۔ میں اس دار فانی سے رخصت ہو چکا ہوں۔

میری نعش کو پانی پت لے آئے اور میرے نام کا جو قبہ بنا ہوا ہے۔ وہاں

دفن کر دیئے۔"

چنانچہ مولانا سراج الدین صاحب کی جیسے ہی آنکھ کھلی۔ آپ نے حضرت قلندر صاحب کے برادر زادہ شیخ احمد صاحب اور پانی پت کے مہاجر اور انصاری خاندانوں کے سربراہ اور وہ حضرات کو جمع کیا۔ اور ان کے سامنے اپنے کشف کی وضاحت کی۔ سب حضرات نے فوراً سامان سفر تیار کیا۔ اور کرنال روانہ ہو گئے۔ اور ایک پہر دن گذرا تھا۔ یعنی طلوع آفتاب سے تقریباً ایک گھنٹہ بعد یہ لوگ کرنال پہنچ گئے۔

ان جانے والوں میں ایک تو وہی بزرگ مولانا سراج الدین صاحب تھے جن کو یہ مکاشفہ ہوا تھا۔ دوسرے حضرت قلندر صاحب کے برادر زادے شیخ احمد تھے جو "زندہ پیر" کے نام سے مشہور تھے۔ اور ان کے علاوہ پانی پت کے مہاجر اور انصاری خاندانوں کے سربراہ اور وہ بزرگ تھے۔

مزار تشریف کہاں ہے

اس مضمون کے مطالعہ کرنے والے حضرات کو اس میں تردد نہیں ہوگا۔ کہ حضرت قلندر صاحب کا مزار پانی پت میں ہے۔ گران کو تعجب ہوگا کہ قلندر

صاحب کا مزار "کرنال" میں بھی ہے۔ اب یہ بحث پیدا ہوتی ہے کہ اصل مزار کونسا ہے۔ پانی پت والا۔۔۔ یا کرنال والا۔۔۔!

صاحب تحقیق مصنفین صرف ایک ہی بات لکھتے ہیں کہ:-

"روضہ اودر پانی پت سرت" (اجارا الاخیار وغیرہ)

اب یہ کرنال میں جو عظیم الشان عمارت قلندر صاحب کے نام سے مشہور ہے اس کی حقیقت کیا ہے۔ تو عبد السلام صاحب چشتی صابری اس کی حقیقت یہ بیان فرماتے ہیں:-

"پس خانقاہ واقع کرنال شاید نشستگاہ حضرت عالم جناب مسمی مثل بوڈھ کھڑہ و باگیوتی وغیرہ۔"

کسی زمانہ میں کسی شخص نے بغرض اعتقاد انھیں روایات غیر صحیحہ پر نظر کر کے صورت مزار تجویز کرادی۔ جیسا زمانہ حال میں بجائے جو ترہ قدیم نشستگاہ حضرت واقعہ (بوڈھ کھڑہ) قبر بنائی گئی۔ حالانکہ پیشتر سے نہ تھی لیکن فیض رومی شرف الدین کا کل سوا فتح اقامت میں جاری ہے۔

عبد السلام صاحب چشتی صابری کا یہ سادہ بیان بظاہر صحیح ہے۔ مگر رنگین طبع سوانح نگار یہ سادگی کب برواشرت کر سکتے تھے۔ ان کی گلکاری ملاحظہ فرمائیے صاحب شرف المناقب کے بیان کا ترجمہ یہ ہے:-

طویل بحث ہوئی کہ جنازہ کرنال میں دفن کیا جائے یا پانی پت لے جایا جائے۔ مولانا سراج الدین صاحب نے جب دیکھا کہ ہر دو فرقہ اپنی اپنی بات کی توجیح کر رہے ہیں تو آپ نے فرمایا۔

"یاران طرفین رجوع بحضرت نمائند۔ آنچه مرضی مبارک حضرت باشد بعمل بآرید۔" (دونوں طرف کے دوست حضرت قلندر صاحب کی طرف رجوع

کریں۔ جو کچھ مرضی مبارک ہوگی اس پر عمل کریں۔
فریقین نے مولانا سراج الدین صاحب کی یہ بات تسلیم کر لی۔ سر دست نزاع
ملتوی ہو گیا۔

دن گذر گیا۔ رات آئی۔ تو دونوں فریق جنازہ کے گرد اگرد بٹھ گئے۔ اور درود
اور قل پڑھنے لگے۔ اس وقت مولانا سراج الدین صاحب نے فرمایا۔

حضرت قلندر صاحب! فرمائیے کیا مرضی ہے۔ مزار پانی پت میں بنے یا
کرناں میں؟ بہت دیر ہو گئی کوئی بات نہیں کھلی۔ ٹھیک آدھی رات کا وقت تھا۔
کہ حاضرین میں سے ہر شخص نے محسوس کیا کہ حضرت قلندر صاحب فرما رہے ہیں۔

دونوں شہر ہماری ولایت کے ماتحت ہیں۔ اس فقیر کا دونوں شہروں میں

روزانہ گذر ہوتا ہے۔ بس آپ لوگ پریشان نہ ہوں۔

”نہا میں جا رہا ہوں۔ پانی پت حاضر م۔“

اس کے بعد قلندر صاحب نے فرمایا:۔ کہ مولانا سراج الدین صاحب جو ہدایت فرمائیں

اس پر عمل کیا جائے۔

اب دونوں فریق مولانا سراج الدین صاحب کی طرف متوجہ ہوئے۔ مولانا
نے فرمایا کہ صبح کے وقت مولانا کے جنازہ پر مالکورا کی راگنی قوال گائیں (یہ راگنی
حضرت قلندر صاحب کو بہت پسند تھی) جب قوال یہ راگنی شروع کر دیں تو دونوں
فریق یکے بعد دیگرے حضرت قلندر صاحب کا جنازہ اٹھائیں۔ جس فریق کے آدمی جنازہ
کو اٹھا سکیں وہی اپنے یہاں لے جائیں اور دفن کر دیں۔

بہر حال مولانا نے یہ بھی فرمایا کہ راگنی کے وقت اگر جنازہ کو حرکت ہو تو ہم
پانی پت والے جنازہ اٹھائیں گے۔ اور اگر حرکت نہ ہو تو آپ لوگ یعنی کرناں والے
جنازہ اٹھائیں۔

صبح ہوئی تو مولانا سراج الدین صاحب کی ہدایت کے بموجب قوالوں نے
 راگنی شروع کی۔ اس وقت جنازہ پر اکثر اولیاء بزرگ اور چھوٹے بڑے عوام موجود تھے۔
 راگنی میں گرمی آئی۔ تو دفعۃً حضرت قلندر صاحب کا دست مبارک کفن سے باہر آگیا۔
 اور اوپر کواٹھ گیا۔ اور بدن میں بھی حرکت ہوئی۔ مولانا سراج الدین صاحب نے
 بسبب پاس شریعت قوالوں کو فوراً روک دیا (۹) جب قوال خاموش ہوئے تو
 مولانا نے کرنال والوں سے کہا جنازہ اٹھائیے۔ ان لوگوں نے ہر چند جنازہ اٹھانا
 چاہا جنازہ نہ اٹھ سکا۔ آخر کار کرنال والوں نے خود ہی پانی پت والوں سے کہا۔
 کہ اب آپ اٹھائیے۔ چنانچہ پانی پت والوں نے جیسے ہی بسم اللہ الرحمن الرحیم
 کہہ کر جنازہ کو ہاتھ لگایا۔ جنازہ فوراً اٹھ گیا۔ اب پانی پت والے مطمئن ہوئے۔
 جنازہ کو تابوت میں رکھا۔ اور روانہ ہو گئے۔ شام تک پانی پت پہنچے اور ۱۴
 رمضان المبارک پچیسبہ اور جمعہ کی ڈرمیانی شب میں بعد نماز مغرب جنازہ کو
 دفن کر دیا۔

صاحب شرف المناقب فرماتے ہیں کہ اس کی تصدیق کہ حضرت کا جنازہ
 پانی پت ہی میں دفن ہوا ہے اس سے بھی ہوتی ہے کہ اکثر اولیاء اللہ نے یہی
 تحریر فرمایا ہے۔

چنانچہ سید محمود گیسو دراز گلبرگی۔ سید عبداللہ دکنی۔ شیخ عبدالحق دکنی۔
 شیخ امان پانی پتی۔ میر مودود لاری۔ شیخ عبدالرزاق جھنجالی۔ شیخ عبدالقدوس
 گنگوہی۔ شیخ دو جن جیندوی۔ شیخ موسیٰ رامپوری۔ شیخ محمد شریف اعظم آبادی نیادلی۔
 شیخ عبدالرسول انبالوی۔ شیخ محمد نظام لمبھی۔ مخدوم شیخ جلال الدین پانی پتی شیخ بدہ۔
 اور شیخ محمد عثمان پانی پتی وغیرہ جیسے حلیل القدر اولیاء اللہ اور صاحب سلسلہ
 مشائخ نے یہی تحریر فرمایا ہے۔ اور اسی کو صحیح قرار دیا ہے۔ کہ مزار مبارک پانی پت میں۔

جہاں تک ہمارے مطالعہ کی وسعت
 ہے صرف شرف المناقب کو یہ شرف
 حاصل ہے کہ اُس نے آپ کا خطاب "قتال" بھی بتایا ہے جس کے معنی ہیں۔
 بہت قتل کرنے والا۔

یہ خطاب۔ ایک رحم پرور عاشق مزاج بزرگ کے لئے عجیب و غریب ہے
 اور اس سے زیادہ عجیب وہ افسانہ ہے جس کو اس خطاب کی وجہ اور بنیاد بتایا
 گیا ہے۔

مولانا ضیاء الدین صاحب سنائی کے سات لڑکوں کی شہادت جو بڑا پوتا
 شرف المناقب حضرت قلندر صاحب کی شانِ جلالی کا کرشمہ تھی وہ بھی اس خطاب
 کی وجہ بن سکتی تھی۔ مگر مصنف شرف المناقب کی اعجوبہ پسند طبیعت صرف سات
 کی شہادت پر قناعت پذیر نہیں ہے۔ وہ ایک برات کے جم غفیر کی ہلاکت کو
 اس خطاب کی وجہ گردانتی ہے۔

افسانہ ملاحظہ فرمائیے:-

مصنف شرف المناقب فرماتے ہیں۔ کہ کبھی کبھی حضرت قلندر صاحب پر
 استغراق کی ایسی کیفیت بھی طاری ہوتی تھی کہ چڑیا کی چپک بھی ناگوار ہو جاتی
 تھی۔ اس وقت جس پر بھی نظر تھڑچاتی وہ بھسم ہو جاتا تھا۔ چنانچہ ایک مرتبہ
 آپ پانی پت کے قریب "موضع باگھوتی" میں قیام فرماتے تھے۔ اور اسی کیفیت کی
 غلبہ تھا۔ کہ ایک پوری بارات نظر تھڑکا شکار ہو گئی۔ صورت یہ ہوئی کہ بارات کے
 ڈھول تاشے آپ کو ناگوار ہوئے۔ اسی ناگواری کی حالت میں اس بارات پر نظر پڑ
 گئی۔ دفعۃً پوری بارات غائب ہو گئی۔ خانہ عروس پر بارات کا انتظار رہور ہا تھا۔
 جب وقت پر بارات نہیں پہنچی تو اول انتظار کیا گیا اور جب مایوسی ہونے لگی تو

بارات کی تلاش شروع کی گئی۔ مگر دوپہن کے مکان سے لیکر دوپہا کے عشرت کدہ تک ایک ایک کونہ چھان مارا کہیں سران نہ لگا۔ آخر کار کسی صاحبِ دل نے ایک بزرگ کا ہتہ بتایا کہ ان کے ذریعہ شاید بارات کا کچھ پتہ، نشان مل سکے۔ یہ تلاش کرتے والے ان کے پاس پہنچے۔ بزرگ نے پورا ماجرا سنا۔ تو ان کا دل بھرا آیا۔ آپ نے درو بھرے انداز میں حضرت قلندر صاحب کا نام لیا۔ کہ ان کے پاس پہنچو۔ امید ہے کہ یہ عقدہ وہاں حل ہو جائے گا۔

مگر اس کا خیال رہے کہ صبح سے لیکر وقت زوال تک ہرگز ہرگز قلندر صاحب کے پاس نہ جانا کہ وہ وقت خاص روحانی مشغولیت کا ہوتا ہے۔ بہر حال بارات کے آدمی حضرت قلندر صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے شام کا وقت تھا۔ تقریباً ایک گھڑی دن باقی تھا۔ حضرت قلندر صاحب تالاب کے کنارہ پر بیٹھے ہوئے تھے اور پانی سے کھیل رہے تھے۔ یہ لوگ وہاں پہنچے تو ایک کنارہ پر دست بستہ کھڑے ہو گئے۔ حضرت قلندر صاحب کی نظر ان پر پڑی تو فرمایا کیسے کھڑے ہو؟ ان غریبوں نے اپنا تمام ماجرا سنایا۔ قلندر صاحب نے فرمایا:-

”اللہ کی نذر اور اس فقیر کی نیاز قبول کرو تو صاحب کن فیکون کے حکم سے وہ

برات واپس آجائے گی۔“

ان لوگوں نے عرض کیا کہ حضور کا جو حکم ہو تعمیل کی جائے گی چنانچہ قلندر صاحب کا ارشاد ہوا کہ طعام سہ منی (تین من کھانا) نذر خدا تعالیٰ اور نیاز اس فقیر قبول کیجئے۔

جب ان لوگوں نے یہ نذر مان لی تو حضرت قلندر صاحب نے فرمایا:- کہ آنکھیں بند کر لو۔ پھر حکم ہوا آنکھیں کھولو۔ اب ان سائبین نے آنکھیں کھولیں

تو دیکھا تمام بارات موجود ہے۔ خوش و خرم گانے بجانے میں مصروف ہے۔ اب بارات منزل کی طرف چلی۔ نکاح وغیرہ دسے فراغت کے بعد حضرت قلندر صاحب کی خدمت میں نذر و نیاز پیش کرنے کے لئے آئے تو ایک من گوشت کی تخی۔ ایک من میدہ کی روٹی (پرانتھے) ایک من وہی مصالحو ڈال کر حضرت قلندر صاحب کی نذر کئے۔ قلندر صاحب نے نذر قبول فرمائی اور فرمایا:-

”میرے وصال کے بعد جس کو بھی کوئی ایسی دشواری اور پریشانی لاحق ہو۔

وہ اسی طرح تین منی کھانا حلال کمائی کا سچے دل اور پورے اخلاص سے

تیار کر کے اللہ کی نیاز اور اس فقیر کی نذر کے طور پر خانقاہ کے متوسلین

اور مساکین میں تقسیم کر دے۔ مراد پوری ہو جائے گی۔“

نذر و نیاز حاصل کرنے کی اس ترکیب کو تحریر کرنے کے بعد صاحب

شرف المناقب فرماتے ہیں:-

اکثر بزرگانِ معتبر گفتہ اند کہ بسبب ہمیں واقعہ بارات نام حضرت شاہ شرف الدین

قال مشہور شد۔

بہر حال یہ خطاب اور وجہ خطاب کے طور پر یہ واقعہ صاحب شرف المناقب کی تصنیف ہے۔ اس طرح کے اور کئی واقعات شرف المناقب میں خوارق اور مناقب کے عنوان سے نقل کئے گئے ہیں ہم ان کے ذکر کرنے کے بجائے ان کا جذبہ کر دینا ہی ضروری سمجھتے ہیں۔ کیونکہ نذر و نیاز کے ان افسانوں کی شہادت یہ ہے کہ یہ افسانے ان کی تصنیف ہیں۔ جن کے مفادات ان مزارات سے وابستہ ہو گئے تھے۔ اور یہی وجہ ہے کہ بڑی بڑی درگاہوں میں جہاں بھی آپ جائیں مجاور صاحبان صاحب مزار کے مناقب و محامد پر اسی قسم کے قصے بیان فرماتے ہیں:-

۶۰۲ء سے ۷۲۲ء
یعنی ساتویں صدی

ہم عصر اصحاب کمال اور حضرت قلندر صاحب

اور آٹھویں صدی کا پہلا ربع۔ یعنی حضرت قلندر صاحب کا زمانہ حیات مسلمانان ہند کی تاریخ میں وہ سنہری دور ہے کہ وہ جلیل القدر علماء اور مشائخ جن کی محبت و عقیدت سے ہندی مسلمانوں کے دل بے نیاز اور گرو نہیں ان کے احترام میں خم ہیں وہ زیادہ تر اسی صدی میں جلدیہ افروز ہوئے ہیں۔ ان کا تذکرہ اگرچہ سرمایہ سعادت ہے۔ مگر اس سلسلہ مضمون کا موضوع صرف حضرت قلندر صاحب کے حالات تک محدود ہے۔ ان بزرگوں کی مقدس سوانح حیات کی گنجائش اس مضمون میں نہیں ہے۔ بلکہ یہاں صرف وہ واقعات لکھے جاتے ہیں جو حضرت قلندر صاحب کی طرف منسوب ہیں۔ اور جن کا تعلق اس زمانہ کے اکابر اور ارباب کمال میں سے کسی سے ہے۔

حضرت خواجہ علاؤ الدین علی احمد
صابر کلیری۔ ہندوستان کے
اکابر اولیاء اللہ میں سے ہیں۔
حضرت خواجہ شکر گنج فرید الدین
اجودھنی کے ممتاز خلیفہ۔ جو
خواہ زادگی اور دامادی کا رشتہ

حضرت خواجہ علاؤ الدین علی احمد صابر
کلیری حضرت خواجہ شمس الدین ترک
پانی پتی۔ اور مخدوم المشائخ جلال الدین
کبیر الاولیاء

بھی رکھتے تھے۔ جن کے متعلق حضرت خواجہ شکر گنج فرمایا کرتے تھے کہ میرے دل کا علم علی احمد صابر کو ملا ہے۔ اور سینہ کا علم شیخ نظام الدین بدایونی کو۔
سلسلہ صابریہ۔ آپ ہی کے فیوض کا پرتو ہے۔ آپ کے اکابر خلفاء میں
حضرت شمس کے جلیل القدر خلیفہ حضرت مخدوم جلال الدین کبیر الاولیاء پانی پتی

رحمۃ اللہ علیہ ہیں۔

حضرت شیخ شمس الدین ترک پانی پت کے اصل باشندے نہیں تھے۔ آپ ترکستان سے ہندوستان آئے اور حضرت خواجہ صابر کلیری کے دامن سے وابستہ ہو گئے۔ پھر یہاں تک تقرب حاصل کیا۔ کہ خطاب "فرزند" سے سرفراز ہوئے۔ ان اکابر نے رشد و ہدایت کے کچھ مرکز مقرر کر رکھے تھے۔ جن کو "ولایت" کہا کرتے تھے۔ چنانچہ حضرت خواجہ کلیری جب اپنی حیات طیبہ کے آخری ایام میں سلسلہ رشد و ہدایت کے جاری رکھنے کے متعلق مریدین با اخلاص کو خاص خاص ہدایتیں فرما رہے تھے۔ تو اس مرید صادق اور فرزند روحانی (حضرت شیخ شمس الدین ترک) کو خرقہ خلافت اور تبرکات مشائخ عطا فرمانے کے ساتھ یہ ہدایت فرمائی۔ کہ میری وفات کے بعد تین دن گزار کر آپ پانی پت چلے جائیں۔

اس مرید با اخلاص نے عرض کیا کہ "ولایت پانی پت" حضرت شیخ بوعلی قلندر کے سپرد ہے۔ ارشاد ہوا قلندر صاحب کی ولایت ختم ہو رہی ہے تم وہاں پہنچ جاؤ گے تو وہ شہر سے باہر اپنا ڈیرہ ڈال لیں گے۔

یہیں سے حضرت قلندر صاحب کی سوانح حیات کے ساتھ ان بزرگوں کے حالات کا جوڑ لگتا ہے۔ اب اصل واقعہ تو یہ ہے کہ حضرت خواجہ کلیری کی وفات کے بعد جب حضرت شمس پانی پت پہنچے تو جیسا کہ شیخ کلیر نے فرمایا تھا۔ حضرت قلندر صاحب پانی پت سے روانہ ہو کر ایک قریہ میں پہنچ گئے جس کا نام "باگہوئی" تھا۔ اس واقعہ سے جس کی صحت کا انکار نہیں کیا جاسکتا حضرت قلندر صاحب کی حیات مقدسہ کے چند پہلو سامنے آتے ہیں۔ مثلاً:-

۱۔ مشائخ طریقت نے ارشاد و تبلیغ کا جو نظام قائم کر رکھا تھا۔ آپ اس کے وابستہ تھے۔

۲۔ دہلی سے آپ کی روانگی بتقاضا رجب نہیں ہوئی۔ بلکہ جس طرح دہلی میں آپ کا قیام ایک ضبط و نظم کے ساتھ تھا۔ کہ اول دہلی کے مرکزی مقام مسجد "قوت الاسلام" میں ذمہ داری کے ساتھ فرائض درس و تدریس انجام دیتے رہے۔ پھر منصب قضا سنبھالنا تو اس کو کبھی اسی نختگی سے انجام دیا۔ ایسے ہی ان علوم ظاہری اور شاہی تعلقات سے کنارہ کش ہونے کے بعد ارشاد و تبلیغ اور روحانی تربیت کے میدان میں قدم رکھا تو وہ بھی ایک نظام میں منسلک ہو کر سوچی سمجھی تدبیر کی طرح ضبط و نظم کے ساتھ تھا۔ مجذوبانہ اقدام نہیں تھا۔

۳۔ حضرت خواجہ کلیریؒ یعنی مرکز پانی پت کے ذمہ دار اعلیٰ آپ کے حالات سے واقف رہتے تھے۔ ایک طرف حضرت قلندر صاحبؒ کے سن اور عمر کا تقاضا تھا۔ دوسری جانب جذب و استخراق کی کیفیت روز افزوں تھی۔ اور اس بنا پر حضرت خواجہ کلیریؒ سمجھ چکے تھے کہ ارشاد و تبلیغ کی ذمہ داری اب قلندر صاحبؒ نہیں سنبھال سکیں گے۔ لہذا آپ نے حضرت شمسؒ کو مامور فرما دیا۔

۴۔ حضرت قلندر صاحبؒ کو اپنی حالت کا خود اندازہ تھا۔ وہ اب شہری زندگی سے بھی اکتا چکے تھے۔ داعی جذب ان کو تنہا مقام کی طرف کشاں کشاں لے جا رہا تھا۔ چنانچہ جیسے ہی حضرت شمس پانی پت پہنچے۔ قلندر صاحب شہر پانی پت کو چھوڑ کر گاؤں میں چلے گئے۔ کچھ دنوں بعد قلندر انہ جذب نے اور ترقی کی تو اس چھوٹی سی آبادی کو بھی چھوڑ کر جنگل میں چلے گئے۔ جو موضع "بڈھ کھیری" کے قریب تھا۔

۵۔ چونکہ آپ مشائخ چشتیت کے نظام ارشاد و تبلیغ میں منسلک تھے۔ اس بنا پر آپ کا سلسلہ بیعت بھی نظام کے ذمہ داروں سے جوڑ دیا گیا۔ یہاں

تک کہ صاحب معارج الولايت نے لکھ دیا کہ آپ حضرت خواجہ قطب الدین بختیار
کاکلی کے خلیفہ ہیں۔ حالانکہ قطب صاحب قلندر صاحب کے دہلی رونق افروز ہونے
سے بھی دس گیارہ سال پہلے ۶۳۳ھ یا ۶۳۴ھ میں وفات پا چکے تھے۔ اسی
طرح کسی نے یہ بھی کہہ دیا کہ آپ حضرت سلطان المشائخ محبوب الہی رحمۃ اللہ علیہ
کے خلیفہ ہیں (خزنیۃ الاصفیاء) حالانکہ سلطان المشائخ کا تعلق حضرت قلندر
صاحب سے ارادتمندانہ تھا مرشدانہ نہیں تھا۔ جیسا کہ آئندہ روایت سے معلوم ہوگا۔

حضرت خواجہ شمس الدین ترک اور قلندر صاحب ^{رح} | مولانا غلام سرور
صاحب خزنیۃ الاصفیاء

میں تحریر فرماتے ہیں:-

"حضرت خواجہ شمس الدین ترک جب پانی پت پہنچے ایک دیوار کے سایہ میں بیٹھ
گئے۔ حضرت قلندر صاحب کو نور باطن سے آپ کی تشریف آوری کا علم ہو گیا۔
تو آپ فوراً اپنے حجرہ سے نکلے اور روانہ ہونے لگے۔ ایک حلوائی کا لڑکا جو خادم
خاص اور قلندر صاحب سے بے تکلف تھا۔ اس نے دریافت کیا۔ آپ
کہاں تشریف لے جا رہے ہیں۔ قلندر صاحب نے جواب دیا کہ یہ "ولایت"
ایک دوسرے صاحب کے سپرد کر دی گئی۔ وہ صاحب تشریف لے آئے ہیں
میں ان سے ملنے جا رہا ہوں۔"

حلوائی کے لڑکے نے کہا ان کی زیارت مجھے بھی کرا دیجئے۔

فرمایا فلاں محلہ میں جاؤ وہاں ایک صاحب دیوار کے سایہ میں بیٹھے

ہوئے ملیں گے۔ قلندرانہ وضع ہے اور لباس چرمی پہنے ہوئے ہیں۔

حلوائی کا لڑکا وہاں پہنچا۔ اور زیارت سے مشرف ہوا۔

غالباً حضرت قلندر صاحب نے حلوائی کے ملاقات کی۔ بہر حال ملاقات کے بعد

قلندر صاحب حضرت شمس کو اپنے حجرہ میں لائے۔ اور وہیں آپ کا قیام کرایا۔

کیا حضرت خواجہ کلیری پانی پت تشریف لائے؟ | صحیح روایتوں سے یہ ثابت

ہے کہ حضرت خواجہ شمس الدین ترک، حضرت خواجہ کلیری کی خدمت میں کلیر تشریف رہا کرتے تھے۔ وفات کے وقت تک وہیں رہے اور وفات کے بعد اپنے شیخ و مرشد کے حکم کے مطابق پانی پت تشریف لے گئے۔ مگر صاحب شرف المناقب کا بیان یہ ہے:-

حضرت خواجہ علاؤ الدین علی احمد صاحب کلیری۔ کلیر سے حضرت خواجہ قطب الدین کاکی رحمۃ اللہ علیہ کے مزار شریف پر فاتحہ پڑھنے کے لئے دہلی جا رہے تھے تو آپ پانی پت بھی رونق افروز ہوئے۔ پانی پت کے تمام اہل اللہ اور اہل علم آپ سے ملاقات کے لئے گئے۔ مگر قلندر صاحب نہیں تشریف لے گئے۔ حضرت خواجہ کلیری نے حضرت شمس الدین ترک رحمۃ اللہ علیہ کو طلب فرما کر ارشاد فرمایا:-

”تم پانی پت میں رہو۔ یہ تمہارا قیام گاہ اور یہیں تمہاری آخری خواب گاہ ہوگی۔“

جب یہ خبر حضرت قلندر صاحب کو پہنچی تو آپ نے فرمایا۔ بہت بہتر ہوا۔ بھائی شمس الدین یہاں مستقل قیام کریں گے۔ پھر آپ نے حضرت جلال الدین صاحب سے فرمایا۔ بھائی شمس الدین صاحب کے پاس جاؤ میری دعا ران کو پہنچا دو۔ اور کہہ دو کہ ہم بھی تمہارے منتظر تھے۔

مگر لفظا صحیح روایت وہی ہے جو پہلے بیان کی گئی کہ حضرت ترک حضرت مخدوم کلیری رحمہما اللہ کی خدمت میں آخر تک رہے اور وفات کے بعد پانی پت تشریف لائے۔ یعنی حضرت خواجہ کلیری پانی پت تشریف نہیں لائے۔

پھر یہ بات بھی بعید از قیاس ہے کہ حضرت خواجہ "صابر" نے کلیر سے وہلی جانے کے لئے سیدھا راستہ چھوڑ کر پانی پیت پہنچنے کی زحمت کیوں اٹھائی۔ بہر حال ہمارا خیال یہ ہے کہ شرف المناقب کی یہ روایت ان لوگوں کی تصنیف ہے جو صرف یہ چاہتے ہیں کہ حضرت قلندر صاحب کا درجہ تمام بزرگوں سے بلند مانا جائے۔ چنانچہ اس روایت کے بعد تحریر فرماتے ہیں:-

حضرت شمس الدین ترک رحمۃ اللہ علیہ نے ایک پیالہ میں پانی بھرا۔ اور حضرت مخدوم جلال الدین سے فرمایا۔ یہ پیالہ حضرت قلندر صاحب کے پاس لیجاؤ۔ جب شیخ جلال الدین نے یہ پیالہ قلندر صاحب کی خدمت میں پیش کیا تو آپ نے اس پیالہ میں گلاب کا پھول ڈال دیا۔ اور حضرت شیخ جلال الدین صاحب سے فرمایا کہ اس کو بھائی شمس الدین صاحب کے پاس لے جاؤ۔ اور کہو۔ کہ کوئی پھول اس کی برابر نہیں ہے۔ پھر آپ نے شیخ جلال الدین صاحب سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا۔ شمس الدین ترک سے کہو۔ نقارہ قلندری چاروانگ عالم میں بج رہا ہے۔ فلک الافلاک پر بج رہا ہے۔ آپ ایک کنارہ پر ہیں ہم دوسرے کنارہ پر۔ آپ کی تشریف آوری سے اس لئے مسرت ہے کہ یہاں آبادی میں پاسبان کی ضرورت تھی۔ لے برادر شمس الدین۔! اولیاء اللہ سب ایک ہیں۔ البتہ مراتب کا فرق ہے۔

اور صاحب شرف المناقب تحریر فرماتے ہیں:-

آن عاشق الہی (قلندر صاحب) را خطاب بخشی الاولیاء از جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عنایت شدہ و از جناب علی رضی اللہ عنہ بلا واسطہ فیض یافتہ واللہ اعلم بالصواب۔

مخدوم المشائخ جلال الدین کبیر الاولیاء | یہ پانی پت کے باشندے
تھے اصل نام محمد والد صاحب

کاسم گرامی محمود عثمانی خاندان، پیر روشن ضمیر، حضرت شیخ شمس الدین ترک رحمۃ اللہ
علیہ نے خطاب جلال الدین سے نوازا۔ ارادتمندوں نے مخدوم اور کبیر الاولیاء کے
القاب کا بھی اضافہ کر دیا۔ پانی پت میں آپ کے لئے صرف مخدوم صاحب کا لفظ
استعمال ہوتا ہے ۱۹۲۶ء میں خالقاہ اور مسجد پر غیر مسلموں کا قبضہ ہو گیا تھا۔
حضرت مولانا تقار اللہ صاحب عثمانی کی استقامت نے واگذار کرا کر پھر آباؤ کیا۔
اب مخدوم صاحب کی یہ درگاہ دینی تعلیم گاہ ہے۔

حضرت مخدوم کو حضرت قلندر صاحب سے محبت و عقیدت تھی۔ آپ نے
حضرت قلندر صاحب سے بیعت کی درخواست کی۔ مگر قلندر صاحب نے فرمایا۔
"آپ کا حصہ دوسرے کے یہاں ہے انھیں سے بیعت ہونا۔"

ایک روز ایسا ہوا کہ حضرت شیخ جلال الدین صاحب عمدہ لباس پہن کر
گھوڑے پر سوار کہیں جا رہے تھے۔ راستہ میں کسی جگہ حضرت قلندر صاحب بھی
تشریف فرما تھے۔ ان کی نظر گھوڑے پر اور اس سوار پر پڑی۔
آپ نے فرمایا:۔ جلال الدین گھوڑا دوڑاؤ۔ شیخ جلال الدین صاحب
نے گھوڑا دوڑایا۔ تب آپ کی زبان مبارک سے یہ الفاظ صادر ہوئے۔ زہے
اسپا وزہے سوار۔ پھر یہ شعر پڑھا۔

گلگلوں لباس کرو، و سوار سمند شد

یاراں حذر کنید کہ آتش بلند شد

حضرت قلندر صاحب کے ان اتفاقیہ فقروں کا شیخ جلال الدین صاحب

پر بہت اثر ہوا۔ اب تک قلندر صاحب سے محض محبت ہی تھی۔ اور آج یہ عالم

ہوا کہ "ہرچیز از دنیا بدست داشتند ازال بیرون آمد و آن اسپ را نیز لبت
بکسے و ادوراه صحر گرفت ۔"

ترجمہ :- دنیا کا جو مال و متاع بھی ان کی ملکیت میں تھا۔ سب سے دامن جھاڑ لیا

اور اس گھوڑے کو بھی راہِ خدا میں کسی کو دے دیا اور خیل کا راستہ لیا ۔

کچھ عرصہ بعد وہ وقت آیا کہ حضرت شیخ شمس الدین ترک پانی پت تشریف لائے

تو حضرت قلندر صاحب نے بھی حضرت مخدوم جلال الدین رحمۃ اللہ علیہ کو ہدایت

فرمائی کہ حضرت ترک کی خدمت میں حاضر ہوں۔ اور ان کے چشمہ فیض سے اپنا

حصہ حاصل کریں۔

سیدھی سی بات ہے کہ حضرت خواجہ صابر کلیری رحمۃ اللہ

علیہ کو حضرت قلندر صاحب کی حالت کا احساس ہوا کہ

شوق اختراع

وہ اب تبلیغ و ارشاد کا فرض انجام نہیں دے سکتے تو آپ نے اس مرکز کے لئے

حضرت خواجہ شمس الدین ترک کو مامور فرمایا۔ اور جیسے ہی حضرت ترک پانی پت

پہنچے تو حضرت قلندر صاحب نے اطمینان و مسرت کا اظہار فرمایا۔ خود صاحب

شرف المناقب کی روایت ہے کہ حضرت ترک کے اس تقرار اور تعیناتی کی خبر

حضرت قلندر صاحب کو پہنچی۔ تو

آپ نے فرمایا :-

الحمد للہ براور شمس الدین ایجا مستقیم شد خوب شد۔

(خدا کا شکر۔ بھائی شمس الدین صاحب یہاں منتقل ہو گئے ایجا ہوا۔)

پھر فرمایا :-

دطن سن بے پاسبان بود۔ مخدوم علی احمد صابر شماراوریں جا پاسبان گذشت

(میرے وطن کا کوئی پاسبان نہیں تھا۔ مخدوم علی احمد صابر نے آپ کو اس جگہ پاسبان مقرر کیا)

اب خود حضرت قلندر صاحب کے احساس کا تقاضا تھا کہ وہ اس مرکز کو حضرت خواجہ ترک کے لئے خالی کر دیں۔ چنانچہ آپ نے ایسا ہی کیا۔ حضرت ترک کو بلا کر اپنے حجرہ میں مقیم کیا اور خود "باگہوتی" تشریف لے گئے۔

مگر سوانح نگاروں کا ذوق اختراع ملاحظہ ہو۔ کہ اس واقعہ کو کس طرح افسانوی رنگ و بگاڑ دیا۔ عجوبہ بنا لیا ہے۔ تعجب ہے ان کو اس عجوبہ پسندی میں اس کا خیال بھی نہیں رہتا۔ کہ کسی بزرگ کو شیر یا بھیرے کی شکل میں پیش کرنا اس کی تعظیم و احترام نہیں ہے، بلکہ توہین ہے۔ کیونکہ درندے تو کیا فرشتے بھی انسانوں سے افضل نہیں ہیں۔ تو جو صاحب تصوف اکابر اولیاء اللہ شرف السانیت سے واقف ہیں وہ کب برواشرت کر سکتے ہیں۔ کہ جامہ انسانیت کو چھوڑ کر شیر کی شکل میں نمودار ہوں۔ لیکن مصنف شرف المناقب کی عجوبہ پسندی بلکہ عجائب پرستی ملاحظہ ہو۔ تحریر فرماتے ہیں۔

ایک روز حضرت مخدوم جلال الدین کہیں تشریف لے جا رہے تھے۔ راستہ میں حضرت قلندر صاحب کا قیام گاہ پڑتا تھا۔ مخدوم صاحب جب وہاں پہنچے تو دیکھا کہ قلندر صاحب کی جگہ ایک شیر بیٹھا ہوا ہے۔ مخدوم صاحب کچھ دیر بہت زدہ حیران کھڑے رہے۔ پھر آپ نے فرمایا۔ اے شیر یہ جگہ شیروں کی نہیں ہے۔ شیر کو جنگل میں رہنا چاہیے۔ یہ عاشقوں کی جگہ ہے۔ مخدوم صاحب نے جیسے ہی یہ فرمایا شیر اٹھا اور اس نے جنگل کی راہ لی۔ حضرت مخدوم صاحب بھی شیر کے پیچھے روانہ ہو گئے۔ یہاں تک کہ یہ شیر "باگہوتی" پہنچ گیا۔ مخدوم صاحب کچھ فاصلہ پر کھڑے ہوئے شیر کی حرکتیں دیکھ رہے تھے۔ دفعۃً چار شیر اور نمودار ہوئے۔ اور آپس میں کھیلنے لگے۔ مخدوم صاحب کی حیرانی اور بے رحمی۔ یہ یہاں کھڑے ہوئے شیروں کا تماشہ دیکھ رہے

تھے کہ ناگاہ حضرت قلندر صاحب سامنے آگئے۔ مخدوم صاحب نے سلام کیا۔ قلندر صاحب نے سلام کا جواب دیتے ہوئے فرمایا۔ میاں جلال الدین تم ہمارے محرم کار اور رازوں سے واقف ہو۔ یہاں کھڑے ہو کر اطمینان سے شیروں کا تماشہ دیکھو۔ پھر یہ شیر آگے بڑھے اور مخدوم صاحب کے پیروں کو بوسے دینے لگے۔ اور بلیوں کی طرح آپس میں کھلاری کرنے لگے۔ حضرت قلندر صاحب نے فرمایا۔ جلال الدین تم جانتے ہو۔ پانچواں شیر کون ہے۔؟ پھر قلندر صاحب نے فرمایا۔ پانچواں شیر میں ہوں۔ تمہاری دلداری کے لئے پانی پت چھوڑ کر یہاں آگیا ہوں۔ مخدوم جلال الدین صاحب کو جب حقیقت کا انکشاف ہوا تو آپ حضرت قلندر صاحب کے قدموں پر گر گئے۔ اور بوسہ دینے لگے۔ حضرت قلندر صاحب نے فوراً آپ کو اٹھایا۔ اور مخدوم صاحب کی پیشانی پر بوسہ دیا۔ مخدوم صاحب نے اسی وقت بیعت کی درخواست کی۔ حضرت قلندر صاحب نے معذرت کرتے ہوئے فرمایا۔

”نصیبہ ظاہری برآمدن دیگر شخص موقوف است۔ حق تعالیٰ ترا از اولیاء کامل کنانندہ است۔ و فقیر ہم در حق تو دعا گفتہ است ربطا ہر آپ کا حصہ ایک شخص کے آنے پر موقوف ہے۔ حق تعالیٰ آپ کو اولیاء کامل میں سے کرنے والے ہیں۔ فقیر نے بھی آپ کے لئے دعا کی ہے۔

بہر حال جب ایک نظام کے ماتحت حضرت قلندر صاحب ”باگہوتی“ تشریف لے گئے۔ تو اس افسانہ کی ضرورت نہیں ہے۔ جس میں خود تشناہ موجود ہے۔ کہاں خود بخود تشریف لے جانا۔ اور کہاں شیرین کرنکائے سے نکلنا۔

(معاذ اللہ)

تعجب ہے۔ جناب غلام سرور صاحب نے بھی خزینۃ الاصفیاء میں سی

طرح کا ایک افسانہ ٹانک دیا ہے۔ آپ فرماتے ہیں:-

جب حضرت شمس الدین کلیر سے پانی پت تشریف لائے تو چند روز بعد آپ کا خادم حضرت قلندر صاحب کی قیام گاہ کے پاس سے گزرا۔ وہاں دیکھا کہ قلندر صاحب شیر کی شکل اختیار کئے ہوئے بیٹھے ہیں۔ خادم خوف زدہ ہو کر واپس آیا۔ اور حضرت ترک کو اس کی خبر دی۔ حضرت شیخ شمس الدین ترک نے خادم کو ہدایت فرمائی کہ وہ پھر جائیں اور شیر سے کہیں کہ شیر کی جگہ جنگل ہے۔ آبادی میں شیر نہیں رہا کرتے۔ چنانچہ یہ شیر فوراً اٹھا۔ اور اسی صورت میں پانی پت سے نکل کر پانی پت سے کافی فاصلہ پر اس جگہ قیام فرمایا۔ جس کو "باگہوتی" کہتے ہیں (یعنی شیر کے رہنے کی جگہ۔ کیونکہ "باگہ" ہندی میں شیر کو کہتے ہیں۔) چند سال قلندر صاحب نے یہاں قیام فرمایا۔ پھر آپ موضع "بڈھا کھیرہ" تشریف لے گئے۔

سُلطان المشائخ نظام الدین محبوب اللہ اور حضرت امیر خسروؒ

طبقتہ کے لئے محتاج تعارف نہیں ہیں۔ کیونکہ اپنے روحانی کمالات کے علاوہ یہ دونوں بزرگ اور زبان کے موجد اور مشترک تہذیب کے بانی بھی مانے جاتے ہیں۔ حضرت محبوب اللہ سلطان الاولیاء، ۱۱ ربيع الاول ۷۲۵ھ تک اور حضرت امیر خسرو چھ ماہ بعد ۱۸ شوال ۷۲۵ھ تک رونق بخش عالم ظاہر رہے۔ حضرت قلندر صاحب ان کی وفات سے پانچ ماہ اور گیارہ دن پہلے، ۱۱ رمضان ۷۲۴ھ کو اس عالم سے رخصت ہو چکے تھے۔

وفات میں اگرچہ مہینوں کا فرق ہے۔ مگر عمروں میں تقریباً ۲۵ سال اور تقریباً ۴۵ سال کا فرق ہے۔ کیونکہ حضرت سلطان المشائخ کا سنہ ولادت

۶۳۴ھ ہے اور حضرت امیر خسرو کا ۶۱۵ھ۔

اگر یہ صحیح ہے کہ حضرت قلندر صاحب ۶۲۷ھ میں دہلی تشریف لے گئے۔ اور چالیس پچاس سال تک وہاں درس و افتاء اور قضا کی خدمت انجام دیتے رہے۔ تو حضرت قلندر صاحب کے زمانہ قیام میں حضرت سلطان المشائخ دہلی پہنچ چکے ہیں۔ قرن قیاس یہ ہے کہ قیام دہلی کے زمانہ میں بھی ان بزرگوں کی ملاقات ہوئی ہوگی۔ لیکن ہمیں حضرت امیر خسرو کی صرف اس ملاقات کا علم ہو سکا ہے جو دہلی میں نہیں۔ بلکہ پانی پت جانے کے بعد ہوئی ہے۔ واقعہ یہ بیان کیا جاتا ہے کہ علاؤ الدین خلجی متوفی ۱۲۹۵ھ نے حضرت قلندر صاحب کی خدمت میں کچھ ہدایا بھیجنے چاہے۔ اور حضرت امیر خسرو کو اس کے لئے منتخب کیا۔

سلطان نے حضرت امیر کے شیخ طریقت حضرت سلطان المشائخ محبوب الہی سے بھی اس کی اجازت حاصل کی۔ حضرت محبوب الہی نے اجازت دیتے ہوئے حضرت امیر خسرو کو ہدایت فرمائی۔

اے خسرو شرف الدین پانی پتی انچہ فرماید سعادت خود دانستہ
قبول نمائی ز پہنچ وجہ اعراض نہ کنی۔

اے خسرو شرف الدین پانی پتی جو کچھ بھی فرمائیں اس کو اپنی سعادت اور نیک بختی
سمجھ کر قبول کرو اور کسی صورت سے بھی انکار نہ کرو۔

جب حضرت امیر نے شرف زیارت حاصل کیا۔ تو اترائی تعارف میں قلندر صاحب نے دریافت فرمایا۔ آپ ہی کو خسرو کہتے ہیں۔ حضرت امیر اس زمانہ کی تہذیب کے مطابق اپنی لڑپنی قلندر صاحب کے قدموں میں ڈال کر آداب بجالائے۔ پھر دست بستہ عرض کیا۔ اس خادم ہی کو خسرو کہا جاتا ہے۔

اس سوال و جواب کے بعد قلندر صاحب سر بمراتبہ ہو گئے۔ استغراقی کیفیت آپ پر طاری ہوئی۔ تھوڑی دیر کے بعد سر اٹھا تو امیر خسرو نے عرض کیا۔ سلطان علاؤ الدین نے سلام عرض کیا ہے۔ اور کچھ ہدیے بھیجے ہیں۔ انھیں قبول فرمائے حضرت قلندر صاحب نے فوراً چونک کر جواب دیا۔

عزیز من! چالیس سال ہو گئے محویت طاری ہے۔ دتیا اور دنیاوی ساز و سامان تو درکنار مجھے خود اپنی خبر نہیں۔ ان ہدیوں اور تحفوں کو لے کر کیا کروں گا۔

ابھی معذرت کا یہ جملہ پورا نہیں ہوا تھا کہ فرمایا۔ میاں خسرو! آپ شاعر ہیں۔ مناسب وقت کچھ پیش کرو۔
حضرت امیر نے یہ غزل شروع کی :-

انچہ گوئی ہیج سخنے جز فراق یار نیست
میں جو بات بھی کہوں وہ فراق یار کی بات ہوگی اس کے سوا کوئی بات نہیں)

چون امید وصل آل ہچناں دشوار نیست
(کیونکہ اس کے وصل کی امید ہے یہ اتنی دشوار بات نہیں ہے۔)
عاشقان را در جہاں یکساں نباشد روزگار

(عاشقوں کے لئے دنیا میں یکساں زمانہ نہیں رہتا۔)
زانکہ اس انگشتہا دست من ہوار نیست
جس طرح میرے ہاتھ کی انگلیاں یکساں نہیں ہیں۔)
خلق را بیدار باید بود زاب چشم من
میری آنکھوں کے پانی سے مخلوق کو جاگ جانا چاہیے)
ایں عجب آل وقت میگیریم کہ کس بیدار نیست

یہ تعجب کی بات ہے۔ ایسے وقت رو رہا ہوں کہ کوئی بیدار نہیں ہے)

یک قدم بر نفس نہ فال و گروہ کوئے دوست

ایک قدم اپنے نفس پر رکھو دوسرا دوست کے کوچہ میں)

ہر چہ بینی دوست بن با این دانت کار نیست

تمہاری نظریں جو کچھ بھی ہو وہ دوست ہی دوست ہو این دانت کار کوئی کام ہو)

چند میگوئی بروز نار بتداے بت پرست

رکتنا کہو گے۔ اے بت پرست جاؤ زنا را با ندھو۔)

برتن خسرو کد امی رگ کہ آن زنا نیست

خسرو کے بدن میں ایسی کونسی رگ ہے جو زنا نہیں ہے)

قلندر صاحب بہت محظوظ ہوئے۔ اور فرمایا:-

خسرو خوش میگوئی۔ خوش خواہی بود۔ خوش خواہی رفت۔

(خسرو خوب کہتے ہو۔ خوش رہو گے۔ خوش جاؤ گے)

پھر ارشاد فرمایا:- میری منزل بھی ملاحظہ فرمائیے:-

دہم خسروان براں نعل استرست

بادشاہوں کا تاج اس شخص کی نظر میں جوتیوں کا تلا ہے)

خسرو کسے کہ خلعت تجرید در برست

بادشاہ وہ ہے جو ترک دنیا کی خلعت پہنے ہوئے ہے

سیمرغ وار روئے ہنم من بقاف عشق

میں سیمرغ کی طرح عشق کے کوہ قات کا رخ کئے ہوئے ہوں)

کو عارف نے کہ منظر او عرش اکبرست

ایسا عارف کہاں ہے کہ عرش اکبر پر اس کی نظر ہو

عقل کل ست علم لدنی بعارفان !
 رنارفوں کے یہاں علم لدنی عقل کل ہے
 این عقل و علم حسسی درشی محضراست

؟

درس شرف نمود از لوح ابجدی
 اشرف الدین کا سبق ابجد کی تختیوں سے نہیں ہوتا
 لوح جمال دوست مراد را برابر است
 جمال دوست کی لوح اس کے لئے موزوں و مناسب ہے
 حضرت قلندر صاحب نے اشعار کچھ اس سوز و گداز سے پڑھے۔ کہ
 حضرت امیر خسرو پر یہاں تک گریہ طاری ہوا کہ آپ بے قابو ہو گئے۔ قلندر
 صاحب نے ازراہ ظرافت پنجابی زبان میں فرمایا:-
 خسرو روندا ہے کچھ سمجھدا بھی ہے۔
 (خسرو روتے ہو کچھ سمجھتے بھی ہو۔)

حضرت امیر خسرو۔ شاہی دربار کے سلیقہ مند صاحب، جتنے بڑے سخن
 شناس تھے ایسے ہی نکتہ سنج بھی تھے۔ قدموں پر ٹوپی ڈال کر دست بستہ
 جواب دیا:-

ازاں مے گریم کہ نئے وانم و نئے فہم
 حضرت (اسی پر روتا ہوں کہ نہ کچھ جانتا ہوں نہ کچھ سمجھتا ہوں)
 حضرت قلندر صاحب اس جواب سے اتنے خوش ہوئے کہ بے اختیار
 زبان پر تحسین و آفریں کے الفاظ جاری ہو گئے۔ اور حضرت امیر پر بہت کچھ عنایت
 و نوازش فرمائی۔ پھر خادم خاص شیخ احمد زندہ پیر کو حکم فرمایا کہ حضرت امیر کو

خانقاہ میں لے جاؤ۔ اور کم از کم تین دن تک مہمانداری کے فرائض انجام دو۔ چنانچہ تین روز تک آپ خانقاہ میں قیام فرما رہے۔ خاطر مدارات میں کوئی دقیقہ نہیں اٹھا رکھا گیا۔

تین روز بعد حضرت امیر نے اجازت لیتے ہیئے درخواست کی کہ سلطان علاؤالدین کے لئے کچھ تحریر فرمادیا جائے۔

آپ نے کاغذ کا ایک معمولی سا پرزہ اٹھایا۔ اور اس پر تحریر فرمادیا۔
علاؤالدین خلجی غوطہ دہلی مقرر وارند کہ بندگان خدا تعالیٰ زندگانی نیکو کند۔

(مطابق چند صفحات کے بعد علاؤالدین خلجی کے حالات میں بیان کیا گیا ہے)

حضرت امیر خسرو نے اس وقت پھر درخواست کی "شاہی ہدیئے قبول فرمائے جائیں۔" حضرت قلندر صاحب کا جواب وہی تھا۔ تب حضرت امیر نے دریافت کیا۔ کہ پھر ان کا کیا کروں۔

فرمایا:- آپ کو اختیار ہے۔ جو مناسب سمجھیں کریں۔

حضرت امیر خسرو:- خانقاہ کے لوگوں کو دیدوں۔

فرمایا:- تمہیں اختیار ہے۔

بہر حال حضرت امیر خسرو ان ہدیوں کو خانقاہ والوں کو تقسیم کر کے رخصت ہونے کے لئے قلندر صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا:-

حضرت غصہ سے آرزو تھی کہ سرفردوں میں ڈالوں۔ پائے مبارک

کو بوسہ دوں اور آنکھیں ملوں۔

قلندر صاحب نے فوراً جواب دیا۔

"اے برادر نرود ما مہار۔ کہ ایجا آتش سوزاں مست۔"

دائے بھائی ہمارے پاس نہ آنا۔ ہمارا وجود دہکتی ہوئی آگ ہے۔) (اس سے زیادہ آتش سوزاں کیا ہو سکتی ہے کہ شرعاً پسندیدہ نہیں۔ محمد میاں) پھر امیر خسرو کو خدمت فرمایا۔

صاحب شرف المناقب نے ایک اور ملاقات کا بھی ذکر فرمایا ہے۔ مگر وہ سراسر مصنف کے عجائب پسند مذاق کا نمونہ بلکہ شاہکار ہے۔ فرماتے ہیں:-

حضرت امیر خسرو ایک مرتبہ از خود قلندر صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے اور چند روز قیام کیا۔ ایک روز حضرت قلندر صاحب نے فرمایا:- میاں خسرو۔ کیا بات ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس مبارک میں حاضری ہوتی ہے تو وہاں تمام اولیاء اللہ کو دیکھتا ہوں لیکن حضرت نظام الدین کہیں نظر نہیں پڑتے۔

حضرت امیر خسرو۔ اس کا جواب کیا دے سکتے تھے۔ آپ نے حضرت سلطان جی کی طرف رجوع کیا۔ حضرت سلطان المشائخ محبوب الہی نے فرمایا۔ خسرو حضرت قلندر صاحب کی خدمت میں دوبارہ جاؤ۔ اور ان سے کہو کہ مجلس مبارک میں جہاں سرور کائنات رونق افروز ہوتے ہیں تو حضرت کی پشت کی جانب ایک مخدعہ (چھوٹا سا حجرہ یا کھڑکی) ہے۔ فقیر کو اس مخدعہ میں تلاش فرمائیں۔

حضرت امیر نے قلندر صاحب کی خدمت میں حاضر ہو کر یہی جواب عرض کر دیا۔ حضرت قلندر صاحب نے فرمایا۔ اچھا خسرو، آج ہم اور تم دونوں اس مجلس مبارک میں حاضر ہوں۔ اور حضرت نظام الدین کو تلاش کریں۔ چنانچہ جب یہ دونوں مجلس مبارک میں حاضر ہوئے۔ وہاں جملہ اولیاء حاضر تھے حضرت امیر تو انھیں اولیاء کرام کی صف میں کھڑے رہے۔ مگر حضرت قلندر صاحب چکر کاٹ کر اس

مخدعہ کے قریب پہنچ گئے لیکن سمہت نہ ہوئی کہ پردہ اٹھائیں۔
یہ شعر زبان پر آگیا۔ الیتہ:-

پردہ بردار کہ تا عارض جانان بنگرم
ورنہ از آہ جگر پردہ عالم بدرم
(پردہ اٹھائیے تاکہ رخ جانان دیکھ لوں۔ ورنہ آہ جگر سے سارے عالم کا
پردہ چاک کر دوں گا)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قلندر صاحب کی آواز سنی تو فرمایا۔ کیا بات ہے
کیا چاہتے ہو حضرت قلندر صاحب نے دست بستہ عرض کیا۔ سلطان الاولیاء
محبوب الہی کو دیکھنا چاہتا ہوں۔

ارشاد ہوا۔ آؤ۔ دیکھو۔ محبوبیت کی مسہری پر رونق افروز ہیں۔
حضرت بوعلی قلندر زمین بوس ہو کر آداب بجالائے۔ پھر اس پردہ کی طرف
پہنچنے دیکھا کہ:-

شیخ نظام الدین محبوب الہی بر مصطلے سفید و رغایت معشوقی در عنائی
نشستہ اند۔ دیدہ و شکر الہی بجا آوردند۔

شیخ نظام الدین محبوب الہی۔ نہایت معشوقی اور عنائی انداز میں سفید جانشماز
پر تشریف رکھتے ہیں۔ قلندر صاحب نے آپ کی زیارت کی اور اللہ کا شکر ادا کیا
یہ شرف المناقب کی روایت ہے۔ اور شرف المناقب ہی کی تخصیص نہیں۔
حضرات مشائخ کے تذکروں میں ایسے قصے بہت سے ملیں گے ایسی روایتوں
سے وہ اپنے خیال میں صاحب سوانح کا تو درجہ بلند کرتے ہیں۔ مگر اس کو قطعاً
نظر انداز کرتے ہیں کہ ایسی روایتوں سے خود ان کی پوزیشن خطرہ میں ہو جاتی ہے
کیونکہ صادق مصدوق سرور کائنات کا ارشاد ہے۔

من کذب علی متعمداً اذلیتوا مقعداً من الناس۔
 (جو شخص میرے متعلق قصداً کوئی جھوٹی بات بیان کر رہا ہے۔ وہ اپنا ٹھکانا

دوزخ میں بنا رہا ہے۔)

جب تک وحی کے ذریعہ صداقت واضح نہ ہو جائے اس قسم کے افسانوں
 میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر خیر (عناذ اللہ) شان اعلیٰ و ارفع سے گرا
 ہوا۔ اور اس حدیث کا مصداق ہے۔

شیخ احمدی | شیخ شرف الدین منیری رحمہ اللہ متوفی ۱۰۸۲ھ
 اور ان

کے فرزند رشید شرف الدین بن احمد کجی سلسلہ فرود سیمہ کے جلیل القدر مشائخ
 میں سے ہیں۔ قصبہ منیر غلغ پٹنہ عظیم آباد صوبہ بہار میں ان کے مزارات ہیں۔
 ریاضت و مجاہدہ اور کرامتوں کے تذکرے آج تک زبانوں پر ہیں۔ شیخ
 شرف الدین کے مکتوبات جو اہل ذوق کے لئے حقائق و معارف کے جواہر گران
 ہیں۔ حضرت شیخ کے کمالات کی نشاندہی کرتے ہیں۔

صاحب شرف المناقب کا بیان ہے کہ شیخ احمد کجی حضرت قلندر صاحب
 کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اولاد کے لئے دعائے دعا کی درخواست کی۔ حضرت شیخ
 شرف الدین اسی دعا کا ثمرہ ہیں۔ اور یہ نام بھی حضرت قلندر صاحب کا عطیہ ہے
 کیونکہ قلندر صاحب نے قبولیت دعا کی بشارت دیتے ہوئے حضرت شیخ احمد کجی
 سے وعدہ لے لیا تھا کہ وہ بچہ کا نام "شرف الدین" رکھیں گے۔

صاحب شرف المناقب نے دعا کے بعد حضرت احمد کجی صاحب کے
 سفر بہار اور راستہ میں ایک عورت کی طرف سے درخواست نکاح وغیرہ کا افسانہ
 بھی ذکر کیا ہے۔ مگر یہاں اس کا تذکرہ قطعاً غیر ضروری ہے۔ بلکہ صحیح مذاق والوں

کے لئے تکلیف دہ ہے۔ اس لئے اس کو نظر انداز کیا جا رہا ہے۔

حضرت قلندر صاحب اور شاہانِ دہلی | سنہ ۶۰۴ھ سال ولادت قلندر صاحب
سے لیکر سال وفات ۶۲۲ھ تک
ایک سو بیس (۱۲۰) سال کے عرصہ میں شاہانِ دہلی کے خاندانوں میں دو
تبدیلیاں ہوئیں۔

خاندانِ غلامان

خاندانِ تغلق

خاندانِ خلجی

حضرت قلندر صاحب کی پیدائش قطب الدین ایبک کے دور حکومت میں
ہوئی۔ بلکہ آپ کا سال ولادت قطب الدین کا سنہ جلوس ہے۔ سنہ ۶۰۴ھ مطابق
سنہ ۱۲۰۶ء اس کے بعد بالترتیب بادشاہوں کے نام یہ ہیں۔

از خاندانِ غلامان

قطب الدین ایبک	از	۶۰۴ھ	تا	۶۰۸ھ
شمس الدین التمش	از	۶۰۸ھ	تا	۶۳۲ھ
رضیہ سلطانہ	از	۶۳۲ھ	تا	۶۳۶ھ
معز الدین	از	۶۳۶ھ	تا	۶۳۹ھ
غلاؤ الدین مسعود	از	۶۳۹ھ	تا	۶۴۲ھ
ناصر الدین محمود	از	۶۴۲ھ	تا	۶۴۴ھ
غیاث الدین بلبن	از	۶۴۴ھ	تا	۶۸۶ھ
معز الدین کیقباد	از	۶۸۶ھ	تا	۶۸۹ھ
شمس الدین کیومرث	از	۶۸۹ھ	تا	۶۹۰ھ

معز زول کر کے قید کر دی گئی۔
معز زول
معز زول
قتل کر کے تبنا میں لاش ڈال دی گئی
بچپن میں تخت پر بٹھایا گیا۔ اور چند ماہ بعد قتل

کر دیا گیا۔ یہ قتل کیا ہوا اس خاندان کی سلطنت ہی ختم ہو گئی۔

خاندان خلجی

جلال الدین خلجی	از	۶۸۹ھ	تا	۶۹۵ھ
		۱۲۹۰ء		۱۲۹۵ء
علاؤ الدین خلجی	از	۶۹۵ھ	تا	۷۱۵ھ
		۱۲۹۵ء		۱۳۱۵ء
شہاب الدین عمر	از	۷۱۵ھ	اسی سال قطب الدین مبارک اول نے قتل کر	
		۱۳۱۵ء		
قطب الدین مبارک اول	از	۷۱۶ھ	تا	۷۲۰ھ
		۱۳۱۶ء		۱۳۲۰ء
ناصر الدین خسرو	از	۷۲۰ھ	مقتول	
		۱۳۲۰ء		

خلجی خاندان کی سلطنت ختم

خاندان تغلق

غیاث الدین تغلق اول از ۷۲۰ھ تا ۷۲۵ھ
۱۳۲۰ء تا ۱۳۲۲ء
وفات حضرت قلندر صاحب رمضان ۷۲۵ھ

اس سلسلہ میں قابل اعتماد واقعہ تو ایک ہی

بادشاہوں کے تعلقات

ملتا ہے۔ جس کا تذکرہ حضرت امیر خسرو کے

سلسلہ میں آچکا ہے۔ کہ علاؤ الدین خلجی نے حضرت امیر کو حضرت قلندر صاحب کی خدمت میں کچھ ہدیئے دے کر بھیجا تھا۔ اور جب حضرت امیر نے واپسی کے وقت درخواست کی۔ کہ قلندر صاحب بادشاہ کچھ تحریر فرمادیں۔ تو حضرت قلندر صاحب نے ایک پرزہ کاغذ پر یہ لکھ کر دیدیا تھا۔ کہ :-

علاؤ الدین خلجی خوٹہ دھلی مقرر دارند کہ بہ بندگان خدا تعالیٰ زندگانی نیکو کند۔

یہ فقرہ چھوٹا سا ہے۔ مگر اس وقت کے حالات تھے اس چھوٹے سے فقرہ

کو بہت زیادہ معنی خیز بنا دیا تھا۔ اس مختصر فقرہ میں ایک طرف بادشاہ کو اس

کی حقیقت بتا دی گئی ہے۔ دوسری جانب اس کے فرض سے اُس کو آگاہ کیا گیا ہے
خوط، غالباً تری لفظ ہے۔ محصول (مالگذاری) کو کہتے ہیں جو تحصیلدار
وصول کیا کرتے ہیں۔

تحصیلدار یعنی سرب ڈوٹرن کا افسر اگرچہ آج کل اس علاقہ کا کوتوال یا
مجسٹریٹ نہیں ہوتا۔ مگر اس زمانہ میں عموماً یہ تینوں کام ایک ہی شخص کے متعلق
ہوا کرتے تھے یعنی حفاظت، انصاف اور واجبی مطالبوں کی وصولی۔

پس "خوط دھلی" کے معنی ہیں۔ کوتوال تحصیلدار۔ اور اگر یہی مجسٹریٹ بھی
ہو تو اس کے مفہوم میں "منصف" بھی داخل ہوگا۔ پس خوط دہلی کے لفظ نے
بادشاہ کی حیثیت ظاہر کر دی۔ دوسرے فقرہ میں اس کا فرض یا ودلایا گیا ہے۔
فرض وہی ہے جس کے ورد کی ٹیس ان بزرگوں کے دلوں کو ہر وقت مضطرب رکھا
کرتی تھی یعنی خدمت خلق اور ہمدردی بندگان خدا۔

اب یہاں ایک اور لطیفہ بھی قابل ذکر ہے۔ وہ یہ کہ جب یہ پرزہ بادشاہ
کی خدمت میں پیش ہوا۔ تو حضرت امیر خسرو نے تو غالباً اس کو اپنا کارنامہ سمجھا۔
مگر خوشامدی مصاحب جن کی فطرت ہی نیش زنی ہوتی ہے۔

بقول حضرت شیخ سعدیؒ

نیش عقرب نہ از پئے کین سست
مقتضاً طبیعتش این سست

بادشاہ کو چڑھانا چاہا کہ ان خود فریب صوفیوں کے دماغوں میں کتنا تکبر
گھسا ہوا ہے۔ شاہانہ آداب کا بھی لحاظ نہیں کرتے۔ کاغذ کا پرزہ خود توہین آمیز
اس پر یہ بے سرو ہا فقرہ۔ جس میں نہ القاب و آداب اور نہ سلام و دعا۔
غرض بادشاہ کو برا فروختہ کرنے کی کافی گنجائش تھی اور اس گنجائش سے

کام لینے کی پوری کوشش کی گئی۔ مگر بادشاہ کے دل میں چور تھا۔ جس کا خود اس کو احساس تھا۔

وہ خوب سمجھتا تھا کہ اُس نے دہلی کے بادشاہ کو جو اس کا مرقی۔ چچا اور خسر بھی تھا۔ دھوکے سے قتل کر کے گورنری کے بجائے بادشاہت حاصل کی ہے۔ یہ خرقہ پوش خانہ بدوش نقرار اگرچہ نظام حکومت اور ملکی سیاست سے اُن کا تعلق نہیں ہے مگر بیشمار بندگانِ خدا کے دلوں پر یہ حکومت کرتے ہیں۔ اگر ان کے تیور بگڑے رہے تو اس کی بادشاہت ریت کا تو وہ ہے۔ اس کو اپنی بادشاہت کے استحکام کی فکر تھی۔ کہ ایک طرف حضرت امیر خسرو کے ذریعہ سلطان المشائخ کی خوشنودی حاصل کر رہا تھا اور دوسری جانب امیر خسرو جیسے بذلہ شیخ شاعر، صاحب ذوق ادیب اور باسلیقہ مصاحب کے ذریعہ حضرت قلندر صاحب کا گوشہ التفات حاصل کرنا چاہتا تھا۔

علاؤالدین خلجی کامیاب رہا۔ اس کے پیش بہا ہدیئے تو نظر قلندر کو بادشاہ کی طرف مائل نہیں کر سکے۔ البتہ حضرت امیر خسرو کی سلیقہ مندی نے زبان قلندر سے کہلوا لیا۔

خوش خواہی بود، و خوش خواہی رفت

بادشاہ کا یہی احساس اور تاثر تھا کہ ان خوشامدی مصاحبوں کو جواب دیا۔

”اے نادانان ہزار ہا ہزار رحمت بر من کرد کہ خوٹگی دھلی بر من

ارزانی داشت“

اے نادانوں مجھ پر قلندر صاحب نے لاکھوں مہربانیاں کی ہیں۔ کہ

دھلی کی خوٹگی مجھے بخش دی۔

سلطان علاؤالدین خلجی کے علاوہ حضرت قلندر صاحب کے سلسلہ میں اور

بھی چند بادشاہوں کے واقعات بیان کئے گئے ہیں۔ مثلاً:-
 (۱) سلطان محمد تغلق کے متعلق روایت ہے کہ اُس نے حضرت قلندر
 صاحب کی خدمت میں ایک رباعی بھیجی اور درخواست کی کہ قلندر صاحب اس
 کا جواب ارشاد فرمائیں۔ رباعی یہ تھی:-

کہ راست کند صورت مردی وزنی کون ہے جو مرد اور عورت کی صورت بناتا ہے
 کہ بشکند این طلسم جانی وتی کون ہے جو اس جان زن کے جادو کو توڑتا ہے
 کس نیست کہ استاد قضا را پرسد کوئی نہیں ہے جو استاد قضا سے سوال کرے
 کز بہر چہ سازی و چراے شکنی کیوں تو بناتے ہو اور کیوں توڑتے ہو ؟
 حضرت قلندر صاحب نے فی الفور یہ رباعی موزوں کی اور سلطان
 کے پاس بھیج دی۔

شرط است کہ در امر خدا دم زنی شرط ہے کہ خدا کے معاملہ میں دم نہ مارو۔
 زن نوع کہ ہستی تو نہ مردی نہ زنی تم جس نوعیت کو ہو یہ ایسی صورت ہو کہ نہ تم مرد ہو نہ عورت
 رگل را چہ بجال ست کہ گوید بہ کلال مٹی کی کیا مجال کہ کہا رسے پوچھے
 کز بہر چہ سازی و چراے شکنی کیوں تو بناتے ہو اور کیوں بگاڑتے ہو۔
 اس ادبی چیٹر چھاڑ سے تقریباً ایک سال بعد سلطان حضرت قلندر
 صاحب کے پاس پہنچا اور دست بستہ کھڑا ہو گیا۔ حضرت قلندر صاحب نے
 بادشاہ پر نظر ڈالی۔

اور فرمایا:- بادشاہ "کے روز یہاں رہو گے۔"

بادشاہ نے کہا:- تین دن۔

حضرت قلندر صاحب نے مسکراتے ہوئے فرمایا:- "چار سال"
 تغلق کو احساس ہوا کہ شاید میری باقی زندگی کی طرف اشارہ ہے۔ اور یہ

یہ احساس یہاں تک بڑھا کہ اُس نے خزانوں کے دروازے کھول دیئے۔ اور بہت کچھ دولت تقسیم کر ڈالی۔ پھر واقعہ یہی ہوا کہ جیسے ہی چار سال پورے ہوئے سلطان کی وفات ہو گئی۔

یہ واقعہ اگر صحیح ہے تو بادشاہ کا نام غلط لکھا گیا ہے۔ کیونکہ سلطان محمد تغلق تو حضرت قلندر صاحب کی وفات کے بعد بادشاہ بنا۔ پھر نپدرہ سال زندہ رہا ہے۔ بظاہر غیاث الدین تغلق اول کا یہ واقعہ ہے۔ وہ حضرت قلندر صاحب کے آخری دور ۷۲۵ھ میں بادشاہ ہوا۔ اور ۷۲۵ھ میں مکان اس پر گر گیا جس میں وہ دب کر مر گیا۔

(۲) فیروز شاہ ابھی بادشاہ نہیں ہوا تھا۔ سن شعور کا آغاز تھا۔ وہ حضرت قلندر صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اور پابوس ہونے کی اجازت چاہی۔ جب قدم مبارک کو بوسہ دے چکا تو حضرت قلندر صاحب نے فرمایا۔ کیا نام ہے۔

فیروز شاہ نے عرض کیا: کمال الدین۔

ارشاد ہوا:۔ عمر بکمال، دولت بکمال، و نعمت بکمال۔

(۳) ایک مرتبہ تین بچے آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ تینوں ہیشیا

مہذب اور باسلیقہ تھے قلندر صاحب نے خادم کو حکم دیا۔ کہ ان کو کھانا کھلائیں۔ خادم ایک پشت میں کھانا لایا۔ تینوں لڑکوں نے بسم اللہ کہہ کر کھانا شروع کر دیا۔ حضرت قلندر صاحب نے تینوں کو ایک ہی "کاسہ" میں کھاتے ہوئے دیکھا تو فرمایا:۔

"سبحان اللہ سہ بادشاہ دریک کاسہ طعام مے خوردند"

چنانچہ یہ تینوں لڑکے بعد میں بادشاہ بنے۔ ایک سلطان تغلق۔

خاتمہ کلام

ایک طویل تحریر جس کو آپ ختم کر رہے ہیں۔ جب اس کا سلسلہ شروع کیا۔ تو صرف ایک "مقالہ" کا ارادہ تھا۔ جو اخبار کے چند کالموں میں آجاتا۔ مگر جیسے جیسے حضرت قلندر صاحب کی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر غور شروع کیا۔ مضامین کا ایک سیلاب اُمنڈنے لگا۔ اور طبیعت مجبور ہوئی کہ جہاں تک ممکن ہو ان کو قلمبند کرے اولیاء اللہ کا احترام ہمارا عقیدہ ہے۔ اولیاء اللہ کی کرامات کے بھی ہم قائل ہیں۔ مگر روز تصوف سے ناواقف ہیں اس بنا پر اہل تصوف کی اصطلاحات کو بھی استعمال کرنی مناسب نہیں سمجھتے۔ مگر اس موقع پر اس کے بغیر کوئی چارہ بھی نہیں ہے۔ کہ اہل تصوف کی اصطلاحات سے مدد لیں۔ اور یہ عرض کر دیں کہ اس مضمون کی ترتیب کے وقت ایسی صورت پیش آئی جس کو روحانی تصرف کہا جاسکتا ہے۔ یعنی اس مضمون یا کتاب کے کسی بھی حصہ پر جب غور کرنا شروع کیا تو ایسی باتیں ذہن میں آئیں جن کا پہلے سے وہم و گمان بھی نہیں تھا۔ اور یہ یقین مستحکم ہو گیا کہ یہ حضرت قلندر صاحب کا روحانی تصرف ہے۔ رحمۃ اللہ

بہر حال یہ کتاب اگر قابل قبول ہے تو وہ صرف حضرت قلندر صاحب کی کرامت ہے اور بس۔ رحمۃ اللہ

وآخر دعوانا ان الحمد لله رب العالمین

محمد میاں

۲۰ رجب ۱۳۸۲ھ ۱۸ دسمبر ۱۹۶۲ء

•

حضرت شیخ شمس الدین ترک پانی پتی

یہ وہی قطب وقت، مرشد کامل اور صاحبِ خدمت ہیں جن کی تشریف آوری کا تذکرہ حضرت قلندر صاحب کے حالات میں گذر چکا ہے کہ جیسے ہی آپ پانی پت میں فروکش ہوئے حضرت قلندر صاحب نے اپنے حجرہ مقدسہ سے بستر لیٹنا شروع کر دیا۔ حلوائی کے لڑکے نے جب کہا حضرت والا کہاں کو؟ تو ارشاد ہوا:-

"یہ ولایت (علاقہ) ایک دوسرے صاحب کو سپرد ہو گیا ہے وہ تشریف لے

آئے ہیں۔ اب مجھے اجازت نہیں ہے کہ میں یہاں قیام کر سکوں۔"

ہم انھیں قطب اور ابدال کیوں کہتے ہیں اور سلسلہِ حشتیہ صابریہ ان پر کیوں ناز کرتا ہے۔ وہ آپ کا عظیم الشان ایثار ہے۔ آپ کی حیرت انگیز قربانی ہے آپ کا لرزہ خیز مجاہدہ ہے۔

خدا جانے کیا دھن تھی جس نے آپ کو وطن عزیز سے نکالا سینکڑوں میل پاپیادہ چلایا۔ خطرناک جنگلوں اور پہاڑوں کو طے کراتے ہوئے ہندوستان پہنچایا اور پانی پت میں اس طرح آراستہ کر دیا کہ وہیں کے ہو گئے وہیں وطن ہو گئے۔ وہیں مزار بنا۔ اور اسی خاک پاک سے قیامت کے روز آپ کا نشا بانہ جلو سے آئے گا۔ (الشار اللہ)

مولانا غلام سرور صاحب نے معارجِ الولایت کے حوالہ سے نقل کیا ہے کہ خواجہ شمس الدین ترک

وطن اور سلسلہ نسب

پانی پتی شیخ احمد بسوی کے فرزندوں میں سے ہیں۔ چند واسطوں سے آپ کا سلسلہ نسب حضرت محمد بن حنفیہ بن علی تفسیٰ کرم اللہ وجہہ تک پہنچتا ہے۔
صاحب سیر الاقطاب تحریر فرماتے ہیں کہ آپ کا وطن اصلی ترکستان ہے۔ اور آپ ساوات میں سے ہیں۔

سیر الاقطاب میں چند پشتوں تک آپ کے بزرگوں کے نام بھی تحریر کئے ہیں۔ شیخ شمس الدین ترک۔ ابن سید احمد بزرگ۔ ابن سید عبدالمومن۔ ابن سید عبد الملک۔ ابن سید سیف الدین۔ ابن خواجہ قرعتاد۔ ابن بابا قرعتاد۔

قرعتاد، غالباً ترکی لفظ ہے۔ بابا قرعتاد کے بعد کا سلسلہ درج نہیں ہے بہر حال نام کی عجمیت سے اتنی بات ظاہر ہے۔ کہ سلسلہ نسب میں ابھی بہت سے واسطہ اور ہیں۔ اور یہ کہ کافی مدت سے یہ خاندان ترکستان میں آچکا ہے۔ یہاں تک کہ نام پر بھی عجمیت کا اثر پڑ گیا۔ پھر چونکہ بابا قرعتاد کے بعد سلسلہ کے دوسرے بزرگوں کے نام صاحب سیر الاقطاب کو بھی معلوم نہیں ہے۔ لہذا اس کی تردید نہیں ہو سکتی کہ آپ محمد بن حنفیہ کی اولاد میں سے نہیں ہیں۔ نہ اس کا کوئی ثبوت ہے کہ آپ فاطمی ہیں۔ پس فیصلہ یہی کرنا پڑتا ہے کہ آپ علوی ساوات میں سے ہیں۔

مولانا غلام معین الدین صاحب مصنف معارج الولاہیت
تحریر فرماتے ہیں کہ حضرت شیخ شمس الدین رحمۃ اللہ علیہ نے

تعلیم اور تامل

اپنے وطن ہی میں علوم ظاہری کی تکمیل کی۔ اور جیسا کہ آئندہ سیر الاقطاب کے حوالہ سے نقل ہوگا۔ آپ وہاں صاحب اہل و عیال بھی ہو گئے۔ پھر آپ طلب حق میں اپنے وطن سے روانہ ہوئے۔ اور ہمارے خیال میں طلب حق کے بجائے صحیح یہ ہے کہ آپ طلب مولیٰ اور جستجوئے یار میں وطن سے روانہ ہوئے۔ ترکستان کو خیر باد کہا۔ ماورا نہر پہنچے۔ وہاں کے علماء اور مشائخ سے استفادہ کیا۔ مگر تسکین

نہیں ہوئی تو ہندوستان کا رخ کیا بسینکڑوں میل کی مسافت طے کر کے آپ ابو وہن“
پہنچے۔ جہاں حضرت بابا فرید الدین گنج شکر رحمۃ اللہ علیہ کا دربار جما ہوا تھا۔ جہاں
درود کے مریضوں کا دارالشفار تھا۔

یہاں کتنا عرصہ آپ نے "دل صد پارہ" کی مرہم پی میں صرف کیا، اس کا علم
نہیں۔ البتہ "صاحب سیرالاقطاب" کی شہادت یہ ہے کہ آپ اس دارالشفار سے
یہاں تک فیضیاب ہوئے کہ عشقِ حقیقی کی سند یعنی خرقہ خلافت آپ کو عطا ہو گیا۔
خرقہ خلافت سند عشق ہے۔ اس سے میکہدہ عشق میں داخلہ ہو سکتا ہے۔ مگر یہ
داخل ہونے والا ساقی نہیں بن سکتا۔

یہ جو ترکستان سے وادی عشق کے سنگریزوں اور خار مغیلاں کو بوسہ
دیتے ہوئے آئے تھے۔ صرف اپنی سرستی اور اپنی وارفتگی پر راضی نہیں ہو سکتے تھے
جب تک وہ جام و سبو ہاتھ نہ آجائے جو دوسروں کو بھی اسی طرح سرمست اور
وارفتہ بنا سکے۔

جب حضرت شمس الدین ترک نے اس جذبہ کے ساتھ آستانہ فریدی پر نظر ڈالی، تو
جواب یہ ملا۔ کہ ساقی میکہدہ بنا ہے تو ہمارے صابر کی خدمت میں حاضری دو۔

مخدوم المشائخ حضرت خواجہ علاؤ الدین صابر کلیری جو اپنے ماموں اور مرنی رُحانی
حضرت فرید الدین گنج شکر رحمۃ اللہ علیہ کے مطبخ اور لنگر خانہ کے بارہ سال تک منتظم و
مہتمم رہے اور ایک نوالہ کسی کھانے کا نہیں چکھا۔ کیونکہ حضرت شیخ کی طرف سے
جب خدمت اہتمام سپرد ہوئی تو واضح الفاظ میں اس کی اجازت نہیں دی گئی تھی۔
یہ احتیاط بھی قابل قدر تھی۔ مگر اس سے زیادہ قابل قدر وہ ضبط و تحمل اور
وہ اخفا تھا کہ بارہ سال تک کسی کو خبر نہیں ہونے دی کہ اپنے خورد و نوش کا
فائدہ مستانہ نظام مطبخ سے قطعاً جدا ہے۔ جس کا ہنڈیا چولہا جو کچھ بھی ہے،

وہ "توکل" ہے۔

غالباً ضبط و انخفا کی یہی بے نظیر طاقت تھی جس نے حضرت خواجہ فرید الدین رحمۃ اللہ علیہ کو موہ لیا۔ چنانچہ جب حضرت گنج شکرؒ کو علم ہوا تو جد آفریں کیفیت پیدا ہوئی اور بے اختیار زبان مبارک سے نکلا۔

علاء الدین علی احمد صاحب ریاست (ہمارا علاؤ الدین علی احمد "صابر" ہے۔) حضرت شیخ کی زبان مبارک سے لفظ "صابر" اس طرح ادا ہوا کہ یہی لفظ خطاب بن گیا۔ اور یہاں تک مشہور ہوا کہ حقیقی نام کی روشنی بھی اس کے سامنے ماند پڑ گئی۔

یہی "صابر" ہیں جن کی خدمت میں حاضر کی بارگاہ سے وابستگی کا حکم حضرت ترک کے لئے حضرت گنج شکر کی بارگاہ سے صادر کیا جا رہا ہے۔

اب حضرت "ترک" رحمۃ اللہ علیہ کی نکتہ شناسی ملاحظہ ہو۔ کہ حضرت "صابر" کے دامن سے وابستہ ہوئے تو اسی "جوہری وصف" کو اپنے لئے بھی منتخب کر لیا جو خطاب "صابر" کی بنیاد تھا۔

"مختاط خدمت" حضرت خواجہ علاؤ الدین علی احمد کا طرہ امتیاز تھا۔ اسی گوہر آبدار کو حضرت ترک نے اپنے امتیاز کے لئے بھی منتخب فرمایا۔ چنانچہ پندرہ سال تک حضرت شیخ کے دھنوا اور غسل اور عام مہمانوں کے لئے کھانا پکانے اور جنگل سے لکڑیاں لانے کی خدمت اپنے ذمے لئے رکھی۔ اور اس غوش اسلوبی سے انجام دیتے رہے کہ حضرت شیخ کی طرف سے جب "خرقہ خلافت" عطا ہوا تو فرزند کا خطاب بھی "سوئے پر سہاگے" کا کام کر رہا تھا۔ اور حضرت شمس الدین ترک دو چند مبارک باد کے مستحق تھے۔

آگے بڑھنے سے پہلے ضروری ہے کہ ان چند نکتوں کی بھی وضاحت

کر دی جائے جن کو ارباب طریقت کی اصطلاح میں "رموز" کہا جاسکتا ہے۔ اور جو اس موقع پر دامن غور و فکر کو اپنی طرف کھینچتے ہیں۔

(۱) مصیبت کے وقت جزع فزع نہ کرنا اور خاموش بیٹھے رہنا بھی صبر ہے۔ مگر صرف اسی کیفیت میں صبر کا انحصار نہیں ہے۔ "صبر و حقیقت ایک طاقت ہے۔ ایسی طاقت کہ رب العزت نے اس سے مدد لینے کی ہدایت فرمائی ہے۔

"استعینوا بالصبر والصلوة" (صبر اور نماز سے مدد حاصل کرو) یہ وہ

طاقت ہے جس کا دوسرا نام "ضبط و تحمل" ہے۔ مصائب کو جھیلنا۔ اور

پیشانی پر شکن نہ آنے دینا۔ نصب العین پر اس طرح جم جانا کہ بڑی سے

بڑی مصیبت اور سخت سے سخت حادثہ بھی پائے استقلال میں جنبش نہ

پیدا کر سکے۔ یہ ایک طاقت ہے جس کا نام صبر ہے جس سے تاریخی زندگی

کے ہر ایک موڑ پر واسطہ پڑتا ہے۔ حضرت خواجہ گنج شکر نے جب

علاء الدین علی احمد کو صابر فرمایا۔ تو گویا معنی "صبر" کی تفسیر بھی کر دی۔ وہ

ضبط و تحمل کی مثبت طاقت ہے۔ جس کی تصویر حضرت علی احمد کلیری نے

اپنے عمل سے پیش کی۔

(۲) ہمیں ان بزرگوں کے اوصاف خصوصی ہیں صرف "قص و سماع" یاد رہ گیا۔

حالانکہ حضرت صابر کی خصوصیت وہ غیر معمولی تقویٰ ہے جس نے بارہ سال

برابر گنج کے ایک ایک دانہ کو حرام بنائے رکھا۔ حضرت خواجہ فرید الدین گنج شکر نے

صابر کلیری رحمۃ اللہ علیہ کے ماموں تھے۔ ماموں کی غیر معمولی شفقت تھی یا

حضرت کلیری کی غیر معمولی سعادت اور سلاجیت کہ آپ کو حضرت فرید فرزند

بھی فرمایا کرتے تھے۔ جب تعلقات اس درجہ ہوں تو کھلنے پینے کی

چیزوں میں رکھ رکھاؤ نہیں رہا کرتا۔ قرآن حکیم نے بھی اس کی اجازت دی

ہے کہ ایسے تعلقات میں بلا اجازت بھی کھاپی سکتے ہو۔ (سورہ نور)

لیکن اس گہری یگانگت کے باوجود جو شخص اتنا محتاط ہو کہ بارہ سال تک متوکلا نہ زندگی کی دشواریاں اور تلخیاں برواشت کرتا رہے۔ اور ایک دانہ بھی مطبخ سے نہ چکھے۔ کیونکہ ان کو مطبخ کا "امین" اور مہتمم بنایا گیا تھا۔ اور "امین" کے لئے احتیاط اور تقویٰ یہی ہے کہ خیانت کا کم سے کم اور کمزور سے کمزور شبہ بھی نہ آنے دے۔ کیا آپ تصور کر سکتے ہیں کہ وہ رب العزت کے دوسرے احکام اور رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات کے بارہ میں محتاط اور متقی نہ ہوگا۔

افسوس سوانح نگاروں نے اس پہلو پر روشنی نہیں ڈالی۔ مگر یہ ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے جو عقل کی روشنی سے پوری طرح نمایاں ہو کر سامنے آجاتی ہے کہ حضرت صابر اپنے دور کے عظیم الشان متقی اور پرہیزگار بھی تھے۔ ظاہر ہے جو شخص انسانی حقوق میں اس درجہ متقی ہو وہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کے حق میں کیا کچھ متقی نہ ہوگا۔

(۳) ہندوستان میں مسلمانوں کے لئے لفظ ترک بھی مشہور ہو گیا تھا۔ حضرت خواجہ شمس الدین صاحب مسلمان تھے اور ترکستان سے بھی آئے تھے لیکن حضرت مولانا القار اللہ صاحب عثمانی پانی پتی کی تحقیق یہ ہے کہ حضرت شیخ شمس الدین رحمۃ اللہ علیہ کے لئے جو لفظ بطور خطاب استعمال ہوتا ہے وہ ترک رتار کے زبر کے ساتھ ہے جس کی ہندی "تیاگ" ہے۔ اور ظاہر ہے اس سے بڑھ کر ترک اور تیاگ کیا ہو سکتا ہے کہ اپنے وطن چھوڑا۔ اہل و عیال چھوڑے۔ مال و متاع چھوڑا۔ جو کچھ تھا سب ہی ترک کر کے راہ خدا میں قدم رکھا۔ اور جب حضرت صابر اور ان کے

مہمانوں کی خدمت ذمہ لی جس کے لئے لکڑیاں جنگل سے لانی پڑتی تھیں تو ظاہر ہے "آرام و سکون" بھی ترک کر دیا۔ اہل و عیال کو ترکستان میں چھوڑا تو اس طرح کہ پھر آخر تک "تجروہ" کی زندگی بسر کی۔ اتباع سنت کے لئے صرف پہلی شادی ہی کو کافی سمجھا۔ "ترک" تار کے پیش کے ساتھ اس لئے بھی قرین قباس نہیں کہ آپ نسلاً ہاشمی اور علوی سید تھے۔

سوانح نگاروں کا متفقہ بیان ہے کہ حضرت خواجہ شمس الدین فوجی ملازمت | ترک "غیاث الدین بلبن" کی فوج میں بھرتی ہوئے۔

اور ایک عرصہ تک فوجی خدمات انجام دیں۔ خیال ہو سکتا ہے کہ شاید ہندوستان میں آپ کی تشریف آوری طلب معاش کے لئے ہو جیسا کہ اس وقت کا معمول تھا۔ لیکن اگر آپ کا یہ سفر طاب معاش کے لئے ہوتا تو آپ کے قدم "دھلی" کی طرف اٹھتے۔ دھلی دارالسلطنت تھا۔ اور پنجاب کا دارالحکومت لاہور یا ملتان تھا۔ لیکن آپ نے نہ لاہور کا رخ کیا نہ دہلی کی سمت دیکھا؛ آپ سیدھے اجودھن پہنچے جو "راہ عشق کی منزل" تھی۔

ایک روایت یہ کہی ہے کہ آپ کو جیسے ہی حضرت خواجہ صابر کلیری کی وفات کا علم ہوا تو فوج سے رخصت ہو کر "کلیر شریف" پہنچ گئے۔ جہاں حضرت صابر رحمۃ اللہ علیہ کا جنازہ مبارک بے گور و کفن تھا۔ ایک شیر اس کی حفاظت کر رہا تھا۔ لیکن یہ روایت اس لئے غلط ہے کہ غیاث الدین بلبن جس کی فوج میں آپ ملازم تھے۔ اور اس کی زندگی ہی میں آپ مستعفی ہو گئے۔ اس کی وفات حضرت خواجہ کلیری کی وفات (سنہ ۶۸۶ھ) سے چار سال پہلے (سنہ ۶۸۶ھ) میں ہو چکی تھی اس کے برعکس صاحب سیر الاقطاب نے تحریر کیا ہے۔ کہ:-

آپ پندرہ سال تک حضرت خواجہ کلیری کی خدمت میں حاضر رہ کر غسل وضو، کھانا پکانے اور جنگل سے لکڑیاں لانے کی خدمت انجام دیتے رہے۔

اُس کے بعد آپ فوج میں ملازم ہوئے اور اخفاری کی زندگی بسر کرنے لگے۔ پھر جب فوج میں آپ کی کشف و کرامت کا ظہور ہوا۔ اور آپ کے اخفاری کا پر وہ چاک ہوتے لگا تو آپ فوج سے مستعفی ہو کر "پیر روشن ضمیر" کی خدمت میں حاضر ہو گئے۔ کچھ عرصہ بعد آپ کو خرقہ خلافت عطا ہوا۔ اور "پانی پت" کا حلقہ آپ کے سپرد ہوا۔

صاحب معارج الولايت نے لکھا ہے :-

جب حضرت خواجہ علی احمد کلیری رحمۃ اللہ علیہ کی وفات کا زمانہ قریب ہوا تو آپ نے خرقہ خلافت عطا فرمایا اور پانی پت جلنے کی اجازت بخشی۔ مگر یہ بھی ارشاد فرمادیا کہ میری وفات کے بعد تین روز یہاں قیام کریں پھر پانی پت تشریف لے جائیں۔

بہر حال یہ تو عقل اور نقل دونوں سے ثابت فوجی ملازمت کب کی؟ ہو گیا کہ جب حضرت خواجہ صابر کلیری رحمۃ اللہ علیہ کی وفات ہوئی تو آپ فوج میں ملازم نہیں تھے۔ بلکہ فوجی ملازمت ترک کر کے آچکے تھے۔

پھر جب کہ سوارخ زگاروں کا اس پر بھی اتفاق ہے کہ آپ غیاث الدین بلبن متوفی (۶۸۶ھ) کے زمانہ ہی میں فوجی ملازمت سے کنارہ کش ہو کر کلیر شریف اپنے پیر روشن ضمیر کی بارگاہ میں حاضر ہو چکے تھے تو ظاہر ہے آپ ۶۸۶ھ (سال وفات بلبن) سے ایک دو سال قبل اور ممکن ہے اس سے بھی زیادہ عرصہ پہلے کلیر شریف واپس آچکے ہیں۔

پھر جب یہ بھی صحیح ہے کہ پندرہ سال آپ حضرت خواجہ کی خدمت میں کلیر شریف رہنے کے بعد فوجی ملازمت کے لئے گئے تھے تو کلیر شریف میں آپ

کی حاضری ۶۶ھ سے پہلے ہو چکی ہے۔

حضرت خواجہ فرید الدین شکر گنج رحمۃ اللہ علیہ کے سال وفات میں اختلاف

ہے۔ آپ کا سال وفات ۶۶ھ، ۶۶ھ اور ۶۷ھ بتایا گیا ہے۔

ہم احتیاطاً پہلی روایت کو تسلیم کرتے ہوئے یہ فیصلہ کرتے ہیں کہ ۶۵۹ھ

یا ۶۶ھ میں حضرت خواجہ ترک۔ اجود صحن سے کلیر حاضر ہوئے۔ پندرہ سال

حضرت "صابر" کی خدمت کی۔ پھر تقریباً ۶۷۶ھ میں فوجی ملازم ہوئے۔ اور

پانچ چھ سال ملازمت کر کے تقریباً ۶۸۲ھ میں پھر حضرت صابر کے آستانہ پر

آپڑے۔ اور اہل آخری تربیت اور تکمیل کے بعد آپ کو تقریباً ۶۹ھ میں پانی پت

کا علاقہ سپرد ہوا۔ اور یہ ہدایت فرمائی گئی کہ حضرت صابر کی وفات سے چند روز بعد

آپ پانی پت تشریف لے جائیں۔

اس سے حضرت قلندر صاحب کی سوانح کا بھی ایک حصہ سامنے آجاتا

ہے کہ ۶۹ھ کا وہ دور تھا کہ آپ پر کیفیت جذب طاری ہو چکی تھی۔ حتیٰ کہ سلسلہ

ارشاد و تربیت آپ کے بجائے حضرت خواجہ ترک کے سپرد ہوا۔ اور آپ کو پانی پت

سے باہر تشریف لے جانے کی ہدایت ہوئی۔ ہم نے حضرت قلندر صاحب کے تذکرہ

میں تحریر کیا ہے۔ کہ غیاث الدین بلبن کی وفات کے بعد طوائف الملوک کے

بھیانک دور نے آپ کی حساس طبیعت پر خاص اثر کیا تھا۔ واقعات کی

مندرجہ بالا ترتیب سے اس کی بھی توثیق اور تائید ہو جاتی ہے۔ واللہ اعلم بالصواب

دربار اجود صحن میں داخلہ وہاں ذکر و شغل

اور ریاضت و مجاہدہ پھر حضرت گنج شکر کے

فوجی ملازمت کیوں کی؟

ارشاد پر کلیر شریف میں حاضری حضرت صابر کی غلامی۔ اور پندرہ سال تک

غلامانہ خدمت، نیاز مندی۔ اور تعلقات دنیا سے یہاں تک کنارہ کشی کہ آپ

کا خطاب ہی ترک ہو گیا۔

اس کے بعد فوج کی ملازمت اور فوج بھی ایک بادشاہ کی فوج جس کے لئے ضروری نہیں کہ وہ پابند شریعت ہو۔

غیاث الدین اگرچہ نیک خصلت بادشاہ تھا، مگر تاہم بادشاہ تھا۔ بادشاہت سے اسلام کو جو نفرت ہے اس کا اندازہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد سے ہو سکتا ہے۔ کہ :-

"اللہ تعالیٰ کے یہاں سب سے زیادہ قابل نفرت خطاب یہ ہے

کہ کسی کو "ملک الاملاک" "شاہنشاہ" کہا جائے" (ترمذی شریف)

پھر عجیب لطیفہ یہ ہے کہ مصنف سیر الاقطاب جو ان بزرگان سلسلہ صابریہ چشتیہ کے سب سے بڑے مداح ہیں، تحریر فرماتے ہیں کہ جب حضرت مخدوم خواجہ علاؤ الدین علی احمد صابری کلیری رحمۃ اللہ علیہ نے آپ کو پانی پیت بھینچنے کا ارادہ فرمایا:

"عرض کرو کہ بندہ ہنوز لیاقت آں ندارد۔ اگر فرمان شود چند گاہ

مزدوری کند حضرت مخدوم التماس ایشان قبول نموده رخصت فرمودہ

(ترجمہ) عرض کیا کہ بندہ اس خدمت کی لیاقت نہیں رکھتا۔ اگر اجازت ہو کچھ دنوں

مزدوری کر لوں۔ حضرت مخدوم (کلیری) نے ان کی درخواست منظور فرما کر ان

کو رخصت فرمایا۔

گویا آپ فوج میں بھرتی اس لئے ہوئے تھے کہ کچھ مزدوری مل جائے۔ قافہ مستی ختم ہو۔ کچھ ہاتھ کھلے۔ اور کچھ وام پلے میں ہوں تو پانی پیت جا کر کام کر سکیں ایک بلند و بالا مقصد کے لئے کوئی شخص کچھ دولت فراہم کرتا ہے جو اس کے لئے توشہ کا کام دے سکے تو خلاف شریعت نہیں۔ بلکہ نظر شریعت میں خصوصاً ارشاد ربانی "وتزووا فان خیرا لوزاد التقویٰ" راہ توشہ لے لو۔

بس بہترین توشہ تقویٰ ہے) کے پیش نظر یہ ایک ارشادِ خداوندی کی تعمیل ہے لیکن واقعہ یہ ہے کہ ان بزرگوں کی متوکلانہ زندگی کے ساتھ یہ بات جوڑ نہیں کھاتی کہ روپیہ فراہم کرنے کے لئے فوج کی نوکری کی۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ حضرات جس طرح دینِ اسلام کو کامل و مکمل سمجھتے تھے ایسے ہی ان کی کوشش یہ بھی ہوتی تھی کہ دین کے تمام احکام پر عمل کریں۔ اور شریعت کا جو حکم بھی اہمیت کے ساتھ سامنے آئے اس کی پوری پوری تعمیل کریں۔ جس طرح رب العالمین کا حکم یہ ہے:-

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا ادْخُلُوا فِي السِّلْمِ كَافَّةً - وَلَا تَتَّبِعُوا
خُطُوَاتِ الشَّيْطَانِ - (سورہ بقرہ)

اے مسلمانو! اسلام میں پوری طرح داخل ہو جاؤ کہ اس کے ہر ایک عقیدہ کو تسلیم کرو اور اس کے ہر ایک حکم پر عمل کرو۔ کسی عقیدہ کو مان کر اور کسی سے انکار کر کے یا کسی حکم پر عمل کر کے اور کسی سے معاذ اللہ انکار کر کے، شیطان کی پیروی نہ کرو۔ اسی طرح ارشادِ ربانی یہ بھی ہے۔

إِنَّ اللَّهَ اشْتَرَى مِنَ الْمُؤْمِنِينَ أَنْفُسَهُمْ وَأَمْوَالَهُمْ
بِأَنْ لَهُمُ الْجَنَّةُ يُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ فَيَقْتُلُونَ وَ
يُقْتَلُونَ - (سورہ توبہ)

بیشک اللہ تعالیٰ نے خرید لی ہیں مسلمانوں سے ان کی جانیں اور ان کے مال اس معاوضہ میں کہ ان کو جنت ملے گی۔ یہ مسلمان راہِ خدا میں جہاد کرتے ہیں۔ قتل بھی کئے جاتے ہیں۔ اور دوسروں کو بھی قتل کرتے ہیں۔

جب نفسِ مومن، دین و ملت، ملک و قوم کے تحفظ، دفاع اور قتل و قتال کے لئے خریداجا چکا تو کبھی ایسا بھی ہونا چاہیے کہ اس نہ چپی ہوئی جان کو خریدار کے

دامن میں پھینک دے۔ وہ اس کو اپنے پاس رکھ لے۔ یا کچھ عرصہ کے لئے اس کے پاس رہنے دے۔ فمنہم من قضیٰ نحبہ ومنہم من ینتظر (سورہ احزاب)
 کچھ اپنی نذر اور منت پوری کر چکے (اپنی جان جان آفرین کے حوالہ کر دی) اور کچھ انتظار کر رہے
 ہیں۔ رکب دقت آئے اور کب ہم جان عزیز کی حقیر لو پوچی مالک حقیقی کے سپرد کریں۔

قرآن پاک کے اعجاز اور شیریں بیانی کا بھی کیا ٹھکانا۔ کہ شہید ہونے والوں
 کے لئے فرمایا ہے۔ قضیٰ نحبہ۔ یعنی اس نے اپنی منت پوری کر دی۔ یعنی مومن کی شان
 یہ ہے کہ وہ راہِ خدا میں شہادت کی منت مانگے۔

محدثین کے سر تاج! حضرت محمد بن اسماعیل رحمۃ اللہ علیہ بخاری (امام بخاری
 رحمۃ اللہ علیہ) کے جلیل القدر استاذ سیدنا حضرت عبداللہ بن مبارک۔
 خلافت عباسیہ کے ابتدائی دور میں گزرے ہیں۔ آپ جس طرح جلیل القدر محدث
 و مفسر اور عظیم الشان فقیہ تھے۔ ایسے ہی پر شوکت مجاہد، باہمت و جفاکش مبلغ
 عالی حوصلہ۔ شیخ طریقت بھی تھے۔ آپ نے سال کے بارہ مہینوں کو چار حصوں
 میں تقسیم کر رکھا تھا۔ جس طرح روزہ۔ حج۔ درس و تدریس اور طلب معاش کے
 لئے سال کے مہینے مقرر کئے تھے۔ ایسے ہی سال کا ایک حصہ بہاد کے لئے بھی
 مقرر کیا تھا۔ منشا یہ تھا کہ..... اللہ تعالیٰ سے جو خود اپنی جان کے متعلق عہد
 ہوا ہے۔ اس کی تکمیل ہو۔

کیا وجہ ہے کہ ہم شیخ شمس الدین ترک رحمۃ اللہ علیہ کی اس شرکت فوج
 کو بھی اسی طرح کا فعل نہ مانیں۔ بلاشبہ آپ نے بھی فوج میں شرکت کر کے۔
 "متاع جان" اس کے خریدار اور اس کے مالک حقیقی کی بارگاہ میں پیش کر دی۔
 اور یہ آخری درجہ کی ریاضت تھی جس کی ضرورت خصوصیت سے اس وقت
 تھی جب آپ کو کلیر شریف کے دربار سے پانی پت جلنے کا حکم ہو رہا تھا۔

باقی یہ سوال کہ غیاث الدین بلبن خلیفہ نہیں بادشاہ تھا۔ اور ضروری نہیں تھا کہ اُس کی فوج کشی کو "جہاد" کہا جاسکے۔ یہ سوال اپنی جگہ درست ہے اور اس بنا پر یہ حضرات بادشاہی کاموں سے قطعاً کنارہ کش رہا کرتے تھے۔ لیکن یہ بھی ضروری نہیں ہے کہ ان بادشاہوں کی ہر ایک لشکر کشی غیر اسلامی ہی ہو۔ بادشاہ اگر حملہ آور ہو، تو یہ سوال ہو سکتا ہے کہ یہ حملہ اور یہ اقدام اسلام کی حمایت میں ہے یا ملک گیری کی ہوس میں۔ لیکن اگر بادشاہ ملک سے دفاع کر رہا ہے۔ مثلاً حملہ آور کا مقابلہ کر رہا ہے یا باغی کی بغاوت کچل رہا ہے تو اس صورت میں اس کی امداد و اعانت لامحالہ ضروری ہوگی۔ اور اس جائز بلکہ نہایت ضروری مقصد کے لئے بادشاہ کے ساتھ تعاون کرنا فرض ہوگا۔

غیاث الدین بلبن بادشاہ ضرور تھا۔ مگر صرف مسلمانوں نے نہیں بلکہ ہندو مصنفین نے بھی اعتراف کیا ہے۔ کہ :-

(۱) وہ سختی سے عدل و انصاف پر قائم رہتا تھا۔ اس کے یہاں رورعایت نہیں ہوتی تھی۔

(۲) اُس نے اپنی سلطنت کی توسیع کے لئے دوسرے ملکوں پر یورش نہیں کی مگر اپنی سرحدوں کو ہر طرح محفوظ رکھا۔

(۳) اُس کے بہتر نظم و نسق کا اثر یہ ہوا کہ بغاوتوں کا کہیں نام باقی نہیں رہا۔

(تاریخ ہند، ڈاکٹر اچنر صاحب)

غیاث الدین کے دور حکومت کے دو واقعے نہایت اہم ہیں۔

(۱) ۶۶۸ھ (۱۲۷۹ء) میں بنگال کے حاکم طغور نے بغاوت کر دی۔

بلبن نے بنگال پر فوج کشی کر کے بغاوت فرد کی اور بھسور کو قتل کر دیا۔

(۲) ۶۸۴ھ (۱۲۸۵ء) میں شمالی مغربی سرحد پر مغلوں نے حملہ کیا۔

بلین کا سب سے بڑا اور سب سے لائق اور قابل لڑکا "محمد" اس لڑائی
میں شہید ہوا۔

ان دونوں واقعات میں طغرل کے قتل کروینے پر فقہی نقطہ نظر سے بحث
کی گنجائش ہے۔ لیکن جہاں تک فوج کشی کا تعلق ہے ظاہر ہے کہ دونوں لڑائیاں
شرعی جہاد کا حکم رکھتی ہیں۔ اور صاحب حوصلہ مسلمان پر اگر وہ جہاد کی طاقت رکھتا
ہو۔ جہاد لازم اور ضروری قرار دیتی ہیں۔

اب قرین قیاس یہ ہے کہ حضرت ترک رحمۃ اللہ علیہ مزوری حاصل کرنے
کے لئے فوج میں بھرتی نہیں ہوئے۔ بلکہ تحفظ وطن اور ملک کے امن و امان
کو باقی رکھنے کے لئے فوج میں بھرتی ہوئے۔

حاکم بنگالہ کی بغاوت معمولی بات نہیں تھی، اس کی بغاوت کو فرو کرنے
کے لئے بادشاہ نے امداد و اعانت کی پیام اپیل کی ہوگی۔ اس اپیل پر لبیک کہنا۔
ہر ایک حامی ملک و ملت کا فرض تھا۔ حضرت ترک نے یہ فرض ادا کیا رحمۃ اللہ
اور جیسے ہی یہ فرض ادا ہوا، باغیوں کو شکست ہوئی۔ حضرت ترک فوج سے
خصت ہو کر اپنے شیخ کی خدمت میں حاضر ہو گئے۔

۱۵ حاکم بنگالہ کا قتل اور بادشاہ کی شکست ۶۶۸ھ کا واقعہ بیان کیا گیا ہے۔ اور ہمارے
حساب سے جو دو صفحہ پہلے گزر چکا ہے حضرت شیخ شمس الدین ترک تقریباً ۶۶۸ھ میں فوج میں
بھرتی ہوئے ہیں۔ اب یہ تو معین ہو جاتا ہے کہ جس جنگ میں حضرت شیخ کی شرکت ہوئی وہ یہی
بنگالہ کی جنگ ہے۔ البتہ یہ ہو سکتا ہے کہ بادشاہ نے فوجی بھرتی کا اعلان ۶۶۷ھ میں کیا ہو۔
بہر حال دہلی سے بنگالہ تک سفر کرنے اور اس طویل سفر اور پھر اس عظیم جنگ کی تیاری میں وقت
صرف ہوا ہوگا۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ حضرت خواجہ فرید کی وفات ۶۶۶ھ میں تسلیم کی جائے اور
حضرت شیخ شمس الدین صاحب کی کلیر شریف تشریف آوری ۶۶۳ھ میں مانی جائے تو پندرہ
سال ۶۶۸ھ میں پورے ہوتے ہیں۔ واللہ اعلم

دولت دنیا کمانے کے لئے حضرت ترک نہیں گئے تھے بلکہ فریضہ دینی کا ایک اہم تقاضا تھا۔ اس کو پورا کرنے کے لئے فوج میں بھرتی ہوئے تھے۔ یہ فریضہ دینی یقیناً پانی پت پہونچ کر ارشاد و تبلیغ سے بہت زیادہ اہم تھا۔ اسی بنا پر جب حضرت شیخ کلیری نے پانی پت جلنے کی فرمائش کی تو آپ نے معذرت پیش کی جو فوراً قبول ہوئی۔ کیونکہ معذرت کا حاصل یہ تھا کہ فریضہ جہاد اس وقت تبلیغ و ارشاد کا مقدم ہے یہ خیال بھی ہو سکتا ہے کہ آپ دوسرے معرکہ میں شریک ہوئے ہوں جو مغلوں سے پیش آیا۔ مگر یہ خیال اس بنا پر صحیح نہیں کہ حضرت ترک اس فوج میں تھے جس کی کمان خود بادشاہ کر رہا تھا۔ مغلوں کے مقابلہ میں کمانڈر بادشاہ نہیں تھا۔ بلکہ اس کا محبوب اور قابل فرزند "محمد" تھا جو شہید ہوا۔

اب آئیے کچھ ان حضرت کی روایتوں سے بھی دلچسپی لے لیجئے۔ جو سوانح نگار

حضرات نے بیان فرمائی ہیں جن کے نزدیک عظمت و تقدس کا دار کرامتوں پر ہے۔ صاحب سیرالاقطاب تشریح فرماتے ہیں۔ کہ:-

بادشاہ کسی قلعہ کا محاصرہ کئے ہوئے تھا۔ کافی مدت گزر گئی تھی کہ قلعہ فتح نہیں ہو سکا تھا۔ ایک روز اتفاق سے ایسی آندھی چلی کہ فوج کے خمیے اکٹڑ گئے۔ آندھی کے بعد موسم دھار بارش ہوئی۔ سردیوں کا موسم تھا۔ پورے لشکر کو سخت پریشانی ہوئی۔ آندھی میں جب خمیے بھی اڑ گئے تو شمع یا چراغ کی تو کیا حقیقت تھی۔ سب چراغ بھی بجھ گئے شاہی خیمہ میں بھی اندھیرا ہو گیا۔ اب روشنی اور گرم پانی کے لئے آگ کی ضرورت پڑی۔ تو شاہی باورچی خانہ کا باورچی اور ایک سقہ آگ کی تلاش میں چلے کہ شاید کہیں کوئی چنگاری مل جائے۔ مگر کہیں کوئی چنگاری تو کیا کوئی ٹمٹاتی ہوئی شمع بھی نہیں ملی۔ البتہ کافی فاصلہ طے کرنے کے بعد خرگاہ کے

ایک کنارے پر ایک خمیرہ میں چراغ جلتا ہوا نظر آیا۔ باورچی کو تعجب بھی ہوا۔ کہ یہ شمع کس طرح باقی ہے اور مسرت بھی بے حد ہوئی۔ کہ "طلب" اور جستجو میں کامیابی ہوگئی۔ پھر یہ دونوں اس خمیرہ کی طرف لپکے۔ دیکھا کہ ایک بزرگ تشریف فرما ہیں۔ شمع سامنے ہے اور وہ خود تلاوت کلام پاک میں مشغول ہیں۔ باورچی قریب پہنچا مگر اس کی ہمت نہیں ہوئی کہ تلاوت کے مقدس مشغلہ میں خلل انداز ہو۔ دفعۃً خود اس بزرگ کی نظر اٹھی۔ دیکھا ایک شخص کھڑا ہے۔ فرمایا۔ کیا بات ہے؟ اس وقت یہاں کیسے؟ عرض کیا۔ شاہی باورچی خانہ کا انچارج ہوں۔ آگ کی ضرورت ہے۔ پورے لشکر میں گھوم لیا۔ آگ تو آگ کہہیں چراغ بھی نہیں جل رہا۔ آپ کے یہاں شمع روشن ہے۔ اجازت ہو تو اس سے اپنی شمع روشن کر لوں۔ بزرگ۔ شوق سے اپنی شمع روشن کیجئے۔

بہر حال باورچی نے شمع روشن کی۔ ایک لکڑی میں آگ لگا کر جلتی ہوئی لکڑی باورچی خانہ میں لے گیا۔ اور وہاں اپنا کام شروع کر دیا۔ اس وقت تو باورچی کے ساتھ سقا بھی چلا گیا۔ مگر اس کو سخت حیرت رہی کہ "یہ درویش" کون ہیں؟ جن کے انقاس قدسیہ میں یہ طاقت ہے کہ آندھی کی سرتابیوں کو بھی وہ مطیع اور فرماں بردار بنا دیتے ہیں۔

سردیوں کی رات دراز ہوتی ہے۔ سقا جو جو حیرت تھا۔ جب سونے کے لئے لیٹا تو نیند غائب تھی۔ خدا خدا کر کے آنکھ لگی تو پھر فوراً ہی کھل گئی۔ بالآخر اس سے نہ رہا گیا۔ جیسے ہی تہجد کا وقت ہوا۔ سقا اپنا بستر چھوڑ کر کھڑا ہو گیا۔ اور اسی خمیرہ پر پہنچا کہ ان بزرگ صاحب کی زیارت کر سکے۔ مگر اس کو بہت افسوس ہوا۔ جب اُس نے دیکھا کہ وہ بزرگ خمیرہ سے غائب ہیں۔ مگر وہ مایوس نہیں ہوا۔ اس نے ادھر ادھر نظر دوڑائی تو کنارہ پر ایک تالاب نظر آیا۔ سقا اس طرف چلا۔

قریب پہنچا تو دیکھتا ہے ایک صاحب ایک گھاٹ پر تشریف فرما ہیں۔ اور بڑے اطمینان سے وضو کر رہے ہیں۔ سردی سخت ہے۔ پالا پڑ رہا ہے۔ پانی جما جا رہا ہے۔ اس سقے کی حالت یہ ہے کہ ہاتھ پاؤں کھڑے جا رہے ہیں۔ مگر یہ بزرگ بڑے اطمینان سے سنن و سجدات کے ساتھ وضو فرما رہے ہیں۔

آگے بڑھ کر سقے نے کچھ اور غور سے دیکھا تو پہچان لیا کہ یہ وہی بزرگ ہیں جن کی پیشانی شمع کی روشنی میں خیمہ کے اندر چمک رہی تھی۔ سقے اس وقت کچھ نہیں بولا۔ البتہ جب وہ بزرگ اپنے خیمہ میں پہنچ چکے تو سقہ تالاب کے گھاٹ پر اسی جگہ پہنچا۔ جہاں اس خیمہ والے بزرگ نے وضو کیا تھا۔ سقے نے ڈرتے ڈرتے پانی میں ہاتھ ڈالا کہ پانی کھڑا ہوا ہے۔ ہاتھ بھی سن ہو جائے گا۔ مگر اس کو سخت تعجب ہوا کہ جہاں سے ان بزرگ صاحب نے وضو کیا تھا۔ وہاں پانی گرم ہے۔ ٹھنڈک کا نام نہیں۔ بہر حال سقے نے بھی وضو کیا۔ پھر مشکیزہ میں پانی بھر لیا۔ اور لشکر گاہ میں لے کر آیا۔ بادشاہ کی وضو کا وقت آیا تو اسی پانی سے وضو کرایا۔ سقے نے یہ سب کچھ دیکھا۔ مگر وہ فیصلہ نہ کر سکا کہ ماجرا کیا ہے۔ غالباً اس کو یہ خیال ہوا کہ ممکن ہے یہاں گندک کا چشمہ ہو۔ جس کی وجہ سے پانی گرم رہتا ہو۔ اگلی شب وہ خیمہ والے بزرگ کے وقت سے پہلے اس گھاٹ پر پہنچ گیا۔ اس نے پانی میں ہاتھ ڈال کر دیکھا۔ تو پانی سخی تھا۔ اس کا ہاتھ بھی ٹھہر گیا۔ اب یہ ایک کنارہ پر آئیں کھڑا ہو گیا اور خیمہ والے بزرگ کی آمد کا انتظار کرنے لگا۔

تھوڑی دیر میں وہ بزرگ آئے۔ گھاٹ پر پہنچے تو اس نے محسوس کیا کہ پانی میں ایک طرح کی لہر پڑی ہوئی۔ ان صاحب کرامت بزرگ نے سب معمول اطمینان سے وضو کیا۔ اور اپنے خیمہ میں تشریف لے گئے۔ اب یہ سقہ آیا۔ اور اس نے پانی میں ہاتھ ڈالا تو پانی گرم تھا۔ اب اس کو یقین ہو گیا کہ یہ گندک کی حرارت نہیں۔ بلکہ اس

بزرگ کی کرامت ہے۔ اب اس لئے اس کا چرچا شروع کیا۔ رفتہ رفتہ بادشاہ تک خبر پہنچی۔ بادشاہ نے سقے کو طلب کر کے پورا قصہ سنا۔ پھر وہ آخر شب میں خاص طور پر تالاب پر گیا۔ اور سقہ کی طرح پہلے پانی کو دیکھ لیا تو پانی ٹھنڈا تھا۔ پھر بزرگ آئے، وضو کیا۔ جب وہ واپس ہوئے اور بادشاہ نے آکر پانی میں ہاتھ ڈالا تو پانی گرم تھا۔ اب بادشاہ کو بھی عقیدت ہو گئی۔ اور تحقیق شروع ہوئی کہ یہ کون صاحب ہیں۔ کہاں سے آکر فوج میں بھرتی ہوئے ہیں۔ جب بادشاہ کو ان کے بلند مرتبہ کا اندازہ ہوا۔ تو اس نے آپ سے دعا کی استعداکی سیر لاقطاب، کالفاظ یہ ہیں کہ بادشاہ نے عرض کیا:-

زہے طالع و سعادت من کہ مثل شما دوست خدا در عسکر من بود۔
 با ایں ہمہ ہزار حیف کہ ایں قلعہ فتح نمی شود۔

دیری بہت بڑی خوش نصیبی اور سعادت ہے کہ آپ جیسے خدا کے دوست میرے لشکر میں ہیں۔ مگر پھر ہزار افسوس کہ یہ قلعہ فتح نہیں ہوتا۔

بادشاہ کے جواب میں حضرت شمس نے بہت زیادہ تواضع اور انکساری سے کام لیا۔ اپنی بے حقیقتی اور عاجزی ظاہر کی۔ مگر بادشاہ دعار کے لئے اصرار ہی کرتا رہا۔ مجبوراً حضرت شمس نے دعار کے لئے ہاتھ اٹھائے۔ اور جب دعار سے فارغ ہوئے تو بادشاہ سے فرمایا کہ

"فورا سوار ہو جئے اور حملہ کر دیجئے۔ انشار اللہ فتح ہوگی۔"

بادشاہ نے ارشاد گرامی کی تعمیل کی اور خدا کا فضل ہوا کہ قلعہ فتح ہو گیا۔ یہ تو کرامت ہوئی۔ اب ایک دوسرے لطیفہ ملاحظہ فرمائیے۔ یہی مصنف سیر لاقطاب جس نے دو صفحہ پہلے کہا تھا کہ کچھ مزدوری کمانے کے لئے فوج میں بھرتی ہوئے تھے۔ اس قصہ کے نقل کرنے کے بعد تحریر فرماتے ہیں۔ کہ

"اگلے روز بادشاہ نے ارادہ کیا کہ پابریہ خدمت مبارک میں حاضر

ہو۔ اور عقیدت کے پھول پیش کرے۔

ظاہر ہے۔ بادشاہ کے عقیدت کے پھول کس قدر قیمتی ہوتے۔ مگر مصنف مذکور تحریر فرماتے ہیں کہ حضرت شمس الدین رحمۃ اللہ علیہ کو جیسے ہی نور باطن سے بادشاہ کے ارادہ کا علم ہوا۔ فوراً روانگی کی تیاری کر لی۔ آپ کا گھوڑا نہایت قیمتی تھا۔ آپ نے اس کو ساز و سامان سے آراستہ کیا۔ اور فرمایا کہ فلاں بیوہ کے یہاں بالغ لڑکی ہے۔ اس کے فقر اور مسکینی کے سبب سے کہیں سے لڑکی کا رشتہ نہیں آتا۔ تو اس بیوہ کے پاس پہنچ جا۔ وہ تجھ کو فروخت کر کے اپنا کام چلا لے گی۔ گھوڑا اس بیوہ کے یہاں پہنچا۔ ادھر اس بیوہ کو غیب سے آواز آئی کہ ایک درویش کا عطیہ پہنچ رہا ہے۔ تو اس کو فروخت کر کے اپنا کام چلا۔

حضرت شمس نے اپنے قیمتی گھوڑے سے تو یہ کام لیا۔ اس کے بعد جو کچھ تھا

”بقول سیرالاقطاب“

باقی ہرچہ بود آنحضرت اسباب خود را بفقراء بداد و خود دلق پوشیدہ
از لشکر برآمد و بخدمت پیر خود رسید۔

ر باقی جو کچھ تھا۔ حضرت نے اپنا تمام اسباب فقرار کو تقسیم کر دیا۔ اور خود ایک
گڈری پہن کر لشکر کے حلقہ سے باہر تشریف لائے۔ پھر اپنے پیر کی خدمت
میں پہنچ گئے۔

بہر حال مزدوری اور دولت تو حضرت شمس کے نہ پہلے پیش نظر تھی۔ بعد میں
جہاد کے لئے آپ نے قیمتی گھوڑا بھی خریدا تھا۔ اور سامان و اسباب بھی فراہم کیا
تھا۔ مقصد پورا ہو گیا۔ جہاد ختم ہو گیا۔ تو جو کچھ فراہم کیا تھا۔ وہ بھی راہ خدا میں خرچ
کر کے اپنے پیر کی خدمت میں حاضر ہو گئے۔

فریضہ جہاد کی ادائیگی کے وقت نوافل اور مستحبات کا ثواب دو چہرہ اور

چہار چنڈ ہو جاتا ہے۔ ذکر و اذکار کی بھی یہی شان ہے کہ قلب صوبہ بری زمانہ جہاد میں ذکر و مراقبہ سے دو چنڈ و چہار چنڈ نور حاصل کرتا ہے۔ اب حضرت شمس اس نور کامل کے ساتھ حضرت شیخ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو ارشاد ہوا کہ نور کو گوشہ میں چھپ کر نہیں رہنا چاہیے۔ اس کو میدان میں پہنچ کر پورے ماحول کو روشن کرنا چاہیے۔ لہذا آپ پانی پت پہنچ کر اللہ کے دیئے ہوئے نور کو پھیلائیں۔ اور بقول صاحب معارج الولاہیت حضرت شمس نے جب عرض کیا۔

آنجا شرف الدین بوعلی قلندر رست۔ ماندن من درانجا بچہ طور صورت پذیر خواهد بود۔

روہاں حضرت قلندر صاحب موجود ہیں۔ میں وہاں کس طرح رہ سکوں گا، تو حضرت شیخ نے ارشاد فرمایا:-

ولایتش باخر رسید۔ چوں تو در آنجا خواہی رسید او از شہر بدخواہ آمد ان کی ولایت ختم ہو رہی ہے (غالباً اس لئے کہ ان پر جذب غالب ہو چکا ہے اب وہ ارشاد و تربیت نہیں کر سکتے) جب تم وہاں پہنچ جاؤ گے تو وہ شہر سے باہر شریف لے جائیں گے۔

چنانچہ ایسا ہی ہوا جیسا کہ دوسرے موقع پر حضرت قلندر صاحب کے حالات میں تفصیل سے عرض ہو چکا ہے۔

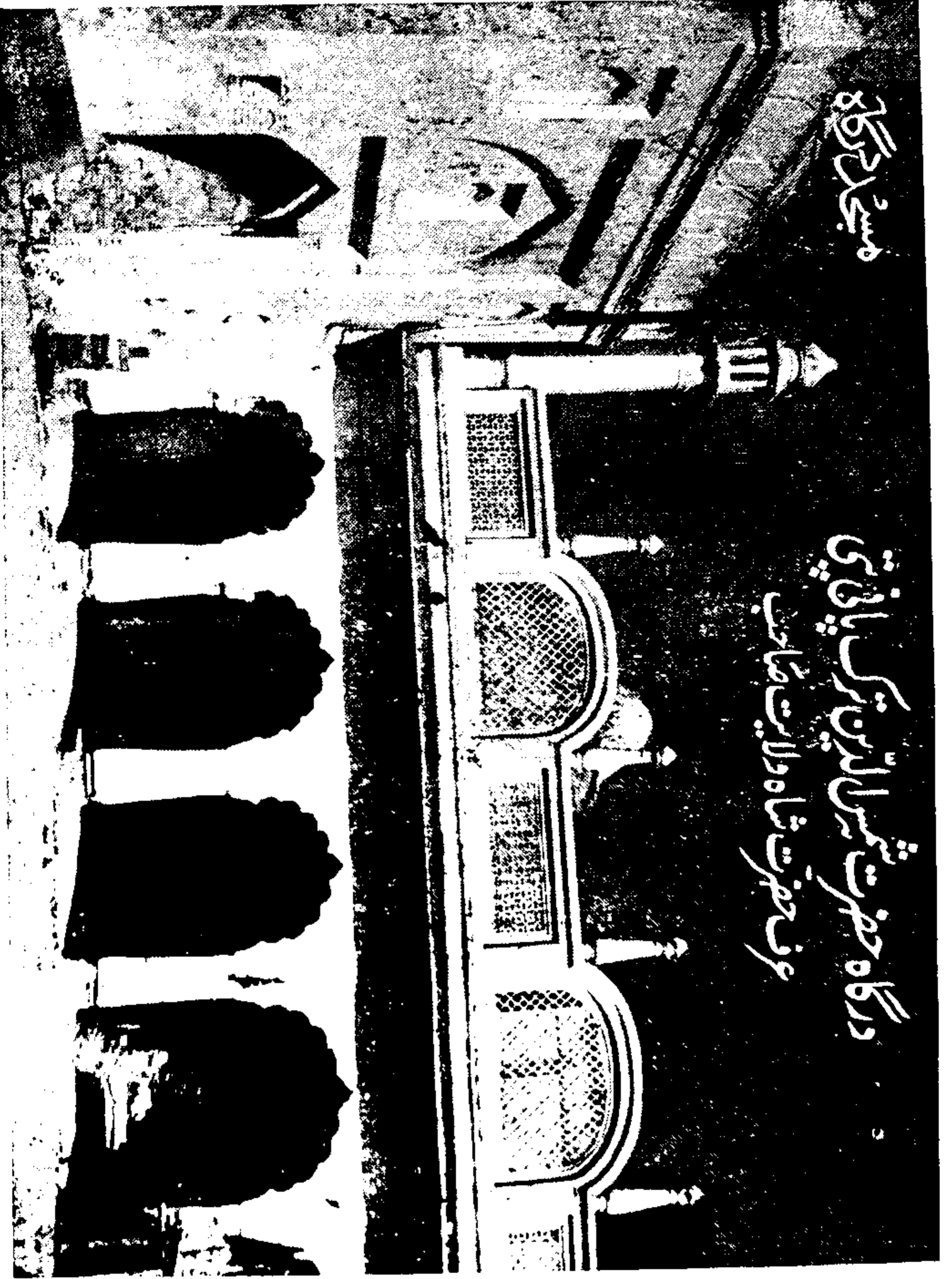
پہلے گذر چکا ہے کہ حضرت خواجہ شمس الدین ترک رحمۃ اللہ علیہ پانی پت پہنچے۔ تو قطعاً غیر معروض

پانی پت میں تشریف آوری

تھے۔ نہ پانی پت میں آپ کسی کو جانتے تھے نہ کوئی آپ کو جانتا تھا۔ آپ قلندرانہ چری لباس پہنے ہوئے پانی پت رونق افروز ہوئے۔ اور ایک دیوار کے سایہ میں (اور ایک روایت کے بموجب حضرت امام بدر الدین بدر عالم رحمۃ اللہ علیہ کے مزار کی دیوار پر)

ہسبنا حراکۃ

درگاہ حضرت شمس الدین تبرک پانی پتی
عرف حضرت شاہ ولایت صاحب



بیٹھ گئے۔ شیخ بوعلی شرف الدین قلندر رحمۃ اللہ علیہ سے آپ کا تعارف ضرور تھا۔ مگر شاید ملاقات کبھی نہیں ہوئی تھی لیکن اس تعارف کی شان عجیب تھی۔ ملاحظہ ہو۔

حضرت قلندر صاحب کو نور باطن اور کشف کے ذریعہ آپ کی تشریف آوری کا علم تو ہو گیا۔ اور آپ نے اپنے عزیز منظور نظر حضرت جلال الدین صاحب سے فرمایا دیا کہ تمہارے پیارے گئے۔ فلاں جگہ بیٹھے ہوئے ہیں جاؤ زیارت کر لو۔ ایک حلوانی کے لڑکے کو بھی اطلاع دیدی۔ مگر خود ایک اجنبی مہمان کی مدارات اس طرح کی کہ اپنا پوریا بستر باندھ کر شہر سے باہر تشریف لے گئے۔ "طاقت مہمان نداشت خانہ بمہمان گذاشت" یعنی ناشتہ یا کھانا پیش کرنے کے بجائے فی الواقع اپنا مسکن پیش کر دیا۔ چنانچہ یہ بھی روایت ہے کہ حضرت ترک حضرت قلندر صاحب کے حجرہ میں سکو پذیر ہوئے۔

بہر حال اگر ہماری طرح خاطر مدارات کرتے تو آپ کو "قلندر" ہی کیوں کہا جاتا۔ اب اس نوار دہمان کی پیش کش بھی ملاحظہ فرمائیے۔ (وردوع برگردن راوی) سیرالاقطاب کی روایت ہے :-

حضرت خواجہ شمس الدین ترک رحمۃ اللہ علیہ نے پانی بت میں قیام کے بعد ایک پیالہ میں دودھ بھر کر خادم کے ہاتھ حضرت قلندر صاحب کی خدمت میں بھیجا۔ اور کہا کہ برادر م شرف الدین قلندر صاحب کو ہمارا سلام پہنچا کر یہ کٹورا پیش کر دو۔

جب حضرت قلندر صاحب کی خدمت میں یہ دودھ سے لبریز پیالہ پیش کیا گیا تو آپ نے اس میں ایک گلاب کا پھول ڈال دیا۔ اور واپس کر کے فرمایا کہ یہ برادر م شمس الدین کی خدمت میں سلام کے بعد پیش کر دیں۔

جب خادم نے اس معمرہ کی شرح چاہی تو حضرت خواجہ نے فرمایا کہ دودھ

سے لبر تری پیالہ کھینچنے کا مقصد یہ تھا۔ کہ یہ شہر اب میری ولایت سے معمور ہو چکا ہے اب حضور والا کے لئے یہاں گنجائش نہیں رہی۔

اس کے جواب میں قلندر صاحب کی طرف سے پھول ڈال کر واپس کرنے کا مطلب یہ ہے۔ کہ ولایت آپ کو مبارک رہے۔ میں اس شہر میں آپ کی ولایت کے باوجود پھول کی طرح تیرتا رہوں گا۔

اس واقعہ کو نقل کرنے کے بعد راوی کا ارشاد ہے۔

چنانچہ ہر دو حضرات میں نہایت گہرے مراسم رہے۔ جس طرح شیخ جلال الدین رحمۃ اللہ علیہ دونوں کے مشترک نور نظر ہے۔

ان دونوں بزرگوں کے گہرے مراسم مسلم اور یہ بھی تسلیم ہے کہ حضرت تبصرہ شیخ جلال الدین صاحب پر دونوں بزرگوں کی غیر معمولی شفقت تھی۔

لیکن جب کہ حضرت قلندر صاحب پہلے ہی پانی پیت چھوڑ چکے تھے۔ اور آپ نے شہر سے باہر تشریف لے جا کر ڈیرہ ڈال دیا تھا تو پھر ان رموز اور معنیوں کی ضرورت کیا تھی۔ اور کیا حضرت شمس الدین ترک کا وسیع ظرف اور آپ کے اعلیٰ اخلاق اس کی اجازت دے سکتے تھے کہ وہ اپنی ولایت کو اس طرح جتائیں۔ دنیا کے جاہ پسند تو ایسا کر سکتے ہیں۔ مگر

کار پاکاں راقیا س از خود لگیر

پھر یہ شان تو بادشاہوں کی ہوتی ہے کہ بقول حضرت شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ "دو بادشاہ در یک اقلیم نہ گنجند" دو بادشاہ ایک ولایت (مملکت) میں نہیں سما سکتے۔ باقی درویشوں کی شان تو حضرت سعدیؒ نے یہ بیان فرمائی ہے۔ کہ۔ "ہفت درویش در یک گلیم نجسپند" یعنی ولایت اور مملکت تو درکنار ایک کسبل میں سات درویش سو سکتے ہیں۔

کرامت کے ذریعہ سید ہونے کا ثبوت | سیرالاقطاب کی روایت ہے کہ پانی پت کے سادات کو جب علم ہوا کہ آپ بھی

سید ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں تو آپ سے ثبوت طلب کیا۔ آپ نے فرمایا۔ میں نے اپنے ابا و اجداد سے یہی سنا ہے اور ہمارے یہاں شجرہ نسب بھی موجود ہے۔ یہ معترض صاحب اس جواب سے مطمئن نہیں ہوئے۔ تو حضرت شمس رحمۃ اللہ علیہ کو جوش آگیا۔ اور فرمایا۔ عوام میں مشہور ہے کہ جو شخص صحیح النسب حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کی اولاد میں سے ہوتا ہے۔ آگ میں اس کا بال بھی نہیں جلتا۔ اگرچہ اب تک اس عقیدہ کا تجربہ نہیں ہوا ہے۔ مگر میرے خیال میں آج وقت ہے کہ اس کا تجربہ کیا جائے۔ اس کے تجربہ کے لئے اس وقت سے بہتر کوئی وقت نہیں ہو سکتا۔ بس آئیے۔ میں اور آپ دونوں اس تنور میں کود جائیں۔ اور تجربہ کر لیں۔ حضرت خواجہ شمس نے جیسے ہی یہ بلہ ختم فرمایا۔ فوراً ایک "تنور" میں رجویں خانقاہ میں یا خانقاہ کے پاس دھک رہا تھا، کو دوپڑے " اور وہاں سے سید صاحب کو آواز دی کہ "آپ بھی تشریف لائیے۔" اب یہ پانی پتی سید صاحب بہت پریشان اور شرمندہ ہوئے۔ تنور کے کنارے پر پہنچ کر جھانکا۔ تو دیکھا حضرت شمس اطمینان سے تنور کے اندر تشریف فرما ہیں۔ گویا آپ سمندر آگ کا کیرا ہیں۔ سید صاحب نے یہ تماشہ تو دیکھا۔ مگر تنور میں کود پڑنے کی ہمت پھر بھی نہیں ہوئی۔ بلکہ جب تنور کو جھانک کر سید صاحب واپس ہونے لگے تو ان کے دامن کو آگ لگ گئی۔ اب سید صاحب نے بدحواس ہو کر چلانے شروع کیا۔ تو حضرت شمس تنور سے باہر تشریف لائے اور اپنے ہاتھ سے دامن کی آگ بجھائی۔ پانی پتی سید صاحب بہت نادام ہوئے اور نوبہ کی۔ پھر حضرت شمس رحمۃ اللہ علیہ سے بیعت ہو گئے۔

ہم اولیاء کرام کی کرامات کے قائل ہیں ہمیں بھی یقین ہے کہ سید کے تبصرہ | بال نہیں جلتے۔ مگر یہ کرامت اس کوئلے اور لکڑی کی آگ میں ظاہر نہیں ہوتی۔ بلکہ ظلم اور مصائب کی آگ میں اس کرامت کا ظہور ہوتا ہے۔ سید وہی ہے کہ جبر و قہر کا نور اس کو جلائے کے بجائے اور نکھار دے۔
حضرت جوہر نے فرمایا:-

”اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد“

آپ فرما سکتے ہیں:-

”سادات زندہ ہوتے ہیں ہر کربلا کے بعد“

حضرت شمس الدینؒ کی خدمات | آپ کی جلیل القدر خدمات کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ سلسلہ صابریہ

کے وہ آفتاب ہیں کہ نورد ہدایت کی جتنی بھی شعاعیں پھوٹ رہی ہیں وہ آپ ہی کی کرنیں ہیں۔ بقول راوی۔

حضرت مخدوم صابر پاک کی حیات میں آپ کا ایک پیر بھائی دہلی سے کلیر پہنچا۔ بھائیوں میں بات چیت ہونے لگی۔ اسی آشنا میں دہلوی صاحب کو معلوم ہوا کہ حضرت مخدوم صابر کے صرف ایک مرید ہیں تو بہت تعجب ہوا کیونکہ حضرت صابر کے دوسرے پیر بھائی اور حضرت بابا فرید کے دوسرے خلیفہ حضرت شیخ نظام الدین اولیاء رحمۃ اللہ علیہ کے اتنے مرید تھے کہ ان کا شمار کرنا مشکل تھا۔ چنانچہ جب حضرت مخدوم صابر نے ان دہلوی صاحب سے دریافت فرمایا۔ کہ برادر مخدوم نظام الدین کے کتنے مرید ہیں تو دہلوی صاحب نے جیسے جواب دیا۔
”جتنے آسمان پر تارے“ اس پر حضرت مخدوم صابر کلیری رحمۃ اللہ علیہ

کو جوش آگیا۔ اور آپ نے فرمایا:-

”جب میرا شمس آسمانِ طریقت پر تاباں ہوگا تو سارے تارے
مانڈ پڑ جائیں گے۔“

واقعہ یہ ہے کہ حضرت مخدوم کلیری رحمۃ اللہ علیہ کی یہ پیشین گوئی بڑی حد تک
صحیح ثابت ہوئی۔

اس وقت (۱۳۸۲ھ میں) اگر شمار کیا جائے تو سلسلہ صابریہ کے متوسلین کی
تعداد زیادہ ہوگی۔ اس سے آگے کچھ عرض کرنا سوراوہ ہے۔

مولانا غلام سرور فرماتے ہیں۔ کہ
سیرالاقطاب۔ تذکرۃ العاشقین

حضرت شمس رحمۃ اللہ علیہ کی وفات

اور معارج الولاہیت وغیرہ میں آپ کا سال وفات سات سو نپندرہ ہجری بیان کیا
گیا ہے۔ اور مصنف شجرہ چشتیہ نے سال وفات سات سو اٹھارہ قرار دیا ہے۔ مگر
زیادہ تر ۱۵۱۵ھ ہی سال وفات بیان کیا گیا ہے۔

۱۵۱۵ھ (عہد شاہجہانی) کا واقعہ ہے کہ ایک صاحب سید صفدر نام
اولاد | شاہجہاں بادشاہ کی طرف سے خان کا خطاب حاصل کئے ہوئے تھے
اس لئے سید صفدر کے بجائے صفدر خاں سید کہلاتے تھے۔ وہ اکبر آباد آگرہ کے
صوبہ دار تھے وہ کسی وجہ سے وہاں منتقل کر دیئے گئے یا معزول کر دیئے گئے۔ تو
وہلی جاتے ہوئے ”پانی پت“ میں فروکش ہوئے۔ یہاں کے بزرگوں سے ملے۔ غلام
سے ملاقاتیں کیں۔ مزارات پر حاضری دی۔ وہ شہر کے ایک کنارے پر ایک بزرگ
کے مزار پر بھی حاضر ہوئے۔ جو شیخ شمس الدین ترک کا مزار کہلاتا تھا۔ جن کی وقت
کو تقریباً ساڑھے تین سو برس گزر چکے تھے۔

حضرت ترک کے مزار کے مجاوروں سے بات چیت ہوئی۔ کچھ حضرت ترک

کے حالات معلوم کئے اور جب یہ سنا کہ یہ بزرگ "ترکستان" سے تشریف لائے تھے تو ایک جستجو ذہن میں پیدا ہوئی۔

سید صفدر صاحب ترکستان کے رہنے والے تھے۔ ان کا وہی شہر تھا جو حضرت ترک کا وطن اصلی بتایا گیا۔ ان کے بزرگوں میں سے ایک صاحب بیوی بچوں کو چھوڑ کر فقیری اختیار کر کے لاپتہ ہو چکے تھے۔ سید صفدر نے خاندان کے بڑے بوجھوں سے ان کا تذکرہ سنا تھا۔ ان لاپتہ ہونے والے بزرگ کا نام بھی شمس الدین ہی تھا۔ یہ خواجہ شمس الدین ترک جو سلسلہ صابریہ کے "میزاب رحمت" ہیں۔ کیا وہی دادا شمس الدین ہیں۔ جن کی گم شدگی کا قصہ اپنے بزرگوں سے سنا تھا؟ اس کی تحقیق کس طرح ہو۔؟ کیا یہاں ان کا کوئی شجرہ نسب ہے؟

ان مجاوروں سے جب بات چیت ہوئی تو معلوم ہوا کہ حضرت "ترک" کا شجرہ نسب بعد کا تو نہیں ہے۔ کیونکہ حضرت ترک نے شادی ہی نہیں کی تھی البتہ حضرت ترک سے پہلے بزرگوں کا شجرہ نسب موجود ہے۔ سید صفدر کو جس طلب اور جستجو کی لگن لگی ہوئی تھی۔ یہ خبر اس کے لئے مردہ جانفزا تھی۔

متولی اور مجاور حضرات سے درخواست کی کہ مہربانی فرما کر وہ شجرہ لائیں۔ شجرہ منگایا گیا۔ ایک شجرہ اپنے نسب کا خود صفدر صاحب نے بھی محفوظ کر رکھا تھا۔ اور آج کل اس کی قدر ہو یا نہ ہو۔ لیکن اس زمانہ میں جب شاہی ملازمتوں میں بڑی حد تک نسب اور خاندان کا لحاظ رکھا جاتا تھا۔ شجرہ نسب جو مقامی بزرگوں اور عمائدین کی مہروں سے آراستہ ہو بہت ہی قیمتی چیز تھا۔ اور ایک قیمتی دستاویز کی طرح محفوظ رکھا جاتا تھا۔ بہر حال سید صفدر صاحب نے بھی اپنا محفوظ شجرہ نسب سامنے رکھا۔ اور مقابلہ کیا تو بعینہ ایک دوسرے کی نقل تھا۔

اب جس طرح مجاور صاحبان کے پیش کردہ شجرہ کی تصدیق ہوئی اس حقیقت کا بھی

انکشاف ہو گیا کہ حضرت ترک رحمۃ اللہ علیہ لا ولد نہیں تھے۔ بلکہ آپ کے خلف رشید "سید احمد تھے۔ وہ اپنی والدہ کے ساتھ وطن ہی میں رہے۔ ان کے سلسلہ میں خدانے برکت بخشی۔ ان کے متعدد اولاد تھے۔ اور یہ سید صفدر صاحب انھیں کی اولاد میں سے ہیں۔

سید صفدر صاحب جو آج تک پانی پت میں اجنبی تھے اور اگرچہ شاہی فسر رہے تھے۔ مگر معزول ہونے کے بعد غریب الدیار مسافر تھے۔ اب وہ بزرگان پانی پتا کے پیرزادہ ہو گئے۔ ایک پیرزادہ کی طرح ان کی خاطر مدارات ہونے لگی۔ شاہی وقائع نگار اس زمانہ میں ہر ایک مرکزی مقام پر رہتے تھے۔ پانی پتا بھی مرکزی حیثیت رکھتا تھا۔ یہ واقعہ بہت ہی عجیب تھا کہ حضرت ترک رحمۃ اللہ علیہ جو ساڑھے تین سو برس تک لا ولد تسلیم کئے گئے تھے۔ آج وہ ایک عظیم الشان اور بہت وسیع خاندان کے مورث اعلیٰ ثابت ہو گئے۔ اور یہ صفدر صاحب اور ان کے خاندان کے بزرگ حضرت ترک کے خلف ہیں۔ وقائع نگار نے اس عجیب و غریب خبر کی رپورٹ ضرور کی ہوگی۔ جس کا اثر شاہجہاں بادشاہ پر یہ پڑا کہ ان کی معزولی کو بجالی سے بدل دیا۔ بلکہ غالباً کسی قدر ترقی دے کر ان کو کابل اور قندھار کا صوبہ دار بنا دیا۔

صاحب سیر الاقطاب تحریر فرماتے ہیں کہ صفدر خاں سید اور ان کے جانشین اگرچہ بڑے بڑے عہدوں پر فائز رہے۔ ان میں سے بعض ایسے بھی تھے۔ جن کو پنجہزاری منصب عطا ہوا تھا۔ مگر انداز ان سب کا درویشانہ تھا۔ خدا پرست غریبوں کے ہر درد۔ ہر ایک کے کام آئے واسلے۔ نہایت سہمان نواز۔ بااخلاق۔ بلند توحید۔ (رحمہم اللہ)

مخدوم المشائخ شیخ محمد جلال الدین

کبیر الاولیاء عثمانی قدس سرہ

یا وہوگا حضرت قلندر صاحب نے ایک نوجوان کو دیکھا جو اسپ تازی
پر سوار کہیں جا رہا تھا۔ تو فرمایا تھا۔

زہے اسپ و زہے سوار

(کیا خوب گھوڑا۔ اور کیا خوب سوار)

پھر اسی قلندر اہ شان میں برجستہ یہ شعر موزوں فرما دیا تھا۔

گل گول لباس کر دو سوار سمند شد

یاراں حذر کنید، آتش بلند شد

لباس گلگول کیا اور سرخ رنگ کے عمدہ گھوڑے پر سوار ہوا۔ دوستو!

احتیاط سے کام لو۔ آگ بلند ہو گئی ہے۔

پھر آپ نے یہ بھی ملاحظہ فرمایا ہوگا۔ کہ اس قلندر اہ شعر کا اثر اس

نوجوان پر یہ ہوا تھا۔

"ہرچہ از دنیا بدست داشتند۔ ازال بیرون آمد و آل اسپ

رائیر شد یکے دادوراه صحرا گرفت"

(دنیا داری کی جتنی بھی چیزیں تھیں سب سے کنارہ کش ہو گئے۔ اس گھوڑے

کو بھی اللہ کے واسطے کسی کو دیدیا۔ اور صحرا کا راستہ اختیار کیا۔ رحمہ اللہ)

آپ شاید پہچان گئے ہوں۔ یہ نوجوان کون تھے۔ ؟

نام نامی | یہ وہی جوان صالح تھے جن کا نام والد صاحب مرحوم نے محمد رکھا تھا۔ پیر روشن شمیر نے "جلال الدین" تجویز کیا۔ ارشاد و طریقت کے گوہر شناسوں نے کبیر الاولیاء کا خطاب دیا۔ اور عوام میں "مخدوم صاحب" کے "خطاب بزرگ" سے مشہور ہوئے۔

وطن اور سلسلہ نسب | خواجہ عبدالرحمن صاحب گاڈرونی۔ پانچویں صدی ہجری کے ایک بزرگ تھے سلسلہ نسب اگرچہ خلیفہ سوم حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ تک پہنچتا تھا۔ مگر آپ کے ایک مورث (اتفاق سے اُن کا نام نامی بھی عبدالرحمن ہی تھا) مدینہ طیبہ سے منتقل ہو کر "گاڈرون" آگئے تھے۔

خواجہ عبدالرحمن گاڈرونی محمود غزنوی کی فوج میں کسی منصب پر فائز تھے۔ اور محمود غزنوی نے ہندستان پر حملہ کیا تو یہ اس کے ساتھ تھے۔ محمود واپس چلا گیا۔ اور یہ پانی پت میں سکونت پذیر ہو گئے۔ پھر شاہی فرمان کے ذریعہ پانی پت کا پورا علاقہ آپ کے سپرد ہو گیا۔
حضرت مخدوم خواجہ محمد جلال الدین کبیر الاولیاء رحمۃ اللہ آپ ہی کی اولاد میں ہیں۔ اور اسی لئے آپ کو گاڈرونی کہا جاتا ہے۔
سلسلہ نسب یہ ہے۔

شیخ جلال الدین کبیر الاولیاء رحمۃ اللہ علیہ۔ ابن خواجہ محمود ابن خواجہ یعقوب ابن خواجہ عیسیٰ ابن خواجہ اسمعیل ابن خواجہ محمد ابن خواجہ ابی بکر ابن خواجہ علی۔ ابن خواجہ عثمان ابن خواجہ عبد۔ ابن خواجہ عبدالرحمن ثانی۔ ابن خواجہ عبدالعزیز سرخی۔ ابن خواجہ خالد ابن خواجہ ولید۔ ابن خواجہ عبدالعزیز اکبر۔ ابن خواجہ عبدالرحمن اکبر ابن خواجہ عبداللہ ثانی۔ ابن خواجہ عبدالعزیز۔ ابن عبداللہ کبیر ابن

مسجد درگاہ حضرت مخدوم شیخ جمال الدین کبیر الاولیاء



حضرت خواجہ عمر و ابن امیر المومنین ذی النورین حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ۔
 خواجہ عبدالرحمن اکبر جو ۱۵۰۵ء میں مدینہ طیبہ سے گاؤں تشریف لائے
 اور خواجہ عبدالرحمن ثانی جو نمبر ۱۰۰ میں پانی پت رونق افروز ہوئے۔ رحمہم اللہ
 حضرت کبیر الاولیاء کا بچپن ہی تھا کہ والد ماجد کا سایہ سر
 سے اٹھ گیا تھا۔ عم محترم نے پرورش کی۔

سلسلہ پرورش

سوانح کی کتابیں جو ہمارے سامنے ہیں ان میں تعلیم کا تذکرہ
 نہیں ملتا۔ البتہ صاحب سیر الاقطاب نے بلیغ انداز
 میں تحریر فرمایا ہے:-

(۱) از ایام طفلی محبت الہی و جذبہ شوق در گاہی گریباں گیر وقت
 ایشان بود۔ و اکثر سر بصر انہادے و مشغول بذکر خدا ماندے۔
 ترجمہ:- بچپن ہی سے اللہ کی محبت اور شوق درگاہ خداوندی کا جذبہ۔ آپ
 کے اوقات عزیز کے گریبان سے الجھا ہوا تھا۔ اکثر ایسا ہوتا کہ اسی ذوق و
 شوق میں آپ کسی جنگل میں پہنچ جاتے اور اللہ تعالیٰ کے ذکر میں مشغول رہتے۔
 (۲) حضرت قطب ابدال شیخ شرف الدین بوعلی قلندر قدس سرہ اللہ
 تعالیٰ سرہ العزیز آنحضرت را از ہنگام طفولیت بغایت دوست
 مے داشت۔ و منظور نظر ایشان بود چنانکہ ہر روز برائے دیدن
 ایشان مے رفت و دست راستے دیدہ و اگر آن قطب ربانی
 جانے مے رفت و بچیاں با تشریف مے بردے۔

ترجمہ:- حضرت شیخ بوعلی قلندر رحمۃ اللہ علیہ آنحضرت سے حضرت کبیر الاولیاء رحمۃ اللہ
 علیہ اپر بچپن کے زمانہ سے ہی بہت زیادہ شفقت فرماتے تھے۔ آپ کے
 کچھ ایسے منظور نظر تھے کہ ہر روز ان کو دیکھنے جاتے تھے۔ اور اگر آپ

حضرت کبیر الاولیاء (مکان پر نہ ہوتے تو جہاں وہ ہوتے وہیں تشریف لجاتے۔

بہر حال ان روایتوں سے یہ تو معلوم ہوا کہ حضرت مخدوم صاحب کی سیرت اور آپ کے اخلاق و کردار کی تعمیر میں حضرت قلندر صاحب کے فیض صحبت اور آپ کی توجہ خصوصی کو بہت دخل ہے۔ لیکن علوم ظاہری کی تعلیم کا کچھ پتہ ان سے نہیں چلتا۔ البتہ آپ کی مشہور تصنیف "زاد الابرار" جو سلسلہ ارشاد و طریقت کی اہم اور نہایت مفید کتاب ہے وہ آپ کی اعلیٰ قابلیت کی شہادت ہے۔ اور اس شہادت کی بنا پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ آپ نے وطن عزیز پانی پتہ کے اساتذہ ہی سے تعلیم حاصل کی۔

ارشاد اور طریقت تو بہت بڑی چیز ہے کسی معمولی "فن" میں بھی درجہ تکمیل تک پہنچنے کے لئے تعلیم کے علاوہ نگرانی کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ نگرانی کی یہ خدمت بھی حضرت قلندر صاحب نے ہی انجام دی۔

حضرت خواجہ کبیر الاولیاء کو سُرخ لباس پہننے ہوئے سُرخ گھوڑے پر سوار دیکھ کر جو حضرت قلندر صاحب نے فرما دیا تھا: "یاراں حذر کنید آتش بلند شد" غور سے دیکھا جائے تو یہ صرف قلندرانہ ترنگ یا صرف شاعری نہیں تھی۔ بلکہ غالب یہ ہے کہ یہ ایک تشبیہ تھی۔

حضرت کبیر الاولیاء شکار کے شوقین تھے۔ اور یہ شوق آخر تک باقی رہا اور باوجودیکہ ابتداء سے جذب و شوق غالب تھا۔ اور اسی جذبہ میں اکثر آپ آبادی سے باہر الگ جنگلوں میں بھی چلے جاتے تھے۔ عرصہ تک وہاں ذکر و عبادت میں مشغول رہتے تھے۔ لیکن طبع مبارک میں رنگینی بھی تھی۔

یہ قدرتی بات ہے عاشق مزاج رنگین طبع ہوا کرتے ہیں۔ یہ طبع مبارک کی رنگینی ہی تھی کہ گھوڑا سُرخ تھا تو لباس بھی گلگوں (گلاب کے پھول جیسا سُرخ)

استعمال کیا۔ لیکن بوعلی شاہ جیسا قلندر جو اتباع سنت کے عشق میں مجذوب ہوا ہو جو شریعت مطہرہ کا یہاں تک گرویدہ اور عاشق ہو کہ اپنی ڈارھی کو بار بار اس لئے بوسے دیئے کہ ایک حکم شریعت کی تعمیل اور اتباع سنت مبارکہ کے سلسلہ میں پڑی گئی تھی، اس کو ایسے جوان صالح کی یہ رنگینی پسند نہ آئی جس کو دنیا کبیرا لویا کا خطاب دینے والی تھی اور جو بچپن ہی سے یاد خدا کا شوقین اور محبت الہی کا دلدادہ تھا۔ اور غالباً یہی وجہ ہے کہ حضرت کبیر الاولیاء نے حضرت قلندر صاحب کے اس جملہ اور اس شعر سے یہ اثر لیا کہ نہ صرف اس لباس گلگوں کو جدا کیا۔ بلکہ اس گھوڑے کو بھی راہ خدا میں بخش دیا۔ اور آبادی کے بجائے صحرا کا راستہ اختیار کیا۔

ذریعہ معاش | خاندان کا ذریعہ معاش زمیندارہ تھا۔ خود اپنے طور پر بھی کاشت کرتے تھے۔ خود حضرت کبیر الاولیاء رحمۃ اللہ علیہ

بھی جوانی کے زمانہ میں کھیت پر جا کر کاشت کے کام میں حصہ لیا کرتے تھے۔ سیرالاقطاب میں کھیت کے اوپر کا ایک واقعہ بیان کیا گیا ہے۔ جو نہایت دلچسپ ہے۔ آپ بھی ملاحظہ فرمائیے اور محفوظ ہو جائیے۔ واقعہ یہ ہے:-

حضرت قلندر صاحب رحمۃ اللہ علیہ جن کی شفقت کی حالت یہ تھی کہ جب تک کبیر الاولیاء نظر نہ پڑ جاتے تھے چین نہیں آتی تھی۔ ایک روز کبیر الاولیاء رحمۃ اللہ علیہ کے مکان پر تشریف لے گئے تو معلوم ہوا کہ حضرت کبیر الاولیاء کھیت پر تشریف لے گئے ہیں۔ اب حضرت قلندر صاحب نے کھیت کا رخ کیا۔ گھوڑے پر سوار ہوئے اور کھیت کی طرف چل دیئے۔ نوجوان کبیر الاولیاء نے حضرت قلندر صاحب کو دور سے دیکھ کر پہچان لیا۔ تو آپ نے پنے (نخود) جو اس کھیت کی پیداوار تھے ایک چھانچ (غلہ افشان) میں بھرے اور جیسے ہی قلندر صاحب

کھیت کے قریب پہنچے۔ کبیر الاولیاء نے "چنوں" کی نذر پیش کی حضرت قلندر صاحب نے چنوں کا بھرا ہوا چھاج دیکھا تو مسکراتے ہوئے فرمایا۔ بیٹا کیا لائے ہو؟ جو ان صالح کبیر الاولیاء کا یہ سن ادب تھا کہ آپ نے یہ نہیں عرض کیا کہ آپ کی خدمت میں چنے پیش کر رہا ہوں۔ کیوں کہ چنا کوئی قیمتی چیز نہیں ہوتا۔ غلوں کی جنس میں بھی دوسرے درجہ کی جنس سمجھا جاتا ہے۔ آپ نے عرض کیا۔

"حضرت والا کے گھوڑے کے لئے گھوڑا سا دانہ پیش کر رہا ہوں۔"

حضرت قلندر صاحب نے فرمایا۔ "گھوڑے سے پہلے پوچھ لو۔ کیا وہ بھوکا ہے۔ کیا اس کو دانہ چاہیئے۔ اگر وہ دانہ کھانا چاہے تو اس کو کھلا دو۔"

حضرت مخدوم نے یہ چھاج گھوڑے کے سامنے پیش کیا۔ گھوڑے نے بھی کھانے سے انکار کر دیا۔ اور کہا میرا پیٹ بھرا ہوا ہے۔ حضرت نے پہلے دانہ کھلا دیا تھا پھر سوار ہوئے تھے۔ (غالباً زبان حال سے گھوڑے نے یہ جواب دیا) اب حضرت مخدوم (کبیر الاولیاء) حیران تھے۔ کہ نہ خود حضرت قلندر صاحب یہ پیش کش منظور فرماتے ہیں نہ ان کا گھوڑا۔

حضرت قلندر صاحب نے جو ان صالح خواجہ محمد (حضرت کبیر الاولیاء) کو پریشان اور نادوم دیکھا۔ تو فرمایا:۔

"پریشان نہ ہو۔ ہم نے تمہاری نذر منظور کر لی ہے۔ اور اب ہم یہ غلہ اپنی طرف سے تمہیں بخش رہے ہیں۔ اور میں اللہ رب العزت سے دعا کر رہا ہوں کہ ہر دانہ کے بدلہ تمہیں رُکاب بخشے۔"

حضرت مسنف سیر الاقطاب فرماتے ہیں:۔

اللہ تعالیٰ نے حضرت قلندر صاحب کی دعا قبول فرمائی۔ چنانچہ اتنی اولاد ہوئی اور وہ اتنی بھیلی کہ اگر آپ کو (روح ثانی) کہا جائے تو مبالغہ

نہیں ہوگا۔ (سیرالاقطاب)

خود احقر کے وطن عزیز قصبہ دیوبند میں بھی ایک عثمانی خاندان ہے جس کا سلسلہ حضرت کبیر الاولیاء سے ہے۔

مگر دلچسپ لطیفہ یہ ہے کہ یہ میراثِ محترم جن کو مصنف سیرالاقطاب

نکاح

”نوح ثانی“ فرما رہے ہیں۔ یہ خود طے کئے ہوئے تھے کہ نکاح نہیں

کریں گے۔ حضرت پیر مرشد کے شدید اصرار پر آپ نے یہ سنت ادا فرمائی تھی۔ پورا واقعہ اور حضرت شیخ سے گفتگو سیرالاقطاب کے حوالے سے درج کی جا رہی ہے۔

ملاحظہ فرمائیے:-

مصنف سیرالاقطاب جن کا اسم گرامی اللہ ویا ہے (خلف شیخ عبدالرحیم ابن شیخ پناہ حکیم جو حضرت کبیر الاولیاء رحمۃ اللہ علیہ کی اولاد ہیں سے ہیں) تحریر فرماتے ہیں حضرت مخدوم حضرت ترک رحمۃ اللہ علیہ سے بیعت ہو چکے۔ خلافت بھی مل گئی۔ اس کے کچھ عرصہ بعد حضرت مرشد نے بہت اصرار کیا کہ حضرت مخدوم نکاح کریں۔ حضرت مخدوم کبیر الاولیاء نے معذرت کی کہ یہ خادم تو طے کر چکا ہے۔ کہ نکاح نہیں کرے گا۔ آپ نے عرض کیا۔ میں اپنی زندگی کی سب سے بڑی سعادت اور سب سے زیادہ قیمتی پونجی حضرت والا کی خدمت کو سمجھتا ہوں۔ بولے بھی ایسا

۱۷ دیوبند کے مشہور علماء، مثلاً حضرت مولانا محمود حسن صاحب شیخ الحدیث مولانا شبیر احمد صاحب بھی عثمانی ہیں۔ مگر اس خاندان کا سلسلہ دوسرا ہے۔ ان کے علاوہ عثمانی حضرات کا ایک دوسرا خاندان بھی ہے وہ علمی لحاظ سے تو اتنا اونچا نہیں ہے۔ البتہ دیوبند کے خاندانوں میں فائق مانا جاتا ہے۔ برخوردار عزیز مولوی سید سائد میاں سلمہ (امیر جامعہ مدینہ لاہور) کے نانا اسی خاندان سے تھے۔ جس کو حضرت کبیر الاولیاء کے سلسلہ سب میں داخل ہونے کا فخر

حاصل ہے۔ (محمد میاں)

گذرے کہ یہ خادم حاضر خدمت نہ ہو۔ وہ میرے حق میں نقصان عظیم ہے۔ یہ فدوی قطعاً گوارا نہیں کرتا کہ کوئی ایسا مشغلہ اختیار کرے جس سے حضرت والا کی خدمت میں خلل واقع ہو۔

حضرت شیخ (خواجہ شمس الدین ترک رحمۃ اللہ علیہ) نے مرید باسعادت کا بیان سنا۔ تو فرمایا۔

”بیشک آپ کے اخلاص اور آپ کی محبت و عقیدت کا فیصلہ ہی ہے۔ اور جس طرح آپ کو مجھ سے تعلق خاطر ہے۔ ایسے ہی مجھے بھی آپ سے غیر معمولی اُنس ہے۔ میں خود بھی نہیں چاہتا کہ آپ مجھ سے جدا ہوں۔ واقعہ یہ ہے کہ میں آپ کو اپنی اولاد سمجھتا ہوں۔ میں اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا رہتا ہوں کہ آپ میرے صحیح جانشین بنیں۔ مخلوق خدا کو آپ سے فائدہ پہنچے لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت مبارکہ کا درجہ ہماری ان تمام آرزوؤں اور تمناؤں سے بڑھا ہوا ہے۔ — نکاح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت ہے۔ اس پر ضرور عمل ہونا چاہئے۔“

حضرت مخدوم کبیر الاولیاء — حضرت میں تو اس جھگڑے میں اب تک اس لئے بھی نہیں پڑا کہ خدا جانے کس قماش کی اولاد پیدا ہو۔ اور میری گردن پر اس کے اعمال و افعال کا وبال رہے۔

حضرت پیر مرشد۔ گھبراہٹے نہیں۔ اگر اولاد صالح ہو تو وہ ”باقیات صالحات“ ہوگی۔ اور اگر خدا نخواستہ بد قماش اور طالح ہوئی تو اس کا بوجھ تو میری گردن پر ہوگا۔ میں آپ کو نکاح کے لئے اصرار کر رہا ہوں۔

اللہ ویا صاحب۔ راوی ہیں کہ حضرت شمس رحمۃ اللہ علیہ نے پھر حضرت مخدوم

کو یہ بھی سمجھایا کہ میں لوح محفوظ میں دیکھ چکا ہوں کہ آپ کے اتنی اولاد ہوگی کہ اس کا شمار مشکل ہوگا۔

بہر حال کافی رو و قدح کے بعد حضرت مخدوم (خواجہ محمد) نکاح کے لئے تیار ہوئے تو کرناں میں ایک خاندان تلاش کیا گیا۔ جہاں آپ کا رشتہ بھیجا گیا۔ پھر نکاح ہوا۔

اللہ ویا صاحب۔ اپنے مخصوص انداز میں جس کے ہر جز میں کسی کرامت کا اظہار ہوتا ہے۔ یہ بھی فرماتے ہیں کہ نکاح کے بعد جو مصنوعی شرم کے تکلفات عرصہ تک باقی رہتے ہیں حضرت مخدوم نے اس کی اجازت نہیں دی۔ بلکہ جیسے ہی دولہن آپ کے دولت کدہ میں پہنچیں۔ آپ نے فرمایا۔

’بی بی یہ تکلف چھوڑو۔ نظر اٹھاؤ۔ کام کرو۔ وضو کیلئے پانی لاؤ۔‘

بہر حال خدا کے فضل و کرم سے نکاح بہت مبارک ثابت ہوا۔ جتنی اولاد ہوئی نہایت صالح، متقی، صاحب کشف و کرامت۔ (تفصیل آگے آئیگی انشاء اللہ) اگرچہ سوانح نگاروں کی بہت سی باتیں ہماری سمجھ سے بالا سیاحت اور حج ہیں۔ ان میں سے کچھ باتیں آئندہ بلا تبصرہ یا مناسب تبصرہ کے ساتھ نقل بھی کر دی جائیں گی۔ مگر تین باتیں ایسی ہیں جن پر تبصرہ ضروری ہے۔ کیونکہ وہ تینوں باتیں سوانح کے اہم ابواب ہیں۔

(۱) چالیس سال سیاحت میں صرف کئے۔

(۲) چالیس حج کئے۔

(۳) آپ کی عمر مبارک ایک سو ستر (۱۷۰) سال ہوئی۔ سال و قن

۶۵ء ہے۔

ایک صاحب نے یہ بھی تحریر فرمادیا کہ سنہ ولادت ۵۹۵ھ ہے

اللہ ویا صاحب تحریر فرماتے ہیں:-

منقول ہے کہ جب حضرت مخدوم العالمین کبیر الاولیاء چالیس سال کے بعد وطن مالوف میں تشریف لائے اور حضرت مخدوم شیخ شرف الدین بوعلی قلندر سے (جن سے زمانہ طفولیت سے پورا اخلاص اور اعتقاد رکھتے تھے) بیعت ہونے کی درخواست کی تو حضرت قلندر صاحب نے فرمایا۔ آپ کی کامیابی کا مدار ایک دوسرے صاحب پر ہے۔

جو عنقریب امروز فردا میں یہاں پہنچنے والے ہیں۔

یہ سب گزر چکا ہے کہ حضرت خواجہ شمس الدین ترک رحمۃ اللہ علیہ کو ان کے مرشد محترم حضرت مخدوم المشائخ خواجہ علاؤ الدین صابر (کلیری) کا حکم تھا کہ ان کی وفات کے بعد تین دن کلیر شریف میں گذاریں۔ پھر پانی پیتا رہا نہ ہو جائے۔ حضرت خواجہ کلیری رحمۃ اللہ علیہ کی وفات سنہ ۶۹۰ھ میں ہوئی پس سلیم کرنا پڑے گا کہ اسی سنہ میں حضرت شمس کلیر سے پانی پیتا تشریف لائے۔ اور اسی سنہ ۶۹۰ھ میں حضرت کبیر الاولیاء حضرت شمس الاولیاء سے بیعت ہوئے۔ پس اگر حضرت مخدوم کبیر الاولیاء کی ولادت سنہ ۵۹۵ھ میں سلیم کی جائے۔ تو سنہ ۶۹۰ھ میں آپ کی عمر ۹۵ سال ہوگی۔ اور اس عمر میں ممکن ہے کہ چالیس سال سیاحت میں صرف کئے۔ اور اسی دوران یا اس سے کچھ آگے کچھ پیچھے چالیس حج بھی کئے ہوں۔ لیکن قابل توجہ یہ ہے کہ جو صاحب سنہ ولادت ۵۹۵ھ قرار دے رہے ہیں وہ یہ بھی تحریر فرماتے ہیں:-

ایام طفولیت میں حضرت قطب ابدال شاہ شرف الدین بوعلی قلندر قدس سرہ آپ کو لوریاں سناسٹا کر کھلایا کرتے تھے۔ اور اس لوری ہی میں حضرت قلندر صاحب نے خوش خبری دی تھی۔ کہ تو خواجہ

تُرک کے نقش قدم پر چلے گا۔

پھر ہی مصنف صاحب حضرت قلندر صاحب کے تذکرہ میں تحریر فرماتے ہیں

۶۰۵ھ میں بخشی ہند۔ قطب ابدال مولانا شاہ شرف الدین

بوعلی قلندر پانی پت میں پیدا ہوئے۔

یعنی خود ان کی روایت کے مطابق حضرت مخدوم کبیر الاولیا حضرت

قلندر صاحب سے دس سال بڑے ہوئے تو لوریاں سنانے۔ آیام طفولیت

میں شفقت بچپن میں خوشخبری سنانے وغیرہ کی تمام باتیں غلط ثابت ہوتی ہیں۔

اور اگر یہ باتیں صحیح تسلیم کی جاتی ہیں تو یہ قطعاً غلط ہوگا۔ کہ حضرت مخدوم

صاحب نے ۷۰ سال کی عمر پائی۔

اب صرف یہ نہیں کہ سنہ ولادت ۵۹۵ھ کے علاوہ کوئی اور تسلیم کرنا پڑیگا۔

بلکہ یہ بھی ضروری ہوگا۔ کہ حضرت قلندر صاحب کو عمر میں اتنا بڑا تسلیم کیا جائے۔

کہ حضرت قلندر صاحب کا دور قلندری ہو اور حضرت کبیر الاولیا کا دور طفولیت

اور بچپن ہو۔

یہاں یہ بھی نظر انداز نہ ہونا چاہیے کہ سوانح نگاروں کے بیان کے بموجب

چالیس سال کی عمر میں حضرت قلندر صاحب پانی پت سے دہلی تشریف لے گئے

ہیں۔ پھر چالیس سال قطب مینار کے نیچے درس دیتے رہے۔ اس کے بعد

یا اسی دور میں بیس سال منصب قضا سنبھالے رہے۔ اب یا تو حضرت

مخدوم الاولیا کی ولادت کا وہ دور مانا جائے جب حضرت قلندر صاحب دہلی

نہیں تشریف لے گئے تھے بلکہ پانی پت ہی میں مقیم تھے۔ یعنی ۶۲۵ھ سے پہلے

مثلاً ۶۳۵ھ یا ۶۴۰ھ۔

یا وہ دور تسلیم کیا جائے جب حضرت قلندر صاحب دہلی سے واپس تشریف

لا کر پانی پت میں مقیم ہو چکے ہیں۔ جو کم از کم ۶۶۵ھ کے بعد کا زمانہ ہوگا۔ مگر اس صورت میں یہ بھی ماننا پڑے گا کہ حضرت قلندر صاحب نے درس و افتاء کی خدمت چالیس سال نہیں بلکہ صرف بیس سال انجام دی ہے۔ (جیسا کہ بعض سوانح نگاروں نے تحریر کیا ہے)

ان دونوں صورتوں میں یہ تسلیم کرنا بعید از قیاس ہوگا کہ حضرت کبیر الاولیاء نے چالیس سال سیاحت میں صرف کئے۔ اس کے بعد آپ حضرت ترک سے بیعت ہوئے۔ کیونکہ اگر سنہ ولادت ۶۶۵ھ مانا جائے تو سال بیعت یعنی ۶۹۰ھ میں عمر شریف صرف پچیس سال ہوگی۔ اور اگر سال ولادت ۶۳۵ھ مانا جائے تو ۶۹۰ھ میں آپ کی عمر ۵۵ سال ضرور ہوگی۔ مگر یہ قطعاً بعید از قیاس ہوگا۔ کہ چالیس سال آپ نے سیاحت میں بھی صرف کر دیئے ہوں۔ غالباً کوئی سوانح نگار بھی اس کو تسلیم نہیں کرے گا کہ صرف پندرہ سال کی عمر میں آپ سیاحت کے لئے وطن عزیز سے نکل چکے تھے۔

پھر حضرت قلندر صاحب کے شعر موزوں کرنے۔ نیز حضرت مخدوم الاولیاء کے کھیت پر قلندر صاحب کے تشریف لے جانے کے واقعہ کو یا ان جیسے اور واقعات کو غلط تو نہیں قرار دیا جاسکتا۔ البتہ ان کو صحیح تسلیم کرنے کے لئے ضروری ہے۔ کہ حضرت قلندر صاحب اور حضرت مخدوم صاحب کی عمروں میں اتنا تفاوت ہو کہ حضرت قلندر صاحب جوان ہوں اور حضرت مخدوم صاحب کا ایسا بچپن ہو جس میں لوریال دی جاتی ہیں۔ اور جب حضرت مخدوم صاحب جوان ہو کر اس قابل ہو گئے ہوں کہ زراعت کا انتظام کر سکیں۔ ایک بانگے نوجوان کی طرح سُرخ لباس پہن کر شہ سوار بن سکیں تب حضرت قلندر صاحب کا دور قلندری شروع ہو گیا ہو۔

اس تمام بحث اور تبصرہ و تنقید کا خلاصہ یہ ہے کہ پوری عمر ۷۰ سال اور

سنہ ولادت ۵۹۵ھ کی روایتیں قطعاً غلط ہیں۔ قرن قیاس یہ ہے کہ آپ کی ولادت تقریباً ۶۳۵ھ میں ہوئی ہے۔ جب حضرت قلندر صاحب کی عمر شریف تقریباً تیس سال تھی۔ اور ابھی آپ دہلی تشریف نہیں لے گئے تھے۔ پھر ۶۴۵ھ سے تقریباً ۶۸۰ھ تک حضرت قلندر صاحب دہلی میں رہے۔ اور حضرت مخدوم الاولیاء جوان ہوئے تو صحراوردی شروع کر دی۔ اور تقریباً بیس پچیس سال کی صحراوردی اور سیاحت کے بعد جب عمر شریف تقریباً پینتالیس سال ہوئی تب آپ تقریباً ۶۸۰ھ میں پانی پت تشریف لائے۔ اور یہی وہ زمانہ ہے جب حضرت قلندر صاحب دہلی کی سکونت اور سلسلہ درس و تدریس اور منصب قضا و افتاء ختم کر کے پانی پت تشریف لے آئے تھے۔ اس صورت میں انھیں مصنف صاحب کی یہ روایت بھی صحیح ہو جاتی ہے۔ جو خود انھیں کے الفاظ میں درج کی جا رہی ہے۔

حضرت مخدوم خواجہ محمد جلال الدین کبیر الاولیاء رحمۃ اللہ علیہ کی تعلیم و تربیت حضرت قطب ابدال (قلندر صاحب) نے ہی فرمائی۔ اسی وجہ سے بچپن ہی سے اللہ تعالیٰ کی محبت اور محبوب حقیقی کی طلب رگ و پے میں سرایت کر گئی تھی۔ حضرت قطب ابدال کو آپ سے بدرجہ غایت محبت تھی۔ اور آپ ہی نے مدارج معرفت طے کرائے۔ لیکن مرید نہ کیا۔ شیخ جلال (مخدوم صاحب) جب کبھی مرید ہونے کی درخواست کرتے تو قطب ابدال ازراہ شفقت فرماتے کہ تو تو ہماری بیٹی ہے۔ جو کچھ ہمارے پاس ہے وہ تو تجھ کو جہیز میں دیں گے اور تیرا شوہر تجھے اس گھر کا راک بنا لے گا۔ چنانچہ جب خواجہ شمس الدین ترک "پانی پت" تشریف لائے تو حضرت قلندر صاحب نے خود شیخ جلال کو حضرت خواجہ شمس الدین ترک پانی پتی کی خدمت میں مرید ہونے کے لئے بھیجا۔ اس طرح شیخ جلال دولت قلندری سے مالا مال ہو کر "دولت صابری" کے وارث بنے۔ رحمۃ اللہ

حضرت شیخ کی خدمت | بیعت ہونے کے بعد خدمت شیخ کے متعلق کوئی واضح روایت نہیں ملتی۔ البتہ شادی کے سلسلہ میں

جو گفتگو پہلے نقل کی جا چکی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ :-

ہمہ وقت حضرت شیخ کی خدمت میں حاضر رہتے اور آپ کی خدمت کرنے کو حضرت کبیر الاولیاء نے زندگی کا نصب العین بنا لیا تھا۔ آپ کو گوارا نہیں تھا کہ ایک لمحہ کے لئے بھی حضرت شیخ کی خدمت سے علیحدہ ہوں۔ اسی بنا پر آپ زکاح کے لئے بھی آمادہ نہیں تھے۔

حضرت شمس الاولیاء کی وفات ۱۰۵۰ھ میں ہوئی۔ اس حساب سے پچیس سال (۱۰۶۹ھ تا ۱۰۸۴ھ) حضرت کبیر الاولیاء اپنے شیخ کی خدمت میں مصروف تھے ایک جوہر شفاف جو پہلے ہی تمام کدورتوں کو دور کر چکا ہو اس پر شمس منیر پچیس سال تک ضیا پاشی کرتا رہا تو وہ جو کچھ بھی ہو جائے کم ہے۔

اب ہم سیر الاقطاب کی ایک روایت خود مصنف کے الفاظ میں نقل کر کے اس بحث کو ختم کرتے ہیں۔ اس روایت میں صرف "چہل" کے لفظ سے ہمیں اختلاف ہے۔ باقی تمام عبارت ایک نصیح و بلیغ سند ہے۔

منقول است کہ آن قطب المکرین چہل سال مسافرت کرد و مکرر حج الحرمین ثمر لقیین ادا نمود۔ و از بسیار مشائخ کرام و اولیاء عظام نعمت یافتہ۔ پس بوطن رسید کہ بعنایت ظاہری و باطنی حضرت صاحب ولایت سرفراز گردید۔ و بالہام ربانی ارادت با آنحضرت آورد و خدمتہا نمود۔ و ریاضت و مجاہدہ از حد گذاریند۔ خلافت یافت و ام اعظم کہ سینہ بسینہ رسیدہ بود و نسبت سینہ خواجگان چشت بیامو و ہم بجائے فرزند صاحب سجادگی نیز بالیشان رسید۔ و خانقاہ

و خدمت روضہ منورہ نیز بالشان متعلق گشت

ترجمہ :- منقول ہے کہ (آن قطب المکرین) یعنی حضرت مخدوم کبیر الاولیاء رحمۃ اللہ علیہ چالیس سال سفر اور سیاحت کرتے رہے۔ اسی عرصہ میں بار بار حرمین شریفین کی زیارت کی (متعدد حج کئے) بہت سے مشائخ اور اولیاء کرام کی خدمت میں حاضر ہو کر ان سے فیض اور روحانی نعمت حاصل کی۔ اس کے بعد وطن عزیز واپس ہوئے۔ یہاں حضرت صاحب ولایت (حضرت شیخ شمس الدین ترک) کی ظاہری اور باطنی عنایتوں سے سرفراز ہوئے۔ اور غیبی اشاروں کی بنیاد پر آپ کے حلقہ ارادت و بیوت میں داخل ہوئے حضرت شیخ کی خدمت تن وہی، جانفشانی اور سلیقہ سے کرتے رہے۔ اور حد سے زیادہ محنت اور کوشش صرف کی۔ پھر فرقہ خلافت حاصل کیا۔ اور اسم اعظم جو سینہ بسینہ چلا آ رہا تھا۔ اور حضرت خواجگان^{حشت} کی نسبت مبارکہ حاصل کی۔ بہر صورت کہ حضرت مخدوم الاولیاء حضرت خواجہ ترک کے فرزند کی جگہ تھے۔ تو آپ ہی حضرت خواجہ ترک کے سجادہ نشین قرار دیئے گئے۔ اور خالقانہ اور حضرت خواجہ ترک کے مزار مبارک کی خدمت آپ ہی کے سپرد ہوئی۔)

سندِ خلافت | سیر الاقطاب میں وہ سندِ خلافت جو حضرت خواجہ شمس الدین ترک نے حضرت مخدوم کبیر الاولیاء رحمۃ اللہ علیہ کو عطا فرمائی تھی۔ پوری نقل کی گئی ہے۔ اس کے ابتدائی حصے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے لے کر حضرت خواجہ علاؤ الدین علی احمد صابر کلیری رحمۃ اللہ علیہ تک سلسلہ کے تمام مشائخ رحمہم اللہ کے اسماء گرامی ہیں۔ اُس کے بعد اپنی طرف سے حضرت مخدوم الاولیاء کو خلافت عطا کرنے کا تذکرہ ہے۔ پھر وہ الفاظ ہیں جن میں اپنے اور حضرت مخدوم الاولیاء کے تعلقات۔ مخدوم الاولیاء کی صلاحیتوں اور ان کے کمالات وغیرہ کا تذکرہ ہے،

اور یہ کہ حضرت ترک کو حضرت مخدوم پانی پتی پر پورا اعتماد ہے کہ وہ اس سلسلہ کی قدر کریں گے اور اپنی بہترین صلاحیتوں سے اس کو ترقی دیں گے اور اس کے فیض کو عام کریں گے۔ یہ الفاظ بہت شاندار ہیں۔ مگر کتابت کی غلطیوں نے ان کی صورت یہاں تک بگاڑ دی ہے کہ ناقابلِ فہم ہو گئے ہیں۔ ہم صرف چند الفاظ نقل کرتے ہیں۔

حضرت ترک اپنے شیخ محترم حضرت خواجہ علاء الدین کے اسم گرامی کے بعد تحریر فرماتے ہیں:-

هو اعطى الفقيه مع ولاية پانی پتی
وانا اعطيت قنسرۃ وخرقة ومقراضا وعصا وكاسا وسلمت
ما فى قلبى وروحى وجسمى وعینى وبدنى وحنى واسرارى وحقائى
واعلانى۔ ظاهراً وباطناً للابن القلبى وحریف اسرارى محمد
بن محمود بن يعقوب وخطبتہ خطا با باسم جلال الدين
وانا اقمته فى مقامى هذا ونخطتہ مع سوادها وانا لاخذ
بیدرجل من الرجال من بعد
وشيخ جلال المذكور هو عالم بطريق الاسرار الالحية وانا
اعلمه فى ما بقى وهو اليق من هذه الدرر حجة الخ

ترجمہ:- حضرت خواجہ کلیری نے اس فقیر کو خلافت عطا فرمائی۔ اور خدمت کے لئے یہ علاقہ پانی پتی کا احقر کو سپرد کیا۔ اور میں عطا کر رہا ہوں۔ ٹوپی، خرقہ (عبا)، مقراض، عصا اور پیالہ۔ اور جو کچھ میرے قلب، میری روح، میرے جسم، میری آنکھ، میرے بدن، میرے ظاہر اور پوشیدہ اور مخفی یا علانیہ میں میرے پاس ہے۔ وہ سب میں عطا کر رہا ہوں اپنے روحانی فرزند۔ واقف اسرار

محمد بن محمود بن یعقوب کو اور میں نے اس کو جلال الدین " کا خطاب دیا ہے۔ اور اپنے مقام پر اس کو قائم کیا ہے۔ اور یہ پورا علاقہ مع اس کے مضافات کے اس کے سپرد کر دیا ہے۔ میں اب اس علاقہ میں کسی کو مرید نہ بناؤں گا۔ یہ شیخ جلال الدین اسرارِ خداوندی کے طریقوں سے واقف ہیں اور جو باقی ہیں ان کی میں تعلیم دے رہا ہوں۔ وہ اس درجہ اور مرتبہ کے لئے بہت موزوں ہیں۔

کمالات و کرامات جس بزرگزیدہ شخصیت کو حضرت خواجہ شمس الدین ترک جیسا شمس الاولیاء واقف اسرارِ الہیہ فرمائے۔ اور اپنے روحانی فیوض و کمالات سے یہاں تک مالا مال کر دے کہ جو کچھ اس کے پاس ہو وہ سب اس کے حوالہ کر دے۔ تو اس کے کمالات کے لئے کسی مزید بیان اور تحریر کی ضرورت نہیں ہے۔ تاہم چند کمالات اور کرامتیں تحریر کی جاتی ہیں۔

(۱) سیرالاقطاب میں آپ کا ایک کمال یہ بیان فرمایا گیا ہے کہ :-
 " آنحضرت ہر کجا خواستے در طرفہ العین آنجا رسیدے و ہمچنان باز آمدے۔ ہر چند آن مقام دور تر بودے۔ چنانکہ اکثر نماز جمعہ بکعبۃ اللہ ادا کر دے۔"

ترجمہ :- آنحضرت (مخدوم صاحب) جہاں چاہتے پلک کے ایک جھپکے میں وہاں پہنچ جاتے پھر اسی طرح واپس آجاتے۔ خواہ وہ مقام کتنا ہی دور ہوگا۔ چنانچہ جمعہ کی نماز اکثر آپ خانہ کعبہ میں ادا کرتے تھے۔

سیدنا حضرت سلیمان علیہ السلام کے ایک وزیر کا یہ کمال کلام اللہ شریف میں بیان فرمایا گیا ہے۔ کہ انھوں نے ملکہ بلقیس کے بہت بڑے تخت کو جس کو قرآن حکیم نے "عرش عظیم" سے تعبیر کیا ہے۔ پلک جھپکنے سے بھی پہلے سینکڑوں میل کے فاصلہ

پر (مین سے شام) پہونچا دیا تھا۔

اس وزیر کی خصوصیت قرآن حکیم میں یہ بیان فرمائی گئی ہے۔ "عندہ علم من الكتاب" اس کو کتاب (توراة) کا ایک علم حاصل تھا۔

پس جب تورات کے عالم کو خدا نے یہ کمال عطا فرمایا تھا۔ تو کچھ بعید نہیں کہ قرآن حکیم کے کسی صاحب علم کو یہ کمال حاصل ہو کہ وہ پلک بھریں کہیں سے کہیں پہونچ جائے۔

مگر یہ کمال کسی ایثار، جفاکشی اور قربانی کی خبر نہیں دیتا۔ اور فقہی نقطہ نظر بھی اس کی کچھ زیادہ تائید نہیں کرے گا۔ کیونکہ بچوقتہ نمازوں میں تو شریعت نے مسجد محلہ کی جماعت میں شرکت کی تاکید فرمائی ہے۔

بیشک نماز جمعہ محلہ کی مسجد میں ٹھیک نہیں ہے۔ مگر جو شخص ہندوستان سے مکہ معظمہ پہونچے گا۔ اس پر سفر کے احکام عائد ہوں گے۔ مسافر کے حق میں نماز جمعہ کی وہ اہمیت نہیں رہتی۔

بہر حال ہمارے خیال میں حضرت مخدوم رحمۃ اللہ علیہ کا سب سے بڑا کمال یہ تھا کہ باہر لنگر خانے میں ہر روز ایک ہزار مہمان کھانا کھاتے تھے اور گھر کی حالت یہ کہ "قوت لایموت" بھی مشکل سے بیسر ہوتا تھا۔

ایک طرف فتوحات کی یہ کثرت کہ ہزار مہمانوں کو بروقت طرح طرح کے کھانے کھلائے جائیں۔ دوسری جانب اپنے ذاتی آمد و صرف کا یہ عالم کہ فاقوں کی بھی نوبت آتی رہے۔

یہ تھا دادا پیر حضرت صابر کلیری رحمۃ اللہ علیہ کا مسلک کہ بارہ سال تک حضرت خواجہ شکر گنج کے لنگر خانے کے ہتھم و منتظم رہے۔ اور ایک دانہ اس کھانے میں سے مونہ میں نہیں ڈالا۔ حضرت مخدوم کبیر الاولیاء بھی ساری عمر اسی مسلک پر قائم رہے۔

سیرالاقطاب کی پوری روایت کا ترجمہ ملاحظہ فرمائیے۔

”آنحضرت کو ظاہری تصرف بھی اس درجہ حاصل تھا کہ مطبخ میں ہر روز ایک ہزار آدمیوں کا کھانا تیار ہوتا تھا۔ دسترخوان پر پورے ایک ہزار آدمی بیٹھے تھے اگر کبھی مہمان اتنی تعداد میں نہیں ہوتے تو خدام کو حکم تھا کہ کوچہ و بازار سے کچھ آدمیوں کو بلا لائیں۔ اور ہزار کی تعداد پوری کریں۔ کھانے طرح طرح کے ہوتے تھے۔ اگر حضرت مخدوم پانی پت سے باہر شکار میں ہوتے کبھی نپدرہ بیس روز کبھی ایک ایک مہینہ شکار میں رہتے۔ وہاں بھی مطبخ اور مہمانوں کی یہی شان رہتی تھی۔

اس دریا دلی اور فراخی حوصلہ کے باوجود۔

اگر کے درخانہ آنحضرت خبری گرفت و مطلع می شد حیران می ماند۔
از انکہ فقر و فاقہ اختیاری چندال بکمال داشت کہ قوت یک روزہ ہم موجود نمی بود۔ و خداوند کہ این چہ تصرف و ولایت میسر گردید بود۔
ترجمہ :- اگر کوئی آنحضرت مخدوم کے اندرون خانہ کی خبر لیتا۔ اور وہاں کی کیفیت و حالت سے مطلع ہوتا تو حیران رہ جاتا تھا کہ اپنے اختیاری فقر و فاقہ سے حالت یہ تھی کہ ایک دن کی خوراک کا سامان بھی گھر میں موجود نہیں ہوتا تھا۔ اور خدا جانے یہ کس قسم کی ولایت اور کس طرح کا تصرف آپ کو میسر ہوا تھا۔ کہ گھر میں فاقہ اور باہر لنگر

مصنف سیرالاقطاب نے آخر میں ایک سوال کر کے جواب کی طرف اشارہ کر دیا اور ہمیں مجبور کر دیا کہ ہم جواب کی وضاحت کریں۔

یہ اسی قسم کا فقر و فاقہ تھا جو کاشانہ نبوت صلی اللہ علیٰ صاحبہا وسلم کی خصوصیت تھا کہ درہم و دینار کے ڈھیر سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی مسجد

مبارک کے صحن میں لگے ہوئے ہیں۔ اور فخر الانبیاء رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم ان کو تقسیم فرما رہے ہیں۔ کہ تاریکی شہ کی آمد سے پہلے پہلے یہ سب ان کے پاس پہنچ جائیں جو ان کے مستحق ہیں۔ نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) کے لئے قطعاً موزوں نہیں کہ اُس کے شبستان میں سونے یا چاندی کا کوئی ریزہ رات گزار سکے۔

ہم اکثر پڑھا کرتے ہیں۔ لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ

تمہارے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی مبارک میں بہترین نمونہ ہے) مگر روپیہ پیسے کے معاملہ میں ہمیں اس اسوہ حسنہ اور "بہترین مثال" کا تصور بھی نہیں آتا۔ ہم اپنے مدرسوں اور مذہبی اداروں کے لئے اہل خیر سے چندے وصول کرتے ہیں۔ چندہ دینے والے ہمیں عطیہ نہیں دیتے بلکہ وہ ہمارے ادارہ کو عطیہ دیتے ہیں۔

مگر یہ احتیاط ہم سے ان چندوں کے بارہ میں بھی نہیں ہو سکتی جو ہمارے پاس صرف امانت ہوتے ہیں۔ اس کے برعکس حضرت مخدوم کبیر اللادلیا رحمۃ اللہ علیہ کو لوگ جو کچھ ان کو دیا کرتے تھے۔ اس قسم کی فتوحات عام طور پر ذاتی ملک تصور کی جاتی ہے۔ لیکن سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی صحیح اتباع سنت یہ ہے کہ آپ ان ذاتی اور شخصی عطیات کو بھی امانت قرار دیتے تھے۔ اور جو کچھ فتوحات ہوتی تھی وہ لسگرخانے کی امانت تصور فرماتے تھے۔

پھر اس امانت داری سے بھی بڑھا ہوا کمال وہ "انخفا رہے۔ جو بذاتِ خود ایک کرامت ہے۔ یعنی گھر کی حالت گویا اندرون خانہ کی امانت ہوتی تھی ناممکن تھا کہ کسی کو اُس کا پتہ کبھی چل جائے۔

قرآن حکیم نے قرن اول (دور رسالت علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام) کی یہ شان فرمائی ہے۔ يَحْسَبُهُمُ الْجَاهِلُ أَغْنِيَاءَ مِنَ التَّعَفُّفِ۔ جو لوگ ان کے اندرونی حالات سے ناواقف ہیں وہ ان کو امیر اور تو نگر سمجھتے ہیں۔ اس لئے کہ وہ

اظہار ضرورت کے ہر ایک موقع سے پاکدامن رہتے ہیں۔ وہ ہرگز گوارا نہیں کرتے کہ اشارہ و کنایہ میں بھی کوئی ایسی بات کسی کے سامنے آسکے جس سے گھر کے فقر و فاقہ کا اس کو احساس ہو جائے۔

حضرت خواجہ محمد پانی پتی کو شیخ نے جلال الدین
مستجاب الدعوات ہونا اور مشائخ نے کبیر لہا و لہیا راسی لئے کہا کہ وہ قرن اول
 کے بزرگوں کی اس خصوصیت کے حامل تھے کہ اندرون خانہ فاقہ مسرت اور باہر بادشاہوں
 سے بھی زیادہ تواضع اور سخی داتا۔ رحمۃ اللہ۔

یہ ایثار۔ اور دوسروں کے لئے یہ تزییحی سلوک کہ گھر میں فاقہ اور دوسروں کے
 لئے طرح طرح کے شکم سیر کھلنے۔ یہ اُس درد کا پتہ دیتا ہے جس کا نام ہے خلقِ خدا
 کی غمخواری ہے یہ غمخواری اور یہ ہمدردی خلقِ خدا وہ کیسیا ہے جو مشیتِ خاک کو کندن
 بنا دیتا ہے۔ اور انسان کو فرشتوں سے بھی اوپر پہنچا دیتا ہے۔ پس ایسا شخص اگر
 مستجاب الدعوات ہو۔ اور بقول سیرالاقطاب اُرّاس کی حالت یہ ہو کہ :-

”ہر چہ از زبان مبارکش برآمدے ہماں شدے۔“

اُن کی زبان مبارک پر جو کچھ آتا وہی ہوتا تھا۔

تو مقام تعجب نہیں۔ کیونکہ زبان مبارک پر وہی آئے گا۔ اور دعار کے لئے ہاتھ
 اسی کی خاطر اٹھیں گے جو ہمدردی خلقِ خدا کی چھلنی میں چھنا ہوا ہوگا۔

(۲) اسی قبولیت دعار کے سلسلہ میں وہ واقعہ بیان کیا جاتا ہے جس نے اس
 زمانہ کے بادشاہ فیروز شاہ کو بھی یہاں تک متاثر کر دیا تھا کہ وہ سلام کرے اور دعائیں
 لینے کے لئے پانی پت حاضر ہوا۔

واقعہ یہ ہے کہ مخدوم جہانباں حضرت سید جلال اپنے وطن ”اوپج“
 سے دہلی تشریف لائے ہوئے تھے۔ بادشاہ کے مہمان تھے کہ سخت بیمار

ہو گئے۔ یہاں تک کہ نزع کی کیفیت شروع ہو گئی۔ لوگ مایوس ہو کر جنازہ وغیرہ کے انتظام میں مصروف ہونے لگے۔ دفعۃً حضرت مخدوم جلال الدین کبیر الاولیاء وہاں پہنچے۔ بیمار کے سر ہٹے کھڑے ہو کر سلام کیا۔ بیمار نے فوراً آنکھیں کھولیں۔ حضرت مخدوم پانی پتی نے فرمایا۔ اٹھئے وضو کیجئے۔ حضرت سید جلال جو بیمار تھے اور نزع کی حالت میں تھے اٹھئے۔ وضو کی۔ پھر دعا کی۔ اور خدا کے فضل سے اچھے ہو گئے بیماری کا نام و نشان بھی نہ رہا۔ یہ سلب مرض کی ایسی عجیب و غریب صورت تھی جس کو کرامت ہی کہا جاسکتا ہے۔ بادشاہ جو سید جلال مخدوم جہان بان جہاں گشت سے بیعت کرتا۔ وہ بھی وضو وغیرہ کر کے اس لئے آ رہا تھا کہ اپنے پیر کی آخری زیارت کر لے۔ جب اُس نے یہ کرامت دیکھی تو وہ بھی حیران رہ گیا۔

اس کے بعد حضرت سید جلال دس سال تک زندہ رہے۔

اب اس واقعہ کو سیر الاقطاب میں جس انداز سے بیان کیا گیا ہے۔ وہ بھی ملاحظہ فرمائیے :-

مصنف سیر الاقطاب الشہداء صاحب عثمانی حضرت مخدوم کبیر الاولیاء کے سب سے بڑے صاحبزادے حضرت شیخ عبدالقادر رحمۃ اللہ علیہ کی اولاد میں سے ہیں۔ آپ فرماتے ہیں کہ ایک روز حضرت کے پانچوں فرزند حاضر تھے۔ حضرت مخدوم کبیر الاولیاء نے فرمایا :-

”حضرت حق جل مجدہ کا فرمان یہ ہے کہ میں اپنی عمر کا کچھ حصہ اپنے ہم نام ”سید جلال“ کو دیدوں۔ وہ بیمار ہیں اور ان کی عمر پوری ہو چکی ہے۔“

صاحبزادوں نے جب یہ سنا تو چار نے تو عرض کیا: کہ حضرت کی زندگی اتنی قیمتی ہے کہ ہماری آرزو یہ ہے کہ ہم سب کی عمریں آپ کی نذر ہو جائیں تو ہم اس کو اپنی اور ساری مخلوق کی بہت بڑی سعادت سمجھیں گے۔ پس ہم یہ کیسے گوارا کر سکتے ہیں کہ حضرت کی عمر میں کمی ہو۔

پانچویں فرزند حضرت شبلی نے عرض کیا کہ اگر فرمان خداوندی یہی ہے۔ تو آپ یقیناً اپنی عمر مبارک کا کچھ حصہ سید جلال کو عطا کر دیں۔ تاکہ خلق خدا ان کے فیوض سے اور زیادہ بہرہ یاب ہو سکے۔ کیونکہ موت تو لا محالہ آنے والی ہے۔ جناب والا اپنی عمر کا ایک دن دیدیں یا بالکل کچھ نہ دیں۔ اور آپ کی عمر اتنی بڑھ جائے۔ کہ ایک ہزار سال تک آپ کے فیض کے چشمے بہتے رہیں تب بھی موت سے نجات نہیں۔ وہ اب نہ سہی، ایک ہزار سال بعد آئے گی مگر لا محالہ آئے گی۔

پس اگر اشارہ خداوندی یہ ہے کہ آپ اپنی عمر کا کچھ حصہ حضرت سید جلال کو دیدیں تو بہتر یہ ہی ہے کہ خوشنودی دوست کی خاطر یہ قربانی منظور فرمائیں۔ حضرت مخدوم پانی پتی اس جواب سے خوش ہوئے۔ پھر آپ پر استغراقی کیفیت طاری ہو گئی۔ سب صاحبزادے بھی یہاں سے رخصت ہو گئے۔ صرف شیخ عبد القادر صاحب جو مصنف سیرالاقطاب کے مورث ہیں، وہیں ٹھہرے رہے۔ حضرت مخدوم پانی پتی استغراقی کیفیت سے بیدار ہوئے چشم مبارک کھولی تو وہاں عبد القادر صاحب موجود تھے۔ فرمایا اچھا۔ تم یہاں موجود ہو تو آؤ۔ میرے ساتھ چلو۔ یہ فرما کر عبد القادر صاحب سے فرمایا۔ اپنے پاؤں میرے پاؤں پر رکھو اور آنکھیں بند کر لو۔ حضرت خواجہ عبد القادر نے آنکھیں بند کر لیں۔ پھر حضرت مخدوم نے فرمایا۔ اب آنکھ کھولو۔ حضرت خواجہ عبد القادر نے آنکھ کھولی۔ تو دیکھا کہ وہ بجائے پانی پت کے دہلی کے شاہی محل میں ہیں۔ جہاں حضرت سید جلال پر نزع کی کیفیت طاری ہے۔

حضرت مخدوم پانی پتی مرلیض کے سراہنے پہنچے اور سلام کیا۔ سید جلال نے فوراً انگلیوں سے کھولیں کھولیں۔ سلام کا جواب دیا۔ حضرت مخدوم پانی پتی نے فرمایا: اٹھو، وضو کرو۔ سید جلال صاحب بسترِ مرض سے جواب بسترِ مرگ بنا ہوا تھا اٹھے۔ وضو کیا۔ پھر حضرت مخدوم پانی پتی سے کچھ درخواست کی۔ حضرت مخدوم نے انگلیوں سے اشارہ کر کے یہ بتایا کہ اپنی عمر میں سے دس سال حضرت سید جلال کو دیدیئے۔ چنانچہ حضرت سید جلال فوراً تندرست ہو گئے۔ حضرت مخدوم پانی پتی فوراً رخصت ہو کر پانی پت پہنچ گئے۔ جب فیروز شاہ کو یہ معلوم ہوا کہ حضرت سید جلال تندرست ہو گئے تو وہ فوراً حاضر ہوا۔ اور عرض کیا۔ میری بڑی خوش قسمتی ہے کہ میرے زمانہ سلطنت میں اللہ تعالیٰ کے ایسے برگزیدہ بندے بھی ہیں۔ بادشاہ نے اپنے شیخِ طریقت سید جلال مخدوم جہا نمان سے عرض کیا کہ دل چاہتا ہے میں حضرت مخدوم پانی پتی کی خدمت میں حاضر ہوں۔ سید صاحب نے فرمایا۔ بہت بہتر ہے۔ آپ ضرور حاضری دیجئے۔ چنانچہ بادشاہ شاہانہ انداز میں پانی پت پہنچا۔ خدمت مبارک میں حاضر ہوا۔ شکر یہ ادا کیا۔ پھر عرض کیا۔ کچھ ہدیہ لایا ہوں۔ وہ منظور فرمائیے۔

چنانچہ بہت سے خزان ہیرے جواہرات، سونے چاندی کے سگوں اور اعلیٰ قسم کے کپڑوں سے لہالب بھرے ہوئے پیش کئے گئے۔

حضرت مخدوم پانی پتی نے فرمایا۔ یہ ہمارے کس کام کے ہیں۔ ہم فقیر لوگ ہیں ہمارے یہاں نہ کوئی دربان نہ چوکیدار، دروازے کے کوڑ بھی ہمارے یہاں رات کو بند نہیں ہوتے۔ ان ہدایا کی حفاظت کی مصیبت کون مول لے۔ آپ کے یہاں ہی ان کی حفاظت کا انتظام ہے۔ یہ آپ کو ہی مبارک ہوں۔ بادشاہ نے ہر چند خوشامد کی مگر شنوائی نہیں ہوئی۔ جب بادشاہ حضرت مخدوم کی منظوری نہ حاصل کر سکا۔ تو اس نے آپ کے صاحبزادوں کو راضی کرنا چاہا۔ وہ بھی تیار نہ ہوئے۔ کہ اللہ تعالیٰ نے سب

کچھ نہیں رکھا ہے۔ کسی کا احسان نہیں ہے۔ تو ہمیں کیا ضرورت ہے کہ اپنے "فقر" اور استغنا کو چھوڑیں۔ احسان مند بنیں۔ اور ان کی حفاظت کے انتظام میں وقت عزیز ضائع کریں۔ بہر حال جب بادشاہ کو سب طرف سے مایوسی ہوئی تو حکم دیا کہ یہ سب خزان ہی آستانہ مخدوم پر چھوڑ دیئے جائیں۔

پھر بخشیم نم رخصت ہوا۔ اور دھلی واپس آگیا۔

ایک علمی لطیفہ:- اسی اشار میں جب بادشاہ خدمت میں حاضر تھا تو اُس نے عرض کیا۔ حضرت والا۔ کیا جناب نے اللہ تعالیٰ کو دیکھا ہے۔

حضرت مخدوم پانی پتی نے جواب دیا۔ شریعت کی تصریح ہے کہ ان آنکھوں سے خداوند عالم کو دیکھنا ممکن نہیں ہے۔ پس خدا کو تو نہیں دیکھا۔ البتہ "سایہ خدا" (یعنی بادشاہ) کو دیکھا ہے۔ بادشاہ کو عموماً "ظل اللہ" کہا جاتا تھا۔ یعنی اللہ کا سایہ۔ بادشاہ اس پر حسبہ جواب سے بہت خوش ہوا۔ اور وہ ہدیے پیش کئے جن کا ذکر اوپر گزرا ہے۔

ضروری تبصرہ ہم نے یہ واقعہ سیر الاقطاب کے حوالہ سے نقل کر دیا ہے مگر تاریخی قرآن اس کی تائید نہیں کرتے۔ کیونکہ اس واقعہ کا تقاضا یہ ہے کہ جب بھی قبولیت دعا اور شفا یابی کا یہ قصہ پیش آیا ہو اس وقت سے دس سال بعد حضرت مخدوم جہانبان کی وفات ہوگئی ہو۔

حضرت مخدوم کبیر الاولیاء کی وفات ۱۰۶۵ھ میں ہوئی ہے۔ فرض کر لیجئے۔ کہ اسی سال یہ واقعہ پیش آیا کہ حضرت کبیر الاولیاء نے اپنی عمر کے دس سال حضرت مخدوم جہانبان کو دیدیئے تو حضرت مخدوم جہانبان کی وفات ۱۰۷۵ھ میں ہو جانی چاہئے۔ لیکن آپ کی وفات ۱۰۷۵ھ میں نہیں ہوئی۔ بلکہ اس سے بھی زیادہ دس سال بعد ۱۰۸۵ھ یا تیرہ سال بعد ۱۰۸۸ھ میں ہوئی۔ انجمن الاخیار میں سال

وفات ۱۷۸۵ء ہے اور معارج الولاہیت میں ۱۷۸۸ء -

حضرت مولانا عبدالحق صاحب محدث و مہلوی تحریر فرماتے ہیں کہ سید جلال بخاری جن کا لقب مخدوم جہانبان ہے۔ یہ ایک ایسے باکمال بزرگ تھے جن کو اللہ تعالیٰ نے علم کی دولت بھی عطا فرمائی تھی۔ اور ولی کامل بھی تھے اور خاندانی لحاظ سے سید بھی تھے۔

خزنیۃ الاصفیاء میں ہے کہ آپ ماورزا و ولی تھے۔ پہلے شیخ الاسلام شیخ رکن الدین قریشی سے بیعت ہوئے اور خلافت حاصل کی۔ آپ کو سیاحت کا شوق تھا۔ بہت سے ممالک میں آپ تشریف لے گئے۔ حج بیت اللہ شریف سے بار بار مشرف ہوئے۔ بہت سے علماء اور مشائخ سے علوم ظاہری و باطنی کا استفادہ کیا۔ چاروں سلسلوں سے آپ کو خلافت ملی تھی۔ سلطان فیروز کے زمانہ میں اچ سے دہلی تشریف لائے۔ ۱۷۸۵ء کی شہادت کو آپ کی ولادت ہوئی تھی۔ اور ۱۷۸۸ء سال یا ۱۷۸۵ء سال عمر پوری کر کے ۱۷۸۸ء یا ۱۷۸۵ء کی عید الاضحیٰ کے روز آپ کی وفات ہوئی۔ اُنج ملتان کے قریب کوئی مقام تھا۔ (اخبار الاخبار و خزنیۃ الاصفیاء) (۳) مصنف سیر الاقطاب نے ایک اور واقعہ بھی بیان کیا ہے۔ مگر وہ اس کے برعکس ہے۔ یعنی "مرنے" کی خبر دی۔ اور جیسے خبر دی تھی ویسے ہی موت آگئی۔

اس کے متعلق سیر الاقطاب کی روایت کا خلاصہ یہ ہے۔ کہ بادشاہ کا ایک بھانجہ تھا۔ "فتح خاں"۔ یہ بادشاہ سے بہت بے تکلف تھا۔ اس زمانہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پائے مبارک کا نقش بھی کسی طرح بادشاہ کو میسر آ گیا تھا۔ ماموں بھانجہ (بادشاہ اور فتح خاں) میں سے ہر ایک کی تمنا تھی کہ یہ نقش مبارک 'دفن کے وقت اس کے سینہ پر رکھا جائے۔ دونوں میں کافی بحث ہوئی۔ بالآخر ایک ایسی بات پر فیصلہ ہوا جس نے ہر ایک کو پہلے مرنے

کا آرزو مند بنا دیا فیصلہ یہ ہوا کہ دونوں میں سے جو پہلے مرے یہ نقش مبارک اُس کے سینہ پر رکھا جائے گا۔

معلوم ہوتا ہے "فتح خاں" کی تمنا برپا ہوئی تھی۔ اُسے گویا عشق ہو گیا۔ کہ نقش مبارک اُس کے سینہ کا زیور بنے۔ اس عشق نے اُس کو "موت" کا بھی آرزو مند بنا دیا۔ مگر خودکشی حرام ہے۔ تو اُس نے اکابر مشائخ کی خدمت میں حاضری شروع کی۔ کہ یہ روحانی مقصد انھیں کے ذریعہ حاصل ہو سکتا ہے۔ جو اس شاہراہ کی منزلوں سے واقف ہوتے ہیں۔ جب اُسے حضرت خواجہ جلال الدین کبیر الاولیاء کی اس کرامت اور آپ کی دعا کی اس غیر معمولی مقبولیت کا علم ہوا۔ کہ دم کے دم میں بادشاہ کے پیر خدا کے فضل سے صحت مند و تندرست ہو گئے۔ تو اُس کو یقین ہو گیا کہ جس کی دعا موت کو زندگی سے بدل سکتی ہے یقیناً اُس کے انفاس قدسیہ زندگی سے بیزا۔ کو موت کا عطیہ بھی عطا فرما سکتے ہیں۔ چنانچہ وہ پانی پت پھونچا۔ اور بے مہا با حجرہ مبارک میں داخل ہونے لگا۔

شیخ زینا جو حضرت مخدوم کبیر الاولیاء کے خادم خاص اور خلیفہ تھے آستانہ پر حاضر تھے۔ اور بالفاذا سیر الاقطاب "حلقہ حجرہ" رو دست گرفتہ ایستادہ بلسان فیل مست بے جنبہ۔ "حجرہ مبارک کی زنجیر ہاتھ میں تھامے کھڑے تھے اور دست ہاتھ کی طرح جھوم رہے تھے۔

شیخ زینا نے جب اس لوجوان کو بے باکانہ حجرہ میں داخل ہونے دیکھا تو ڈانٹ کر کہا۔ اوجھ! کہاں جاتے ہو۔ کیا تم زندہ سلامت واپس آنا نہیں چاہتے۔

فتح خاں نے تڑخ کر جواب دیا: "سلامت می روم و سلامت باز آیم"

(زندہ سلامت جاؤں گا اور اسی طرح زندہ سلامت واپس آؤں گا)

شیخ زیناہ اگر تم زندہ سلامت واپس آ جاؤ تو میرا کرتا چاک کر دینا۔ ورنہ
میں تمہاری "پی پی" کو یعنی تمہارے کپڑے کو، پارہ پارہ کر دوں گا۔
فتح خاں کی آرزو ہی یہ تھی کہ موت کی پیشین گوئی کسی طرح میسر آجائے
اُس نے شیخ زیناہ کے اس جملہ کو اپنی مراد کے لئے فال نیک تصور کیا اور اسی
طرح زبردستی حجرہ میں داخل ہو گیا۔

حضرت شیخ مراقبہ میں مصروف تھے۔ فتح خاں برابر میں دست بستہ کھڑے ہو گئے
حضرت شیخ محضوری دیر کے بعد مراقبہ سے فارغ ہوئے تو اتفاق سے
زبان مبارک سے یہ جملہ صادر ہوا۔ "برو بمیر" (جاؤ مر رہو) اس جملہ کے سننے
ہی فتح خاں مسرت سے بے خود ہو گیا۔ اور مریدانہ انداز میں آداب بجالاتے
ہوئے حجرہ سے باہر آیا۔ شیخ زیناہ اسی طرح آستانہ پر حاضر تھے۔ فتح خاں
نے مخاطب ہو کر کہا۔ دیکھئے کس طرح زندہ سلامت نکل آیا۔

شیخ زیناہ۔ سلامتی کہاں۔ تیر نشانہ پر پہنچ گیا۔ موت کو سر پر سوار
کر کے لائے ہو۔ وہی تک صحیح سالم نہیں پہنچ سکتے۔

فتح خاں کی خود تمنا یہی تھی۔ اس نے کہا۔ حضرت زیناہ میری تو آرزو
یہی ہے۔ اسی لئے تو آیا تھا۔ اور حضرت مخدوم کے ارشاد کے بعد آپ کی
زبان سے بھی یہی کہلوانا چاہتا تھا۔ تاکہ بات پکی ہو جائے۔

اب فتح خاں خوش تھا۔ پھرتی سے گھوڑے پر سوار ہوا۔ اور دہلی کی
طرف گھوڑا دوڑا دیا۔ دہلی کے قریب پہنچا تو اُس کو نیند آنے لگی۔ گھوڑے
کو ٹھیرا یا۔ اور چادرتان کر ایک درخت کے نیچے بیٹ گیا۔ اور فوراً ہی۔
"جان بحق تسلیم کرو" (جان جان آفرین کے حوالہ کر دی۔

بادشاہ کو اس کی وفات کا علم ہوا تو اس کی موت سے زیادہ اس

کا افسوس ہوا کہ وہ بازی لے گیا۔

چنانچہ دفن کے وقت یہ نقش مبارک اس کے سینہ کا زیور بنایا گیا۔

اللہ ویا صاحب مصنف سیر الاقطاب تحریر فرماتے ہیں :-

"تا حال مطاف خلائق گردید۔"

یہ مزار اب تک مخلوق کی زیارت گاہ ہے۔

اللہ ویا صاحب نے سیر الاقطاب کی تصنیف ۱۳۶ھ میں شروع

کی تھی اور جیسا کہ آخر میں خود تحریر فرمایا ہے ۱۵۶ھ میں ختم کی۔ یہ شاہجہاں

بادشاہ کا دور حکومت ہے۔ اس وقت یہ مزار زیارت گاہ خلق خدا ہو گا۔

ایک گنبد پانی پت کے راستہ میں موضع باولی کے قریب دہلی سے

تقریباً ۳۱ میل کے فاصلہ پر اب بھی ہے۔ اس کے متعلق اسی قسم کی روایت

مشہور ہے۔ مگر اب یہ زیارت گاہ نہیں رہا۔ بلکہ غیر آباد کھنڈر ہے۔ ممکن

ہے دہلی کی بڑھتی ہوئی آبادی چند روز ہی میں اس کو بے نشان کر دے۔

(۴) یوں تو عام طور پر اراکین و معتقدین کی درخواست اپنے مشائخ

سے ہوا کرتی ہے۔

آنانکہ خاک را بنظر کیمیا کنند

آیا بود کہ گوشہ چشمے بمسا کنند

وہ جو خاک کو بھی ایک نظر سے کیمیا بنا دیتے ہیں۔ کیا یہ ممکن ہے کہ ایک

نظر ہم پر بھی ڈال دیں۔

مگر حضرت مخدوم کبیر الاولیاء کے متعلق ایسی روایتیں بھی مشہور ہیں۔ کہ

آپ نے دلوں کی کھوئی پونجی ہی کو کیمیا نہیں بنایا۔ بلکہ آپ کی نظر کیمیا اٹھانے

سنگریزوں کو پارس کی پتھری اور لکڑی اور لوہے کے سامان کو زرخا لہ بنایا

چنانچہ ایک مرتبہ آپ کسی دریا کے کنارے پہنچے۔ وہاں ایک جوگی آنکھ بند کئے بیٹھا تھا۔ حضرت شیخ اس کے پاس پہنچے تو اس نے آنکھ کھولی۔ اور کہا خوب آئے۔ میرے پاس پاس کی پتھری ہے۔ میں نے طے کر لیا تھا۔ کہ جب میں آنکھ کھولوں گا تو جو بھی سامنے ہوگا۔ یہ پتھری اس کو دیدوں گا۔ یہ تمہاری خوش نصیبی ہے کہ تم سامنے ہو۔ لو اس پتھری کو احتیاط سے رکھو۔ دولت لازوال تم کو میسر آگئی۔

حضرت شیخ نے وہ پتھری لی۔ اور لاہور وائی سے دریا میں پھینک دی۔ جوگی کو اس حرکت پر بہت ٹٹیش آیا۔ اس نے حضرت شیخ کی شان میں بہت سخت سست الفاظ بکنے شروع کئے حضرت شیخ نے فرمایا۔ پتھری تم مجھے دے چکے تھے۔ اب اگر میں نے اس کو دریا میں ڈال دیا تو میری چیز بھٹی۔ میں نے اس کو ضائع کر دیا۔ اب آپ خفا کیوں ہوتے ہیں۔ مگر جوگی کا غصہ فرو نہیں ہوا۔ وہ اور تیزی سے برہم ہونے لگا۔ اور یہ کہ وہ پتھری واپس کرور نہ میں تجھے یہاں سے جانے نہ دوں گا۔

حضرت شیخ نے جب اس کو حد سے زیادہ برا فروختہ دیکھا تو فرمایا: خفا نہ ہو جائے۔ دریا میں نظر ڈالئے۔ آپ کو اس جیسی بہت سی پتھریاں ملیں گی۔ اپنی پتھری لے لیجئے۔ مگر دیکھئے صرف ایک ہی پتھری لینا۔ یہ نہ ہو کہ طمع میں آکر دامن بھرنے لگو۔

جوگی نے نظر ڈالی تو واقعی دریا میں پاس کی پتھریاں بے شمار پری تھیں اب جوگی حیران ہوا۔ اول تو اس نے چاہا کہ کئی پتھریاں اٹھالے۔ مگر حضرت شیخ نے فوراً روکا۔ کہ اپنے وعدہ پر قائم رہو۔ ایک سے زیادہ نہ لو۔ بہر حال جوگی کا جوش اور غصہ ختم ہوا۔ تو حضرت شیخ نے فرمایا۔ جس کو

درگاہ حضرت مخدوم شیخ جلال الدین کبیر الاولیاء



خدا نے یہ طاقت بخشی ہو کہ معمولی سنگریزوں کو پارس کی پتھری بنا دے۔ وہ پارس کی ایک پتھری کی کیا قدر کر سکتا ہے۔ اور بھائی جو گی، پارس کی پتھری کی تلاش بے کار ہے۔ اس طاقت کی جستجو کرو۔ جو سنگریزوں کو پارس کی پتھری بنا دیتی ہے۔

اب جو گی کی آنکھیں کھلیں، پارس کی پتھری کا رخار دماغ سے دور ہوا۔ اور اس حقیقی طاقت کی جستجو میں وہ آپ کے دامن سے وابستہ ہو گیا۔ چنانچہ دولت اسلام کے ساتھ اس کو خدا شناسی اور خدا رسی کی لازوال دولت بھی میسر آئی۔

(۵) اسی طرح ایک مرتبہ حضرت شیخ کہیں سفر میں تشریف لے جا رہے تھے۔ شب کے وقت ایک گاؤں میں قیام فرمایا۔ دیکھا کہ گاؤں والے اپنا سامان اٹھا کر اپنے کپڑوں کی بچھیاں باندھ کر گاؤں سے فرار ہونے کی تیاری کر رہے ہیں۔ حضرت نے وجہ دریافت کی۔ تو گاؤں والوں نے عرض کی کہ اس سال زلہ باری سے ہماری فصلیں تباہ ہو گئی تھیں۔ حاکم سے ہم نے معافی کی درخواست کی۔ اس نے محصول معاف نہیں کیا۔ وہ کل کو یہاں آنے والا ہے۔ ہم پر ظلم و ستم کرے گا۔ اس لئے ہم یہاں سے بھاگ رہے ہیں۔

آپ نے فرمایا:۔ اگر تم لوگ یہ گاؤں میرے ہاتھ فروخت کر دو۔ اور اس کا نام بدل کر جلال آباد رکھ دو۔ تو تم کو میں اتنا سونا دیدوں گا کہ تمہاری محصول ادا ہو جائے گا۔ باقی کو تم اپنے کام میں بھی لاسکو گے اور خوشحال ہو جاؤ گے۔ گاؤں والوں کے لئے اس سے زیادہ اطمینان اور خوشی کی بات کیا ہو سکتی تھی وہ سب تیار ہو گئے۔

آپ نے فرمایا۔ اچھا ایک کام کرو۔ تمہارے یہاں جتنے لوہے کے

اوزار ہیں سب کو اکٹھا کر لو۔ اور لکڑیوں کا ایک انبار لگا لو۔

گاؤں والے جو ان تمام اوزاروں کو چھوڑ کر فرار ہو رہے تھے وہ اس کے لئے آمادہ ہو گئے۔ اور اپنے تمام اوزار کٹھے کر دیئے۔ لکڑیوں کا بھی انبار لگا دیا۔ حضرت شیخ نے لکڑیوں میں آگ لگائی۔ اور فرمایا صبح کو اپنے اپنے اوزاروں کو دیکھنا۔ لکڑیوں کے انبار نے جب آگ پکڑ لی تو نصف شب کے قریب حضرت شیخ اس گاؤں سے روانہ ہو گئے۔ جب صبح ہوئی۔ گاؤں والے لکڑیوں کے اس چٹے پر جو رات بھر جل کر اب خاک ہو گیا تھا پہنچے۔ دیکھا کہ جو اوزار لوہے کے تھے۔ وہ سب سونے کے ہو گئے تھے۔ ان غریبوں نے اپنے یہ اوزار لئے اور حاکم کا واجبی محصول ادا کر دیا۔ باقی تمام سونا آپس میں تقسیم کر کے مالا مال ہو گئے اور حسب وعدہ گاؤں کا نام "جلال آباد" رکھ دیا۔

ان روایتوں کے مطالعہ سے ایک ظاہر ہے کہ نظر حضرت مخدوم کی قوت تصرف پر ہوگی۔ مگر ہماری نظر اس استغنا اور بے نیازی پر ہے جو ان کرامتوں کی بنیاد ہے۔ جو حقیقی پر تو ہے سید الکونین رحمۃ اللعالمین (صلی اللہ علیہ وسلم) کے اسوہ مبارکہ اور آپ کی سیرت مقارنہ کا۔

آپ نے سیرت کی کتابوں میں پڑھا ہوگا۔ کہ ایک مرتبہ حضرت جبریل علیہ السلام نے دربار رسالت میں عرض کیا تھا کہ اگر اجازت ہو تو واحد کے اس اونچے پہاڑ کو آپ کے لئے سونا بنا دیا جائے۔ تو سیر الکائنات کا جواب یہ تھا۔ خداوند! مجھے یہ فقر ہی پسند ہے۔ ایک وقت بھوکا رہوں تو صبر کروں دوسرے وقت کھانا مل جائے تو شکر کروں۔ صبر و شکر دونوں کمال ہیں۔ دونوں کی فضیلتیں سیر آتی رہیں۔

اسی کو صوفیا "فقر اختیاری" کہہ دیتے ہیں۔ کہ دولت بداماں ہوتے

ہوئے اپنی مرضی سے تہی دست ہیں۔

چنانچہ سیر الاقطاب میں واقعہ نقل کیا ہے کہ ایک کیمیاگر اتفاق سے پانی پت پہونچ گیا تھا۔ اس کو کسی طرح خانگی حالات کا علم ہو گیا۔ تو اُس نے حضرت مخدوم کبیر الاولیاء کے ایک صاحبزادہ کو اپنا شاگرد بنا چاہا صاحبزادہ نے والد صاحب سے اجازت چاہی۔ والد صاحب (حضرت مخدوم صاحب) حجرہ میں تشریف فرما تھے۔ آپ نے اپنی کھنکار کا لعاب حجرہ کی دیوار پر تھوک دیا۔ پوری دیوار دفعتاً سونا بن گئی۔ آپ نے صاحبزادہ کو یہ منظر دکھایا اور فرمایا۔ نخت جگر، کیمیاگر کا کیمیا کوئی حقیقت نہیں رکھتا۔ اصل کیمیا یہ ہے۔ یہ کیمیا سعادت حاصل کرو۔

(۶) حضرت مخدوم الاولیاء کی ایک اور کرامت بھی نقل کی جاتی ہے کہ

حضرت ایک روز کہیں تشریف لے جا رہے تھے۔ راستہ میں ایک بڑھیا ملی۔ حد سے زیادہ کمزور، چلنا پھرنا مشکل۔ پانی کی ایک ٹھلیا لئے جا رہی تھی۔ آپ نے بڑھ کر اس غریب بڑھیا سے یہ ٹھلیا لے لی۔ اور فرمایا۔ بڑی بی، کوئی اور نہیں تھا جو پانی لے جاتا۔ بڑی بی! کوئی ہوتا تو میں یہ مصیبت کیوں اٹھاتی۔ آپ نے فرمایا۔ اچھا چلو۔ پھر آپ نے یہ ٹھلیا بھری اور اس کے مکان پر پہونچادی۔ اور فرمایا۔ بڑی بی جب تک تم زندہ ہو۔ اس ٹھلیا کا پانی انشاء اللہ تعالیٰ ختم نہیں ہوگا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ جب تک وہ بڑھیا زندہ رہی ٹھلیا کا پانی ختم نہیں ہوا۔

ہمارا خیال یہ ہے کہ اس بڑھیا کا مکان کہیں دور تھا۔ ورنہ حضرت صدیق اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما کی سنت تو صحیح روایتوں سے یہ ثابت ہے کہ ایسی بڑھیا کے مکان پر یہ حضرات صبح سویرے روزانہ تشریف لے جاتے تھے۔

اور نہ صرف پانی بلکہ گھسکا اور کام بھی پورا کر کے واپس آتے تھے۔

(۷) حضرت مخدوم کبیر الاولیاء رحمۃ اللہ علیہ کا ایک اور کمال ایک تاریخی اہمیت رکھتا ہے۔ اس کی اگر تفصیل کی جائے تو کچھ باتیں مورخین کے لئے ناقابل فہم بھی ہیں۔ اس لئے جو مورخ سوانح نگاری میں روایت کے ساتھ روایت سے بھی کام لینا چاہتے ہیں۔ انہوں نے اس کو نظر انداز کر دیا ہے۔ مگر واقعہ اتنا مشہور ہے کہ اس کو نظر انداز کر دینا بھی مناسب نہیں ہے۔ اس لئے ہم بنام خدا اس کو تفصیل کے ساتھ نقل کرتے ہیں۔

حضرت مخدوم صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا کمال اور آپ کی کرامت تو یہ ہے کہ حضرت شیخ جمال الدین احمد ہالنسویؒ کا سلسلہ فیض جو حضرت خواجہ علاؤ الدین علی احمد صابر کلیری رحمۃ اللہ علیہ کی بددعا سے بند ہو گیا تھا۔ حضرت مخدوم جلال الدین کبیر الاولیاء کی دعائے سے وہ دوبارہ جاری ہوا۔ یہ کمال اور یہ کرامت یقیناً قابل تذکرہ ہے لیکن پہلی بات بددعا کی ہے۔ کہ حضرت صابر کلیری رحمۃ اللہ علیہ نے بددعا کیوں کی؟۔ دوسری بات یہ کہ حضرت شیخ جمال الدین ہالنسوی رحمۃ اللہ علیہ کی وفات ۶۶۵ھ میں ہوئی۔ مورخین یہ بھی تحریر فرماتے ہیں کہ حضرت بابا فرید الدین گنج شکر رحمۃ اللہ علیہ کی زندگی ہی میں حضرت شیخ جمال الدین صاحب وفات پا گئے تھے۔ بہر حال یہی زمانہ ہے کہ حضرت خواجہ صابر رحمۃ اللہ علیہ اسی زمانہ میں اجودھن سے کلیر تشریف لائے ہیں۔ اس وقت تک حضرت مخدوم کبیر الاولیاء تو کیا ان کے شیخ حضرت شیخ شمس الدین ترک بھی حضرت صابر رحمۃ اللہ علیہ کے حلقہ ارادت میں داخل نہیں ہوئے تھے جیسا کہ پہلے تفصیل سے گذر چکا ہے۔ یا اگر داخل ہوئے تھے تو ارادت و عقیدت کا ابتدائی دور تھا۔ حضرت مخدوم صاحب اس سے بہت بعد تقریباً ۶۹۰ھ میں یعنی تقریباً

پچیس سال بعد حضرت ترک سے بیعت ہوئے ہیں پھر مراہل سلوک لے گئے ہیں۔
 پس ۱۶۵ھ میں ان کی یہ حیثیت نہیں ہو سکتی تھی کہ وہ حضرت شیخ جمال الدین رح
 کے لئے دعا کرتے اور اس دعا سے ان کا سلسلہ فیض جاری ہو جاتا۔ ان دونوں
 سوالوں کے جواب ان سطور میں درج کئے جا رہے ہیں۔ اور جواب سے پہلے
 حضرت شیخ جمال الدین ہانسوی رح کا اتنا تعارف کرانا ضروری ہے کہ یہ حضرت
 شیخ فرید الدین گنج شکر رحمۃ اللہ علیہ کے نہایت ہی برگزیدہ اور بلند پایہ خلفاء میں سے
 تھے۔ ذاتی تعلق کا یہ عالم تھا کہ ایک عرصہ تک اپنے اسی چہیتے مرید کی خاطر با صاحب
 ہانسی میں مقیم رہے تھے۔ پھر جب خلافت عطا کر دی۔ تو حضرت گنج شکر کو اپنے اس
 خلیفہ پر اتنا اعتماد تھا کہ جن صاحب کو سند خلافت (مثال قطبیت) عطا فرماتے
 تھے۔ ان کو پہلے ہدایت یہ فرماتے تھے کہ ہانسی پہنچ کر شیخ جمال الدین سے بھی اس
 کی تصدیق کراؤ اور ان سے مہر لگوا لو۔

حضرت شیخ جمال الدین صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو اپنے شیخ یعنی خواجہ گنج شکر
 کی طرف سے یہ اختیار بھی حاصل تھا کہ جس کو نا اہل سمجھتے تھے۔ اس کی سند خلافت
 چاک کر دیا کرتے تھے۔ یہ چاک کر دینا گویا آخری فیصلہ ہوتا تھا۔ حضرت گنج شکر
 بھی اس کی خلافت مسترد کر دیتے تھے۔ آپ فرمایا کرتے تھے:-

"پارہ کردہ جمال را فرید ہرگز نمی تواند دوخت۔" (جمال کے چاک کردہ کو فرید
 نہیں سی سکتا)

حضرت شیخ جمال الدین احمد صاحب ہانسوی جس طرح بلند پایہ شیخ غریقت
 تھے۔ ایسے ہی بلند پایہ عالم بھی تھے۔ انبار الاجبار میں ان کی ایک تصنیف
 کا کچھ حصہ بھی بطور نمونہ پیش کیا گیا ہے۔

یہ حضرت جمال واقعی اسم باسمی تھے۔ ایک مرتبہ حضرت شیخ بہاء الدین زکریا

ملتان رحمتہ اللہ علیہ نے حضرت شیخ المشائخ بابان گنج شکر کو لکھا کہ میرے تمام مریدوں اور خلفاء کو لے لو۔ اور جمال الدین کو ویدو۔ تو حضرت بابا صاحب نے جواب دیا۔ کہ جمال الدین میرا جمال ہے۔ معاوضہ مال میں ہو سکتا ہے نہ کہ جمال میں۔ ادھر حضرت خواجہ صابر کلیری بھی حضرت بابا صاحب کے یہاں واماوی کے علاوہ محض اپنی روحانی بلند قابلیتوں کی بنا پر یہ درجہ رکھتے تھے کہ حضرت بابا صاحب فرمایا کرتے تھے:- کہ میرے سینہ کا علم نظام الدین سلطان المشائخ نظام الدین اولیاء — بدایونی دہلوی اکو ملا ہے اور میرے دل کا علم خواجہ علی احمد صابر کو۔ کبھی یہ فرماتے تھے:- کہ

میرے ظاہری اور باطنی علوم نظام الدین میں سرایت کر گئے ہیں۔ اور میرے اکابر مشائخ کے ظاہری اور باطنی علوم کا اثر علی احمد صابری میں نمایاں ہوا ہے۔

بہر حال یہ تینوں خلفاء ایسے بلند پایہ ہیں کہ آسمان طریقت کو کبھی ان کے سامنے سر جھکانا پڑتا ہے۔

اب وہ قصہ سنئے جس کو ہم اپنی فہم اور قابلیت سے بالاتر قرار دیتے ہیں۔ قصہ کا خلاصہ یہ ہے کہ حضرت بابان گنج شکر رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت خواجہ صابر کلیری رحمۃ اللہ علیہ کو پہلے دہلی کے لئے مامور فرمایا تھا۔ کہ وہاں پہونچ کر اپنا سلسلہ فیض جاری کریں۔ مگر جب آپ نے سندِ خلافت عطا فرما کر دہلی کے لئے روانہ فرمایا تو حسب معمول یہ ہدایت آپ کو کبھی کر دی کہ پہلے شیخ جمال الدین صاحب ہانسوی کے پاس پہونچ کر اس سند پر ان کی تصدیق کرا لو۔ حضرت صابر اپنے شیخ کی ہدایت کے بموجب ہانسوی پہونچے۔ اور جب وہ حضرت شیخ جمال الدین صاحب کے یہاں پہونچے تو مغرب کا وقت ہو گیا تھا۔

آپ حضرت ہانسوی کے یہاں شب گزارنا نہیں چاہتے تھے۔ بلکہ چاہتے تھے کہ جلد تصدیق اور مہر وغیرہ سے فراغت ہو جائے تو اگلی منزل کے لئے روانہ ہو جائیں۔ بہر حال مغرب کی نماز پڑھی گئی۔ اس کے بعد حضرت خواجہ صابر نے مثال قطبیت (سند خلافت) تصدیق کے لئے پیش کی۔ تو حضرت شیخ جمال نے فرمایا کہ اندھیرا ہو گیا ہے چراغ آنے دو تب تصدیق لکھوں گا۔ اگرچہ حضرت خواجہ صابر کو جلدی تھی۔ تاہم تھوڑی دیر چراغ کا انتظار کیا۔ پھر چراغ آیا تو اتفاق سے ہوا تیز چل رہی تھی، چراغ بجھ گیا۔ حضرت خواجہ صابر کلیری کو ایک ایک لمحہ مشکل ہو رہا تھا۔ چراغ گل ہو گیا تو چونکہ اس زمانہ میں دیسلانی نہیں ہوتی تھی چھپاق جیسی چیزوں سے چراغ جلانے جاتے تھے جس میں کچھ دیر لگتی تھی حضرت صابر کو یہ دیر برداشت نہیں تھی۔ آپ نے فوراً چراغ پر پھونک ماری۔ چراغ آپ کی پھونک سے روشن ہو گیا۔

حضرت شیخ جمال الدین کو یہ عجلت پسند نہیں آئی۔ آپ نے سند خلافت چاک کر دی۔ اور فرمایا:-

”دہلی بیچارہ تاب دم آتشیں شماندارد۔ اگر خواہید رفت بیک دم
خواہید سوخت“

ربپاری دہلی آپ کے دم آتشیں کو برداشت نہیں کر سکے گی۔ اگر آپ وہاں پہنچ جائیں گے تو ایک سانس میں دہلی کو بھسم کر دیں گے۔

حضرت شیخ جمال ہانسوی رحمۃ اللہ علیہ کا یہ خیال سوائے لکھنؤ والوں کی روایت کے بموجب صحیح تھا۔ کیونکہ دہلی کے بجائے جب آپ کلیر پہنچے تو راوی بیان کرتے ہیں۔ کہ شہر کلیر کو برباد کر دیا تھا۔ جس کی وجہ یہ بیان کی جاتی ہے۔ کہ جامع مسجد میں جب حضرت صابر پہنچے تو لوگوں نے جگہ نہیں دی۔ اور ایک

غریب مسافر سمجھ کر پہلی صفوں سے پیچھے ہٹا دیا۔ یہاں تک کہ آپ مسجد سے باہر نکل کر نماز پڑھ سکے۔ اس پر حضرت صابر کو طیش آیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ یہ مسجد منہدم ہو گئی۔ جتنے لوگ چھت کے نیچے تھے وہ وہیں ختم ہو گئے۔ پھر پیران کلیر اتنا دیران ہوا کہ لوگ وہاں جاتے ہوئے ڈرتے تھے۔ حتیٰ کہ آپ کے خلفاء بھی وہاں نہیں گئے۔ ایک دراز عرصہ کے بعد جو ایک صدی کے قریب ہوتا ہے۔

سب سے پہلے حضرت احمد عبدالحق رودلوی خلیفہ حضرت مخدوم کبیر نادلیا پیران کلیر تشریف لے گئے۔ پھر ان کے خلیفہ حضرت شیخ عبدالقدوس گنگوہی نے اس خالقہ کو آباد کیا۔ (واللہ اعلم)

بہر حال حضرت شیخ جمال الدین احمد بالنسوی نے حضرت خواجہ صابر کی سند چاک کر دی تو آپ کو بہت غصہ آیا اور آپ نے فرمایا:-

”تو مثال مرا پارہ کردہ من سلسلہ ترا پارہ کردم“

(تم نے میری سند چاک کر دی تو میں تمہارا سلسلہ چاک کرتا ہوں۔)

حضرت جمال نے فرمایا:- از اول یا آخر۔ (شروع کا حصہ یا آخر کا) تو فرمایا

شروع کا حصہ۔

اس تلخ گفتگو کے بعد حضرت صابر فوراً اٹھے۔ دہلی کے بجائے حضرت شیخ

کی خدمت میں ”اجودھن“ پہنچے اور تمام واقعہ بلا کم و کاست بیان کر دیا۔ اور

جب حضرت خواجہ کلیری نے بیان فرمایا۔ کہ جب میری سند چاک کر دی تو میں نے

کہا۔ میں نے تمہارا سلسلہ چاک کر دیا۔ تو حضرت گنج شکر رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا۔

دین کے پہلو والوں کا تیر خطا نہیں کرتا۔ غنیمت ہو اتم تے جمال الدین کے

سلسلہ فیض کا ابتدائی حصہ ہی چاک کیا ہے۔ آخری حصہ تو سالم رہا۔ تمہارا

کوئی مرید دعا کرے گا تو جمال الدین کا ٹوٹا ہوا سلسلہ بھر جڑ جائے گا۔ اور

چشمہ فیض جاری ہو جائے گا۔

اس واقعہ کے بعد حضرت گنج شکر نے اس چاک کر وہ کو تو نہیں جوڑا یعنی آپ کو دوبارہ دہلی تو نہیں بھیجا۔ البتہ آپ کے لئے "کلیر" کی طبیعت تجویز فرمادی کہ کلیر کو مرکز بنا کر خدمت ارشاد و طریقت انجام دیں۔

بہر حال سند چاک کرنے اور حضرت صابر کی بددعا کا قصہ تو یہ ہے۔ اب رہا دوسرا سوال کہ جب حضرت شیخ جمال الدین کی وفات ۶۶۵ھ میں ہو گئی تھی تو حضرت مخدوم جلال الدین کبیر الاولیاء نے دعا کب کی اور کس طرح کی۔ اس کا جواب سیر الاقطاب کی ایک روایت سے ملتا ہے۔ صاحب سیر الاقطاب۔ دعا کے واقعہ کو حضرت مخدوم کبیر الاولیاء کے زمانہ شباب کا واقعہ بیان کرتے ہیں۔

مصنف سیر الاقطاب فرماتے ہیں :- کہ

ایک مرتبہ ایسا ہوا کہ حضرت مخدوم خواجہ محمد (جو ابھی تک جلال الدین کبیر الاولیاء نہیں ہوئے تھے) چند ساتھیوں کے ساتھ ہانسی تشریف لے گئے۔ حضرت شیخ جمال الدین کو نور یا طنی سے معلوم ہو گیا کہ خواجہ محمد آ رہے ہیں۔ جن کی دعا سے میرا سلسلہ فیض دوبارہ جاری ہوگا۔ نو وہ آپ کی آمد کے یہاں تک منتظر ہوئے کہ ہانسی سے باہر تشریف لے جا کر تحقیق فرمایا کرتے تھے۔

ایک روز آپ کو معلوم ہوا کہ کچھ فقہار پانی پیت کی طرف سے آ رہے ہیں۔ تو آپ نے اپنے آدمیوں کو بھیجا کہ ان کو یہاں لے آؤ۔ آپ کے آدمی پہنچے اور ان کو لے آئے۔ حضرت شیخ جمال الدین نے ان کی بہت مہارت کی۔ مگر ان میں وہ شخص نظر نہیں آیا۔ جس کی کچھ خاص علاماتیں آپ کو کشف میں دکھائی گئی تھیں۔ تو آپ نے ان مہانوں سے دریافت فرمایا۔ کہ کیا آپ کا کوئی اور ساتھی بھی ہے۔

مہانوں نے کہا کہ ہم فقرا تو سب آگئے ہیں۔ البتہ
 "یک جوان خور و سال کہ بجا فطرت اسباب و اشیا رماست حساب
 دیانت و صالح پیش او چیز خود ہا گذاشتہ آمدہ ایم۔"
 را ایک کم عمر نو جوان رہ گیا ہے۔ وہ صاحب دیانت۔ امانت دار اور
 نیک لڑکا ہے۔ اس کو اپنے سامان کی حفاظت کے لئے چھوڑ آئے ہیں)
 شیخ فرمود: "واللہ من بہماں طفل کار وارم۔"

(شیخ نے فرمایا: واللہ مجھے اسی "طفل" سے کام ہے۔)

بہر حال حضرت شیخ جمال الدین نے کھانا منگایا۔ ان فقرا کے سامنے کھانا
 رکھا اور فرمایا کہ ایک صاحب قیام گاہ پر تشریف لے جائیں وہ اس جوان کو
 لے آئیں۔ اور ان کے ساتھ کھانا کھالیں۔ چنانچہ یہ جوان تشریف لائے۔
 تو وہی حلیہ اور وہی شناختیں موجود تھیں۔ جو حضرت شیخ پر منکشف ہوئی تھیں۔
 حضرت شیخ جمال الدین نے ان کا بہت احترام سے استقبال کیا۔ کھانا
 کھلایا اور جب فرائض مزارات سے فارغ ہو گئے۔ تو حضرت صابر کلیری
 کی سند چاک کرنے اور ان کی بددعا وغیرہ کا قصہ بیان کیا۔ اور اس جوان سے
 کہا کہ آپ دعا کریں۔ حضرت خواجہ محمد (جوان صالح) نے دعا کی۔

مصنف سیر الماقطاب فرماتے ہیں کہ اس کا اثر یہ ہوا کہ حضرت شیخ جمال
 کا چھوٹا بچہ نور الدین جس کی عمر حضرت شیخ کی وفات کے وقت صرف چھ ماہ تھی۔
 اس کو حضرت سلطان المشائخ خواجہ نظام الدین اولیاء کی خدمت میں لے
 گئے (رحمۃ اللہ علیہ) آپ نے ان کو خلعت خلافت عطا فرمائی۔ اور پھر ان سے
 حضرت شیخ جمال کے فیض کا سلسلہ جاری ہوا۔

مولانا غلام سرور صاحب مصنف خزینۃ الاصفیاء فرماتے ہیں کہ حضرت

خواجہ صابر کلیری کی بددعا رکاوٹ یہ اثر ہوا کہ حضرت شیخ جمال الدین صاحب کے بڑے صاحبزادے "کہ مردے دانش مند عظیم بود۔ دیوانہ شد" (جو ایک بہت بڑے عالم فاضل تھے۔ دیوانہ ہو گئے۔ ریاضیسا کہ دوسرے مصنفین فرماتے ہیں مجذوب ہو گئے) چھوٹے صاحبزادے اپنے والد صاحب سے فیض نہیں پاسکے۔ البتہ حضرت سلطان الاولیاء شیخ نظام الدین صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی خصوصی شفقت سے وہ فیضیاب اور کامیاب ہوئے اور ان سے فیض جاری ہوا۔ (چھوٹے صاحبزادے کا نام غلام سرور صاحب نے برہان الدین تحریر کیا ہے۔ ممکن ہے ان کا نام بچپن میں نور الدین ہو)

شیخ اللہ دیا صاحب مصنف سیر الاقطاب تحریر فرماتے ہیں کہ حضرت خواجہ محمد (مخدوم صاحب کبیر الاولیاء) کا دستور اس سفر میں یہ تھا کہ تمام ساتھیوں کا اسباب خود اٹھا کر سب سے آگے آگے چلا کرتے تھے۔ جب ان ساتھیوں نے دیکھا کہ حضرت شیخ جمال الدین ہانسوی نے اس نوجوان کی اتنی تعظیم کی ہے تو اب ان کی آنکھیں کھلیں۔ انہوں نے اس بے تکلفی کی معافی چاہی۔ حضرت خواجہ محمد نے فرمایا۔ معافی مانگنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ میں اپنے شوق سے یہ خدمت کرتا تھا۔ اور اب بھی اسی طرح کرتا رہوں گا۔

پھر شیخ اللہ دیا صاحب یہ بھی فرماتے ہیں کہ یہ ساتھی قلندر تھے۔ اور حضرت خواجہ محمد کی طبیعت میں اترار سے جو ایک محبت اور عشق اور دوستی کا رنگ تھا۔ اس نے آپ کو ان قلندروں کے ساتھ کر دیا تھا۔

حضرت شیخ جمال الدین نے جب یہ دیکھا کہ یہ جوان صالح جس کے مراتب اللہ تعالیٰ کے یہاں اتنے بلند ہونے والے ہیں۔ ان قلندروں کے جال میں پھنس رہا ہے تو آپ کو تکلیف ہوئی۔ آپ کو الگ بلا کر سمجھایا۔ یہ حضرت خواجہ محمد

کی سعادت تھی کہ اُن کی سمجھ میں بات آگئی۔ مگر وہ پانی پیت واپس ہونے کے لئے
 آماؤد نہیں تھے۔ اور جب یہ قلندر ہانسی سے روانہ ہوئے تو انھیں کے ساتھ ہونے
 تب حضرت شیخ جمال الدین نے اپنے خاص آدمیوں کو بھیجا۔ وہ بمشکل تمام حضرت
 خواجہ محمد کو قلندروں کے پنجہ سے نجات دلا کر لائے۔ اور پانی پت واپس کیا۔

بہر حال سند چاک کرنے کا واقعہ ٹوٹروں کا واقعہ ہے۔ ان رموز کو بڑے

ہی سمجھ سکتے ہیں۔ البتہ سیر الاقطاب کی اس روایت سے چند باتیں ایسی
 معلوم ہو گئیں۔ جو حضرت مخدوم صاحب کی سوانح میں خاص اہمیت رکھتی ہیں یعنی
 (۱) حضرت خواجہ محمد جلال الدین کبیر الاولیاء (رحمۃ اللہ علیہ) آغاز شباب
 میں قلندروں کے ساتھ ہونے لگے۔

(۲) جذبہ خدمت یہ تھا کہ ان کا سامان اٹھا کر آگے آگے چلتے تھے۔

(۳) حضرت مخدوم جلال الدین صاحب کی عمر ۱۷ سال نہیں ہوئی۔

یعنی آپ کا سنہ پیدائش ۵۹۵ھ نہیں ہے۔ بلکہ جیسا کہ پہلے لکھا
 گیا ہے تقریباً ۶۳۵ھ یا ۶۴۰ھ ہے۔ کیونکہ حضرت شیخ جمال الدین ہانسی
 (متوفی ۶۶۵ھ) سے یہ ملاقات حضرت خواجہ صاحب کلیری کے اس واقعہ کے بعد
 ہوئی۔ اور حضرت خواجہ کلیری ۶۶۰ھ کے قریب کبیر تشریف لائے ہیں پس ۶۶۵ھ
 اور ۶۶۰ھ کے بیچ میں کسی وقت یہ ملاقات ہوئی ہے۔ جبکہ روایت کے الفاظ
 کے بموجب اس ملاقات کے وقت حضرت مخدوم صاحب کا بچپن یا آغاز شباب تھا
 تو یہ اتنی صورت میں ہو سکتا ہے کہ آپ کی ولادت تقریباً ۶۳۵ھ میں ہوئی ہو۔
 کیونکہ اگر سال ولادت ۶۴۵ھ مانا جاتا ہے تو یہ زمانہ بچپن کا نہیں ہو گا۔ بلکہ
 اس وقت حضرت مخدوم صاحب کی عمر ساٹھ سال سے بھی زیادہ ہونی چاہیے۔
 نماز جمعہ | حضرت مخدوم کبیر الاولیاء کا معمول تھا کہ آپ نماز جمعہ اس مسجد

میں پڑھا کرتے تھے جو حضرت سید محمود صاحب کے مزار مبارک کے قریب تھی اس معمول کی وجہ "سیرالاقطاب" میں یہ بیان کی گئی ہے۔ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہی ہدایت فرمائی تھی۔

اس کے متعلق سیرالاقطاب میں جو قصہ نقل کیا گیا ہے۔ وہ ملاحظہ فرمائیے۔
تحریر ہے:-

"اگرچہ آنحضرت (مخدوم صاحب) بارہا حج ادا کر چکے تھے۔ مگر پھر بھی آپ کا معمول یہ تھا کہ ہر جمعہ کو اپنی کرامت سے آپ مکہ معظمہ پہنچتے اور نماز جمعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ حرم کعبہ شریف میں پڑھا کرتے تھے۔"

یہاں لوگ حضرت مخدوم صاحب کو بہت تلاش کرتے تھے مگر کہیں نہیں ملتے تھے۔ ایک عرصہ کے بعد حضرت مخدوم صاحب کے دل میں خیال آیا۔
"چہ خوب باش اگر رسالت پناہ برائے نماز جمعہ حکم فرماید۔ گا ہے
آنجا و گا ہے اینجا نماز ادا کردہ باشم۔"

دیکھا اچھا ہو اگر آنحضرت رسالت پناہ صلی اللہ علیہ وسلم جمعہ کی نماز کے لئے مجھے حکم فرمادیں کہ کبھی یہاں نماز پڑھ لیا کروں۔ کبھی وہاں۔
چنانچہ اس مرتبہ جب جمعہ کے روز حضرت مخدوم صاحب کعبہ شریف میں نماز سے فارغ ہوئے۔ اور حضرت محبوب رب العالمین صلی اللہ علیہ وسلم سے رخصت ہونے لگے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "شیخ جلال الدین تمہارا کعبہ وہیں ہے جہاں میرے فرزند سید محمود کا روضہ ہے۔ نماز جمعہ وہیں ادا کیا کرو۔" پس اس روز سے حضرت مخدوم صاحب کا معمول یہ ہو گیا کہ جمعہ کے روز پابرسنہ روضہ سید محمود کی مسجد میں جاتے اور نماز جمعہ ادا

کرتے۔ یہ روضہ شہر کے کنارے پر شہر کی مشرقی جانب میں کسی قدر جنوب کی طرف ہٹا ہوا ہے۔ (سیر الاقطاب)

اس روایت کے الفاظ اور مفہوم پر نظر ڈالئے۔ آپ ایک ضروری تبصرہ تضاد محسوس کریں گے۔

کعبہ شریف میں نماز جمعہ ادا کرنا۔ نہ فرض ہے نہ واجب۔ کہ اس کو مطالبہ شرعی کہا جائے۔ اگر اس روایت کو صحیح مانا جائے تو یہ صرف حضرت مخدوم صاحب کے دل کی خواہش تھی یعنی "طے ارض" کی کرامت ان کو حاصل تھی جب ان کا دل چاہتا تھا کہ حرم شریف میں نماز پڑھیں۔ تو وہاں پہنچ جاتے تھے۔ شریعت کا کوئی حکم نہیں تھا کہ آپ ایسا کریں۔ جب حرم شریف میں پہنچنا نہ پہنچنا آپ کی مرضی پر تھا تو پھر اس فقرہ کا کیا مطلب کہ "کبھی یہاں پڑھ لیا کروں کبھی وہاں"۔

اس تضاد کے علاوہ بہت زیادہ قابلِ تنبیہ یہ ہے کہ اس قصہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف چند باتیں منسوب کی گئی ہیں۔

مثلاً (۱) یہ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نماز جمعہ پڑھا کرتے تھے۔

(۲) آپ نماز جمعہ کعبہ شریف میں پڑھا کرتے تھے۔

(۳) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا سید محمود ان کے فرزند ہیں۔

(۴) مخدوم صاحب کا کعبہ وہی ہے جہاں سید محمود کا مزار ہے (وغیرہ)

اگر کوئی شخص یہ کہتا ہے کہ میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب

میں دیکھا کہ آپ یہ فرما رہے تھے۔ تو وہ ایک خواب کی بات ہے۔ مگر یہاں

خواب نہیں ہے۔ یہاں بیداری کی باتیں ہو رہی ہیں۔

اس موقع پر تنبیہ یہ کرنی ہے کہ جب تک قابلِ وثوق سند نہ ہو،

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف کوئی بات منسوب کرنا ایسا "گناہ کبیرہ" ہے جس سے معاذ اللہ ایمان بھی خطرہ میں پڑ جاتا ہے۔ چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا مشہور ارشاد ہے جو نہایت صحیح سندوں سے ثابت ہے کہ جو شخص میری طرف غلط بات منسوب کرے مناسب ہے کہ دوزخ اس کا ٹھکانا ہے۔ یہ حدیث نہایت صحیح المستد ہے۔ یہ روایت اس کے تحت میں آتی ہے۔ لہذا یہ روایت یہاں اس لئے نقل نہیں کی گئی۔ کہ اس کو بیان کیا جائے۔ بلکہ نشایہ ہے کہ ایسی روایتوں کے بیان کرنے سے اجتناب کیا جائے۔

آخری دور اور استغراق | اگر ہمارے اندازے کے بموجب آل مخدوم کی ولادت ۶۳۵ھ مانی جائے۔ تو آپ کی عمر

ایک سو بیس (۱۳۵) سال ہوئی۔ اس عمر میں فطری طور پر بڑھاپے کا ضعف بڑھ جاتا ہے۔ اور آپ کو ریاضتوں اور مجاہدات نے اور کبھی زیادہ کمزور بنا دیا تھا۔ بس آپ پر استغراقی کیفیت ہر وقت طاری رہتی تھی۔ انتہا یہ کہ نماز کے وقت بھی آپ کو توجہ دلائی جاتی تھی۔ اور معمول یہ تھا کہ جب جماعت کا وقت آتا۔ تو حق، حق، حق۔ کہا جاتا۔ اس پر حضرت مخدوم صاحب توجہ فرماتے اور نماز پڑھنے کے لئے کھڑے ہو جاتے تھے۔ اس کے بعد آپ کے متوسلین کا یہی طریقہ ہو گیا کہ نماز جب ختم ہو جاتی تھی۔ حق۔ حق کہا کرتے تھے۔

حضرت مخدوم کبیر الاولیاء رحمۃ اللہ علیہ کے پانچ صاحبزادے | صاحبزادگان | تھے۔ بقول صاحب خزینۃ الاصفیاء پنج گنج ولایت۔ یعنی یہ پانچوں صاحبزادے ولایت کے پانچ خزانے تھے۔

(۱) خواجہ عبدالقادر صاحب رحمۃ اللہ علیہ۔ اپنی والدہ کے بائیں نسا۔ حضرت سید محمود کے روضے میں مدفون ہیں۔ مصنف سیر الاقطاب

انہیں کی اولاد میں سے ہیں۔

(۲) خواجہ ابراہیم بر اپنے والد کے روضہ مبارک میں اُن کے بائیں جانب مدفون ہیں۔

(۳) خواجہ شبلی بر اپنے والد کے دائیں جانب محواستراحت ہیں۔ خواجہ شبلی اپنے والد کے عظیم المرتبت خلفا میں تھے۔

آپ کے متعلق خزنیۃ الاصفیاء کے الفاظ یہ ہیں۔

”عالم بعلوم شریعت و حقیقت بود۔ درفقہ شانے عظیم و مرتبہ عالی داشت۔ درتجربہ و تفرید یگانہ زمانے و از اہل دنیا خراز کلی مے نمود۔“

حضرت شیخ جلال الدین کبیر الاولیاء رحمۃ اللہ علیہ کی وفات کے بعد اُن کی جگہ چند روز اُن کے منجھلے صاحبزادے خواجہ ابراہیم نے سجادہ مشیخت کو زینت بخشی لیکن وہ اپنے چھوٹے بھائی خواجہ شبلی کے حق میں سجادگی سے دست بردار ہو گئے۔ خواجہ شبلی ہمیشہ ذکر الہی میں مشغول رہتے۔ وقار، استقامت اور توکل کو اپنا طرہ امتیاز بنائے ہوئے تھے۔ امرار اور دولت مندوں کے دروازوں پر مطلق نہ جلتے تھے۔ علماء اور فضلا اُن کی صحبت میں رہ کر اکتساب فیض کرتے تھے۔ خلفاء اور مریدوں کی تعداد بہت کافی تھی۔ بقول سیر الاقطاب ”مرید و خلفاء بشمار داشت“ بہت سی کرامتیں آپ کی طرف منسوب ہیں۔ وجد و سماع کا شوق تھا۔ کہتے ہیں آپ نے اپنے کچھ افغان مریدوں کے لئے دعا فرمائی تھی۔ کہ اُن کے تیر کبھی خطا نہیں کریں گے۔ چنانچہ کوئی بھی تیر خالی نہیں جاتا تھا۔ ایک روز ان میں سے کسی کو خیال آیا کہ آسمان کی طرف تیر چلائیں۔ اور دیکھیں کوئی چیز نشانہ بنتی ہے یا نہیں۔ چنانچہ تیر پھینکا۔

ان پٹھانوں کو تعجب ہوا کہ تیر زمین پر واپس آکر پڑا تو ایک سانپ کا سرتیر میں بندھا ہوا تھا۔ تیراز سر مارے گذر کر وہ "آپ کے سات فرزند تھے۔ تاریخ وفات، ربیع الاول ۱۲۵۳ھ ہے۔

(۴) حضرت خواجہ کریم الدین صاحب روضہ سید محمود میں مدفون ہیں۔

جہان ان کی والدہ اور بڑے بھائی آرام فرما رہے ہیں۔

(۵) حضرت خواجہ عبدالواحد۔ اپنے والد ماجد کے روضہ مطہرہ سے باہر

وردازے کے متصل مدفون ہیں۔ ان صاحبزادوں میں سے خواجہ

کریم الدین اور خواجہ عبدالواحد لا ولد رہے۔

آپ کے خلفاء کی تعداد وچالیس بیان کی گئی ہے۔ مذکورہ بالا

پانچ صاحبزادوں کے علاوہ باقی چند اسماء گرامی یہ ہیں۔

خلفاء

(۶) شیخ زینا جن کا ذکر فتح نجاں کے واقعہ میں پہلے گذر چکا ہے۔ یہ

بانجہانی کرتے تھے اور ان کا خاندان حضرت مخدوم کبیر الاولیاء کے مورث اعلیٰ

کے ساتھ "گازرون" سے ہندوستان آیا تھا۔ یہ گازرونی شیخ۔ قصبہ اندری

میں آرام فرما رہے ہیں۔

(۷) حضرت شیخ احمد قلندر۔ قلعہ ملتان کے عقب میں مدفون ہیں۔

(۸) حجۃ الاولیاء حضرت شیخ احمد عبدالحق رحمۃ اللہ علیہ جن سے سلسلہ ارشاد

صرف آراستہ ہی نہیں ہوا بلکہ اُس نے "شجرہ طوبی" کی اذیت اختیار

کرنی کہ عالم ارشاد کا کوئی بھی گوشہ ایسا نہیں ہے۔ جہاں اس کا سایہ

لے سیر الاقطاب میں یہ ہے کہ "او شیخ زینا" ہمراہ جد کمال حضرت مخدوم از گازرون آمد بود

یہ حضرت مخدوم کے پڑدادار مورث اعلیٰ کے ساتھ گازرون سے آئے تھے اور اگر یہ صحیح ہے

تو شیخ زینا کی عمر کئی سو برس ہوئی ہوگی۔ (رواۃ العلماء)

نہ پہنچا ہو۔ مزار مبارک "ردولی" ضلع بارہ نکی میں ہے۔

(۹) حضرت شیخ بہرام۔ مدفن قصبہ بدولی۔

(۱۰) حضرت شیخ شہاب الدین جھنجالی۔ مزار مبارک جھنجانہ ضلع مظفرنگر

(۱۱) حضرت سید موسیٰ بہار۔ صوبہ بہار میں کسی مقام پر مدفون ہیں۔

(۱۲) قاضی محمد اولیاء سلطان پوری۔ سلطان پور ضلع کرنال میں مدفون ہیں۔

(۱۳) شیخ شعیب نبیرہ قاضی محمد اولیاء (مذکور) مزار سونی پت میں ہے

(۱۴) شیخ حسن۔ مدفن موضع پتہرہ۔ پرگنہ بیانہ۔

(۱۵) شیخ احمد عبدالصمد سنامی۔ یہ سنام میں خواستراحت ہیں۔ آپ نے

حضرت کبیر الاولیاء رحمۃ اللہ علیہ کے ملفوظات مرتب فرمائے تھے۔

(۱۶) حضرت سید محمود۔ حضرت قلندر صاحب کے روضہ مبارک کے

متصل مشرق کی جانب مدفون ہیں۔

(۱۷) حضرت شیخ نظام سنام :- مزار مبارک سنام (پنجاب)

(۱۸) حضرت شیخ پیر بنوی۔ آپ کا مزار مبارک بھی سنام میں ہے۔

(۱۹) حضرت میر سید سراج الدین :- حضرت قلندر صاحب کے روضہ منورہ

کے قدیم دروازے کے متصل جانب شمال آسودہ خواب ہیں۔

(۲۰) حضرت شیخ پیر کینبار بفتح کاف و سکون یاد لوزن مدغم و فتح با و

سکون الف) شہر سے متصل محل رانی کے قریب مدفون ہیں۔

(طالب ص ۱۲) شیخ عبداللہ صاحب کنگوی حاشیہ

آپ پانی پت کے اکابر اولیاء اللہ میں سے ہیں۔ حضرت شیخ عمید الکبیر

بالاپیر۔ حضرت مخدوم کبیر الاولیاء رود واسطوں سے آپ کے جدِ امجد ہیں۔ سلسلہ

نسب یہ ہے۔ شیخ عبدالکبیر پسر شیخ عبدالقدوس پانی پتی۔ پسر حضرت خواجہ

شبلی۔ خلف حضرت مخدوم کبیر الاولیاءؒ۔

حضرت شیخ اللہ دیا صاحب مصنف سیر الاقطاب فرماتے ہیں:-
 "آپ ولی مادر زاد تھے جو کچھ آپ کی زبان پر آتا۔ فوراً ظہور میں
 آجاتا تھا۔ اسی وجہ سے ان کو "شیخ کبیر بالا پیر" کہا کرتے تھے۔"
 اور مصنف خزنیۃ الاصفیاء کی شہادت یہ ہے:-

"سخاوت، شجاعت، خوارق و کرامت، وجد و ذوق اور سماع و شوق
 جیسے اوصاف بزرگانہ میں آپ بیکتا تھے۔" بوقت خود ثانی نہ اشرت۔"

آپ کی یہ کرامت عام طور سے مشہور ہے کہ ایک روز سلطان سکندر ابن
 بہلول اپنے دو وزیروں کو لے کر پانی پت پہنچا۔ اور آپ کے کمالات کشف
 آزمائے چاہے۔ طے کیا کہ ہم کھانے کی کسی ایک چیز کی نیت کر لیں۔ پھر
 دیکھیں کہ شیخ بالا پیر کو ہماری نیتوں کا پتہ چلتا ہے یا نہیں۔

یہ تینوں صاحبان حاضر خدمت ہوئے۔ اور مراسم ملاقات سے فراغت
 پائی۔ تو شیخ کے مہمان خانہ سے سلطان سکندر کی خدمت میں گرم گرم گوشت
 کے سمو سے پیش ہوئے۔ نان اور بخنی ایک وزیر میاں بدھا کے سامنے پیش
 ہوا اور دوسرے وزیر ملک محمد کے سامنے حلوا پیش کیا گیا۔ یہ تینوں حضرات
 حیرت میں پڑ گئے۔ کیونکہ یہی کھانے تھے۔ جن کی نیت کی تھی۔ اب یہ صاحبان
 حضرت شیخ کی خدمت میں معذرت کرنے لگے کہ بزرگوں کو آزمانا۔ خود ایک گستاخانہ
 حرکت ہے۔ جس کے ہم مرتکب ہوئے۔ معاف فرمائیں۔

حضرت شیخ نے نہایت خندہ پیشانی سے فرمایا:-

"بابا جائے حیرت چیست۔ خدا تعالیٰ مہبان خود را پیش اہل دنیا شرمسار

نمی کند۔" (خزنیۃ الاصفیاء، ج ۱ ص ۱۴۱)

رہا با۔ حیرت کی بات کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ دنیا داروں کے سامنے اپنے

دوستوں کو شرمندہ نہیں کرتا۔

۹۴۶ھ ہجری میں آپ نے وفات پائی اور گنبد کلاں میں دفن ہوئے۔

سیرالاقطاب میں یہ بھی ہے کہ اس کرامت سے متاثر ہو کر بادشاہ نے تو مضافات کرنال کے دو گاؤں موضع درر و سنگو صواہ پیش کئے۔ وزیر میاں بدھا نے قصبہ جھنجاہ کے قریب موضع تتانی حضرت کی خدمت میں پیش کر دیا۔ اور ملک محمد وزیر نے اپنی دختر نیک اختر خدمت کے لئے پیش کر دی۔

حضرت شیخ عبدالکبیر کے فرزند ارجمند خلیفہ راشد اور ان کے جانشین و سجادہ نشین تھے۔ صاحب

شیخ عثمان زندہ پیر

کشف و کرامات۔ اور بقول خزینۃ الاصفیاء علوم ظاہری و باطنی میں کامل و کامل ۹۹۰ھ ہجری میں وفات ہوئی۔ گنبد کلاں میں مدفون ہیں۔

روحانی کمالات کے ساتھ آپ کو معاملہ فہمی اور فراخی حوصلہ کے جوہر بھی عطا ہوئے تھے۔ آپ کے صاحبزادہ شیخ نظام الدین صاحب نے ایک کنواں تعمیر کرایا۔ اور والد صاحب سے افتتاح کی درخواست کی۔ آپ نے فرمایا:۔ افتتاح کروں گا۔ مگر شرط یہ ہے کہ تین من گہیوں کی روٹی پکواؤ۔ گائے ذبح کراؤ۔ روٹی اور گوشت کے مناسب اور کھجی سامان فراہم کرو۔ اور سب فقرا کو کھلا دو۔ اس کے بعد میں افتتاح کروں گا۔ صاحبزادہ صاحب کو یہ حوصلہ میسر نہیں آیا تھا۔ عرض کرنے لگے۔ میرے پاس تو ایک بکری ہے۔ فرمایا۔ ہرگز نہیں، جو کہہ چکا ہوں۔ وہ گویا تیرا بردہ ہے۔ ایسا نہیں کروگے تو نقصان کا خطرہ ہے۔ صاحبزادے صاحب اس خرچ کے لئے تیار نہیں ہوئے۔

کوئیں کی پوری عمارت رات ہی میں بیٹھ گئی۔

معاملہ فہمی کے سلسلہ میں دو جالوں کا قصہ ایک اچھی مثال ہے۔

ان دو لوگوں جالوں کا خاندان ایک ہی تھا مگر مذہب جدا جدا تھا۔ ایک

ہندو تھا اور ایک مسلمان۔ ان دو لوگوں کے آپس میں کوئی جھگڑا تھا۔ عرصہ

ہو گیا تھا وہ طے نہیں ہوا تھا۔ آخر کار ان دو لوگوں نے اپنا یہ مقدمہ حضرت شیخ

عثمان کی خدمت میں پیش کر دیا۔ شیخ عثمان نے واقعات کی تفصیلات معلوم

کیں۔ اور پھر ایک فیصلہ کر دیا۔ وہ فیصلہ اتفاق سے ہندو کے خلاف تھا۔

اُس نے برملا کہا یا کہ آپ نے مسلمان ہونے کی رعایت کی ہے۔ ورنہ حق میرا

تھا۔ اور فیصلہ میرے حق میں ہونا چاہئے تھا۔

یہ اعتراض حضرت شیخ کے لئے بہت تکلیف دہ تھا۔ مگر صورت حال ایسی

تھی کہ بات چیت سے مطمئن کرنا بھی مشکل تھا۔ اب آپ نے ایک ایسی صورت

تجویز کی جو خود ہندوؤں کے عقیدے کے مطابق تھی۔ آپ نے فرمایا۔ تم دو لوگوں

کے یہاں بچے ہونے والے ہیں۔ اب فیصلہ یہ ہے کہ سچے کے لڑکا ہوگا۔ اور

جھوٹے کے لڑکی۔ اب خیرا کا کرنا کہ۔ مسلمان کے لڑکا پیرا ہوا۔

اور ہندو کے لڑکی۔ یہ ایک تائید غیبی تھی۔ حق و صداقت اور انصاف پسندی

کی۔ مگر اس کا یہ اثر یہ ہوا کہ فریقین مطمئن ہو گئے۔ جھگڑا ختم ہو گیا۔

حضرت زندہ پیر اور حضرت بالاپیر کے تذکرے آپ

پڑھ چکے ہیں۔ یہ شیخ نظام الدین دین اللہ سرہ العزیز

شیخ نظام الدین

حضرت شیخ عثمان زندہ پیر کے فرزند ارجمند و خلیفہ اور حضرت شیخ عبدالکبیر بالاپیر

کے پوتے تھے۔ اس خاندانی شرف کے ساتھ ذاتی سعادت و شرافت سے بھی

بھر پور حصہ ملا تھا۔

بقول مولانا غلام سرور عظمائے مشائخ اکابر اولیاء اللہ میں سے تھے۔

"باوصاف زہد و قناعت موصوف۔ و بریاضت و عبادت معروف

بذکر مولیٰ مستغرق۔ از خلق جہاں مستغنی۔"

شیخ نظام الدین صاحب کے برادر بزرگ کا نام نامی "کمال الدین" تھا۔
آپ اسم با مسمیٰ تھے۔ یعنی:-

"بسیار اہل کمال۔ صاحب جلال و جمال بووند و جذبہ عشق الہی

از حد داشت۔" (خزینہ ج ۱ ص ۴۵۵)

والد صاحب (حضرت زندہ پیر) کی وفات کے بعد حضرت شیخ کمال الدین

ہی کو لوگوں نے خلیفہ و جانشین اور صاحب سجادہ بنا نا چاہا۔ مگر آپ نے سختی

سے منع کر دیا اور اپنے چھوٹے بھائی شیخ نظام الدین کے سر پر خود اپنے ہاتھ

سے دستار باندھ کر گدی پر بٹھا دیا۔

شیخ نظام الدین صاحب نے والد ماجد کی جانشینی اور برادر بزرگ کی

اس قدر افزائی کی بہت قدر کی۔ اور قدرت نے قدر کرنے کا موقع بھی خوب دیا۔

یعنی تقریباً سو سال تک چشمہ ارشاد و ہدایت جاری رکھا۔

۸۷۶ ہجری سال ولادت ہے عمر ایک سو سینتالیس (۱۴۷) سال

سنہ وفات ایک ہزار اٹھارہ (۱۰۱۸ھ)

حضرت شیخ نظام الدین کے فرزند ارجمند ہیں۔

شاہ علی پستی پانی پتی | ظاہری علوم کی تکمیل کے بعد باطنی کمالات

کی طرف متوجہ ہوئے اور اپنے والد ماجد سے خرقہ خلافت حاصل کیا۔

قصبہ نارنول جو اسی علاقہ میں پانی پت سے تیس تیس میل کے فاصلہ پر

ہے۔ وہاں کے مشہور بزرگ شیخ نظام کا بھی یہی زمانہ ہے۔ یہ بھی اتنے ہی

بڑے جلیل القدر اور صاحب کمال شیخ طریقت اور صاحب سلسلہ ولی اللہ ہیں۔
حضرت شیخ نظام الدین پانی پتی کے یہ تخت جگر کچھالیسے پیاسے تھے کہ صرف
والد ماجد کے چشمہ فیض اور حرۃ خلافت سے پیاس نہیں کھچی۔ آپ حضرت شیخ نظام
نارنولی کی خدمت میں بھی حاضر ہوئے۔ اور اسی طرح ان کے دریا فیض سے بھی
شادابی حاصل کرنے لگے۔

حضرت نارنولی کو بھی ایسے جوہر نایاب کی تلاش تھی۔ آپ نے اپنی شفقتوں
سے ان کو نوازا۔ اور یہاں تک نوازا کہ آپ کا نام نامی خود حضرت نارنولی کی
شفقتوں کی شہادت بن گیا۔

اصل نام | اس کی تفصیل یہ ہے کہ آپ کا اصل نام "عبدالسلام" تھا۔
حضرت نارنولی کی قردانی اور حوصلہ افزائی نے آپ کو "اعلیٰ"
کا خطاب دیا۔ نہ صرف اعلیٰ بلکہ "شاہ اعلیٰ"

یہ حضرت شیخ کی شفقتوں اور نوازشوں کی برکت ہے کہ خطاب اتنا مشہور
ہوا کہ لوگ اصل نام بھول گئے

والد ماجد بھی نظام اور شیخ طریقت بھی نظام۔ ان دونوں نظاموں کی
مناسبت سے کسی نے کہا ہے ۵

نظامش پیرو ہم پدرش نظام ست
نظام در جہاں بروے تمام ست

سال ولادت آٹھ سو نوے | سال ولادت بچپن اور ابتدائی دور |
ہجری ہے (۱۲۸۵ھ) اس

زمانہ میں لودھیوں کی حکومت تھی۔ جس کا آخری تاجدار براہیم تھا۔ جس کو بابر
نے ۹۳۳ھ (۱۵۲۶ء) میں پانی پت کے میدان میں شکست دیکر سٹھانوں

کی حکومت کا خاتمہ کیا۔

اس حرم میں نصیب بادشاہ کی قبر پانی پت میں ایک جو ترہ پر آج تک ہے۔ حضرت شاہ اعلیٰ صاحب جو اب تک شیخ عبدالسلام عثمانی تھے جس طرح قدرت نے آپ کی فطرت کو شرافت اور مکارم اخلاق کے جوہر بخشے تھے جو صلہ مندانہ شجاعت کا بھی بھرپور خزانہ آپ کو عطا ہوا تھا۔ صاحب سیرالاقطاب نے چند کرامتیں بھی ذکر کی ہیں۔ جن کے نتیجے میں آپ کو تیراندازی کا یہ کمال حاصل ہوا تھا کہ آپ کا کوئی نشانہ خطا نہیں کرتا تھا۔

بہر حال آپ کے سپاہیانہ ذوق نے اقبال مند بابر کا استقبال اس طرح کیا کہ آپ اس کی فوج میں بھرتی ہو گئے۔ "قزاقاں" جو بابر کا فوجی افسر تھا۔ وہ آپ کا کمانڈر تھا۔ بہت جلد آپ کے فوجی کمالات ظاہر ہونے لگے۔ خصوصاً قدراندازی اور نشانہ بازی نے یہاں تک شہرت حاصل کی کہ آپ بابر کی پوری فوج میں تیراندازی میں یکتا۔ اور بے نظیر سمجھے جانے لگے۔

شیخ التدریسا صاحب مصنف

سیرالاقطاب نے خود حضرت شاہ اعلیٰ

فوجی ملازمت کیوں اختیار کی؟

صاحب کا بیان نقل کیا ہے جس سے فوجی ملازمت، زمانہ ملازمت اور علیحدگی وغیرہ کے اسباب پر روشنی پڑتی ہے۔

شیخ التدریسا صاحب فرماتے ہیں:-

ایک مجلس میں حضرت پیر روشن ضمیر (شاہ اعلیٰ صاحب) نے زبان معجز نشان سے فرمایا۔ حضرت والد صاحب (شیخ نظام الدین) پوری شفقت و توجہ سے میری ظاہری اور باطنی تربیت میں مصروف تھے۔ ناگاہ مجھے زیارت کعبہ معظمہ کا شوق دامنگیر ہوا۔ والد صاحب

سے اجازت حاصل کی۔ اور سفر شروع کر دیا۔ جب دریا کے قریب پہنچا (غالباً سورت یا کھمبات مراد ہوگا۔ اس زمانہ میں یہی بندرگاہ تھے) تو معلوم ہوا کہ جہاز نہیں جا رہے۔ کیونکہ پرتگالی اور فرنگی قزاقوں نے جو اس زمانہ میں سمندر میں قزاقی کیا کرتے تھے۔ راستہ کو مخدوش کر رکھا ہے۔ مجبوراً میں وہاں سے واپس ہو کر "مالوہ" پہنچا۔ جہاں "قزاقاں" بابر کی طرف سے مامور تھے۔ میں نے اس کی ملازمت اختیار کر لی۔

قزاقاں کو مجھ پر اتنا اعتماد ہو گیا کہ جو بھی نازک صورت حال پیش آتی، اکثر ایسا ہی ہوتا تھا کہ اس میں میرے مشورے کے بغیر کوئی اقدام نہیں کیا کرتا تھا۔

ایک عرصہ دراز تک میں وہاں رہا۔ جب شیر شاہ سوری نے انقلاب برپا کر دیا۔ اور مالوہ بھی اس کے تصرف میں آ گیا۔ اس وقت میرے اصطلیل میں نوے (۹۰) گھوڑے تھے سب تاراج ہو گئے تو مجبوراً میں بھی وہاں سے روانہ ہوا۔ اور وطن کا رخ کیا۔ "مدسور" راستہ میں پڑتا تھا۔ وہاں شیخ المشائخ حضرت حمزہ کا دریا فیض جاری تھا۔ کچھ عرصہ وہاں قیام کیا۔ اور ان کے چشمہ فیض سے مستفیض ہوا۔

آپ فرماتے ہیں جب میں "مدسور" سے روانہ ہوا تو تہیدستی کا یہ عالم تھا کہ میرے پاس صرف ایک "بابری تنگہ" (اس زمانہ کا خاص سکہ) تھا۔ میں اسی حالت میں دھلی پہنچا۔

اسلحہ کا بے پناہ شوق اور تائیدی
کی عجیب غریب مثال

یہاں بازار میں جا رہا تھا کہ ایک شخص کو دیکھا کہ "سپریشیائی" درشمنی ڈھال فروخت کر رہا ہے۔ مجھے وہ بہت پسند آیا قیمت دریافت کی تو تین روپیہ اس کی قیمت تھی۔ میری جیب اب بالکل خالی ہو چکی تھی۔ تو میں نے اپنے ساتھیوں سے تین روپیہ قرض لئے اور وہ ڈھال خرید لی۔ اتفاق سے ساتھیوں کے پاس بھی کل اتنا نہ یہی تین روپے تھے۔ جو میں نے اس طرح خرچ کر ڈالے تو اب ہر ایک ساتھی بہت پریشان ہوا۔ اور مجھ کو ملامت کرنے لگا۔ میں خود نادم و شرمندہ تھا۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ میرے ساتھیوں کی کل پونجی یہی ہے۔ بہر حال میں اسی ندامت اور پریشانی میں تھا۔ اور سر جھکائے اس سپر پرانگلی چلار ہا تھا کہ ڈھال کے درشمنی غلاف کا ایک کنارہ اکھڑ گیا۔ اب جو نظر پڑی تو اس کنارہ کے نیچے سونے کا حلقہ نظر آیا۔ اب میں نے پورا غلاف اُدھیر دیا۔ تو۔

"حلقہ طلا ہیشما و توجہ برآمد"

(اٹھارہ تولے سونے کا پترا ڈھال پر چڑھا ہوا نکلا)

اس تباہی غیبی نے میری پریشانی اور پریشانی رفع کی۔ میں نے فوراً یہ حلقہ الگ کیا۔ اور بازار میں فروخت کر کے دوستوں کا قرض بھی ادا کیا۔ پھر سب کو برابر تقسیم کر دیا۔

اب خدا کے فضل سے میرے پاس سامان سفر فراہم ہو گیا۔ میں دہلی سے روانہ ہو کر پانی پت پہنچا۔ اور والد صاحب قبلہ کی قدمبوسی سے مشرف ہوا۔

حضرت شاہ اعلیٰ صاحب فرماتے
دوبارہ تلاش ملازمت اور ناکامی | ہیں کہ اس کے بعد میں نے چند

مرتبہ ملازمت کی کوشش کی۔ اور اسی جستجو میں کہ کوئی مناسب جگہ مل جائے میں نے چند مرتبہ ملتان۔ لاہور۔ گجرات اور جوینپور وغیرہ کا سفر کیا۔ مگر جو

صورت میں چاہتا تھا۔ وہ کہیں بھی میسر نہیں آئی۔ اور اس کا سبب یہ تھا۔ کہ۔
 "والد بزرگوار مجھے سفر کی اجازت تو دیدیا کرتے تھے۔ مگر جب سفر کے
 لئے رخصت ہوتا تو یہ بھی فرمایا کرتے تھے۔"

"عبدالسلام تمہیں خدانے دوسرے کام کے لئے پیدا کیا ہے۔
 تم کہاں دنیا کے پیچھے سرگردان پھرتے ہو۔"

حضرت شاہ اعلیٰ صاحب نے اسی سلسلہ
 گفتگو میں فرمایا کہ جب چند مرتبہ جدوجہد
 کے باوجود ناکامی ہوئی تو:-

"دلم از مطالبات دنیاوی سردگشت۔ وزمام اختیار بکوچہ عشق کشید
 از ہمہ تعلقات ترک گرفتہ انچہ در بلاک بود بفقرا قسمت کردم و
 بطریق قلندرانہ روانہ شدم۔"

رطلب دنیا کے جذبات سرد پڑ گئے۔ کوچہ عشق کی جانب زمام اختیار
 کی کشش ہونے لگی۔ تمام تعلقات سے کنارہ کش ہو گیا۔ اپنی پوری
 ملکیت فقرا کو تقسیم کر دی اور قلندرانہ انداز میں نکل کھڑا ہوا۔"

اس زمانہ میں شاہان مشرق
 کا اقبال عروج پر تھا۔ جو نپور
 اور اکابر علماء مشائخ سے ملاقات

تھا۔ علماء اور مشائخ کا بھی وہاں کافی اجتماع رہتا تھا۔ حضرت شاہ اعلیٰ
 صاحب فرماتے ہیں کہ میں نے سیاحت اختیار کی تو پہلے جو نپور پہنچا۔ وہاں
 شیخ بہاؤ الدین۔ میر سید علی قوام شیخ شمس الدین سادجی جیسے بزرگوں کی
 خدمت میں حاضر رہا۔ کوڑہ جہاں آباد میں مولانا علی احمد اور شیخ عبدالصمد صاحب

انبیہی میں شیخ الاسلام شیخ نظام۔ گجرات میں قاضی محمود۔ جیسے اکابر سے ملاقات ہوئی۔ مگر چونکہ میرا حصہ کسی اور جگہ مقدر تھا۔ اس لئے کسی بارگاہ میں بھی دلجمعی نصیب نہ ہوئی۔

بہار | حضرت شاہ اعلیٰ صاحب فرماتے ہیں کہ میں بہار پہنچا۔ وہاں شیخ علی مغربی اور مولانا حسام الدین بغدادی۔ شیخ صلاح۔ اور شیوخا وغیرہ سے نیاز حاصل ہوا۔ آپ فرماتے ہیں۔ بہار میں اور عجیب واقعہ بھی پیش آیا جس کی تفصیل یہ ہے۔ کہ جب میں بہار پہنچا۔ وہاں ایک جگہ قیام کیا۔ تو ایک عالم سے ملاقات ہوئی جن کا نام عبدالواحد تھا۔ یہ حضرت مخدوم۔ کبیر الاولیاء کے خلیفہ حضرت سید موسیٰ بہاری کے پوتے تھے۔ مولانا عبدالواحد صاحب نے میرے حالات معلوم کئے۔ اور جب ان کو معلوم ہوا کہ میرا خاندانی تعلق حضرت مخدوم کبیر الاولیاء رحمہم اللہ سے ہے تو انہوں نے خاطر مدارات میں کوئی دقیقہ باقی نہیں رکھا۔ مگر اس زمانہ میں خود مجھ پر ایک مجذوبانہ کیفیت طاری تھی۔ نماز بھی جماعت وغیرہ کی پابندی کے ساتھ نہیں پڑھتی تھی۔ مولانا عبدالواحد صاحب نے جب میری یہ حالت دیکھی تو اول تو سمجھایا۔ اور جب دیکھا کہ ان کی فہمائش کارگر نہیں ہوتی تو جتنے وہ مہربان تھے اتنے ہی اب مخالف ہو گئے۔ اور ایسی تشریح اور تلخی اختیار کی کہ مجھ کو وہ جگہ چھوڑنی پڑی۔ شہر سے باہر ایک ویران مسجد تھی۔ میں اسی مسجد میں جا پڑا۔ ایک ہی رات گذری تھی کہ اگلے روز میں نے دیکھا کہ سید عبدالواحد دو آدمیوں پر سہارا دیئے ہوئے گھسٹے چلے آ رہے ہیں۔ زبان پر تو یہ اور استغفار ہے۔ جب وہ قریب پہنچے تو ایک دم میرے پیروں میں گر گئے اور حد درجہ اصرار کرنے لگو کہ میں وہیں چلوں جہاں پہلے مقیم تھا۔

ایک عالم، خاندان سے سید۔ اور ایسے سن رسیدہ ضعیف کہ دو آدمیوں کے سہارے یہاں تک پہنچے۔ جب انھوں نے اس طرح لجاجت اور عاجزی کا مظاہرہ کیا۔ تو میں نے ان کے آداب کا پورا احترام کرتے ہوئے اس اصرار کا سبب دریافت کیا۔ تو فرمانے لگے رات میں نے اپنے دادا حضرت سید موسیٰ صاحب کو خواب میں دیکھا کہ غصہ میں بھرے ہوئے ہیں اور بہت تلخی سے فرما رہے ہیں۔ "عبدالواحد تم نے میرے پیر زاوہ کو رنجیدہ کیا۔ خدا تمہیں رنجیدہ کرے۔" جب آنکھ کھلی تو دیکھا کہ میرے ہاتھ پاؤں "شل" ہیں۔ میں حرکت بھی نہیں کر سکتا۔ ویرنگی ہی حالت رہی۔ آخر مشکل کچھ حرکت ہو سکی۔ تو بہزار دشواری دو آدمیوں پر سہارا دیکر آپ کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں۔ اللہ میرا قصور معاف کیجئے اور اپنی قیام گاہ پر تشریف لے چلئے۔

حضرت شاہ اعلیٰ صاحب فرماتے ہیں کہ مولانا عبدالواحد کی اس عاجزانہ معذرت کے بعد میرے لئے اس کے سوا چارہ نہیں تھا کہ میں واپس آؤں جب میں اس پُرانی قیام گاہ پر واپس پہنچ گیا تو خدا کے فضل سے سید عبدالواحد صاحب بھی اس آزار سے شفا یاب ہو گئے۔

یہ واقعات ایسا نہیں تھا جو چھپا رہتا۔ روئی کے گالے کی طرح اس کی شہرت پھیل گئی۔ سیری زیارت کو لوگ آنے لگے اور میرے گرد لوگوں کا ہجوم رہنے لگا۔ یہ خود میرے لئے ایک آزار تھا۔ مجھے لوگوں سے وحشت اور لوگ دست بوسی اور قدم بوسی کے لئے ہر وقت حاضر۔ چند روز اس طرح گذرے۔ آخر یہ ہجوم برداشت نہ ہو سکا۔ اور میں خفیہ طور سے شہر سے نکل کر آگرہ کی طرف روانہ ہو گیا۔ کچھ آگرہ قیام کر کے والد صاحب کی خدمت میں پانی پیت حاضر ہوا۔ اور ان کے نقش قدم پر زندگی گزارنے کی کوشش شروع کر دی۔

چلہ کشی | حضرت شاہ اعلیٰ صاحب (جو ابھی تک شیخ عبدالسلام ہی تھے۔
 خطاب اعلیٰ سے سرفراز نہیں ہوئے تھے) جب باقاعدہ حلقہ
 ارادت میں داخل ہو گئے تو والد بزرگوار نے جو اب پیر و مرشد بھی ہو گئے تھے۔
 "چلہ" کی ہدایت فرمائی۔ اور حضرت شیخ شمس الدین ترک رحمۃ اللہ علیہ کے مزار
 کے قریب ایک کوٹھری چلہ کے لئے طے فرمادی۔

چلہ کیا ہے؟ | چلہ: مشائخ طریقت کے یہاں ریاضت و مجاہدہ کا ایک
 چالیس روزہ سلسلہ ہوتا ہے۔ جو مادی دلچسپیوں اور
 دنیاوی تعلقات ختم کرنے کے لئے سنا رکھی گئی رکھٹی کا کام کرتا ہے۔

حضرت شیخ نظام الدین نارنولی
سے رابطہ اور تعلق | آپ اب تک اپنے والد ماجد شیخ
 نظام الدین پانی پتی سے بیعت تھے
 مگر چلہ کے دوران میں آپ نے عجیب

تماشہ دیکھا۔ وہی حجرہ جو چلہ گاہ تھا۔ جس کے دروازے سب طرف سے
 بند رہتے تھے۔ آپ نے دیکھا کہ حضرت شیخ نظام الدین نارنولی وہاں رولوں فروز
 ہیں۔ اور فرما رہے ہیں۔ کہ "آپ کا حصہ باطنی ہمارے یہاں ہے۔ آپ نارنول
 آئیے اور اپنا حصہ لے لیجئے۔"

اس کا اثر یہ ہوا کہ جیسے ہی چلہ سے فراغت ہوئی۔ آپ (بقول مولانا

غلام سرور صاحب)

"مستانہ و بے ہوشانہ نارنول پہنچے۔ اور حضرت نارنولی سے

ارادت و بیعت کی سعادت حاصل کی خرقہ خلافت حاصل کیا۔

اور نہ صرف خرقہ خلافت حاصل کیا۔ بلکہ بارگاہ نارنول میں

یہاں تک مقبولیت اور محبوبیت حاصل کی۔ کہ بجائے شیخ

عبدالسلام کے حضرت مرشد نے آپ کو "شاہ اعلیٰ" کے خطاب کے نوازا۔
 سیرالاقطاب میں خود آپ کا بیان نقل کیا گیا ہے۔ آپ نے فرمایا:-
 "میں ابھی نارنول میں داخل بھی نہیں ہوا تھا کہ حضرت شیخ نارنولی کا
 ایک خادم میرے سامنے آیا۔ اور اُس نے حضرت شیخ کا عمامہ اور
 آپ کے نعلین مجھے عطا فرمائے۔ پھر کبھی خانقاہ میں نہیں پہنچا
 تھا کہ ایک دوسرا خادم سامنے آیا۔ اور اُس نے ایک کاغذ مجھے
 عنایت کیا۔ اس میں ایک "اسم" تحریر تھا۔ اور ہدایت تھی کہ
 اس کی مداومت کرو۔ اور جب تک آپ کا دل اعلیٰ نہ ہو جائے
 ہمارے پاس آنے کی ضرورت نہیں ہے۔

حضرت شاہ اعلیٰ صاحب فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت شیخ کے
 ارشاد کے بموجب سات روز تک کفش دوزوں کی مسجد میں تیام
 کر کے اس وظیفہ کی پوری طرح پابندی کی۔ یہاں تک کہ صفائی
 قلب حاصل ہوئی۔ اس کے بعد حضرت مرشد کی اجازت ہوئی۔
 میں بارگاہ میں حاضر ہوا۔ تو فرمایا: "الحمد للہ اعلیٰ شہدی" (خدا کا
 شکر ہے تم اعلیٰ ہو گئے) پھر اتنی عنایتیں اور شفقتیں فرمائیں۔ کہ
 احاطہ تحریر سے باہر ہیں۔

اس کے بعد ایک سال پانچ ماہ سترہ روز (یعنی سترہ ماہ
 سترہ روز) خدمت گرامی میں حاضر رہا۔ یہ پوری مدت چلہ کشی اور
 ریاضت و مجاہدہ میں گزری۔ یہاں تک کہ ایک روز مجھے خبرہ خالص
 میں طلب فرما کر ارشاد فرمایا۔ کہ بابا۔! مشائخ طریقت کے
 "چودہ خالوادوں" (یعنی مشائخ طریقت کے چودہ سلسلے جن سے

ہندوستان میں فیض جاری ہے۔ چودہ خانوادے کہلاتے ہیں، جو کچھ مجھے ملا ہے۔ وہ سب تم کو بخش رہا ہوں۔ اور تمہیں اجازت دے رہا ہوں کہ وطن جاؤ۔ اور خلقِ خدا کی خدمت میں مصروف ہو جاؤ۔ پھر فرمایا:۔ آج تیسرا روز ہے کہ آپ کے دادا حضرت مخدوم جلال الدین کبیر الاولیاء رحمۃ اللہ علیہ برابر خواب میں مجھے تاکید فرما رہے ہیں کہ میرے پوتے کو جلد پانی پت بھج دو۔ کہ وہاں میری گدی خالی پڑی ہے۔

حضرت شاہ اعلیٰ صاحب فرماتے ہیں کہ مجھے اس سے حیرت بھی ہوئی کہ "گدی خالی" کیوں ہے؟ جب کہ حضرت والد صاحب وہاں موجود ہیں۔ بہر حال میں حضرت شیخ کی ہدایت کے بموجب نارنول سے رخصت ہوا جب آگرہ پہنچا تو معلوم ہوا کہ حضرت والد صاحب کی وفات ہو چکی ہے۔ دنیا مجھے تاریک نظر آنے لگی۔ میں نے آگرہ کا قیام مختصر کیا۔ اور جس قدر جلد ممکن ہو سکا پانی پت پہنچا۔ اور اپنے بزرگوں کی امانت کی حفاظت اور خانقاہ کی خدمت میں مصروف ہو گیا۔

حضرت شاہ اعلیٰ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے مذکورہ بالا قیاسات | بیان سے جس کو "اپنی کہانی اپنی زبان" کہنا چاہیے۔ اندازہ ہوتا ہے کہ :-

۱۔ تقریباً ۳۴ سال کی عمر میں آپ نے فوجی ملازمت اختیار کی کیونکہ آپ کا سنہ ولادت ۱۸۹۰ء اور باہر نے وہلی کو ۱۸۶۶ء ہجری (۱۸۲۶ء) میں فتح کیا۔ اسی سال اگر آپ نے

حج بیت اللہ کا ارادہ کیا پھر سورت سے مراجعت کرتے ہوئے
قزاخاں کی ملازمت اختیار کی تو اس وقت آپ کی عمر تینتالیس
سال تھی۔)

۲۔ ۹۲۴ھ (۱۵۱۲ء) میں شیرشاہ نے ہمایوں کو شکست دے کر
اپنی حکومت قائم کی۔ اسی شورش میں آپ اپنے منصب سے
علیحدہ ہوئے اور دہلی پہنچے۔ پھر پانی پت تشریف لے گئے
یعنی تقریباً ۱۴ سال آپ فوج میں رہے۔

۳۔ والد صاحب یعنی شیخ نظام الدین صاحب کی وفات ۱۰۱۵ھ میں
ہوئی اس سے چند سال پہلے آپ سیاحت اور قلندرانہ زندگی
سے نجات پا کر والد صاحب سے بیعت ہوئے اور چلے گئے۔
اکبر بادشاہ کی وفات ۱۰۱۴ھ (۱۶۰۵ء) میں ہوئی تھی۔
گویا اکبر کی وفات، جہانگیر کی تخت نشینی اور پانی پت میں سیاحت
بہار وغیرہ سے واپسی کا زمانہ تقریباً ایک ہی ہے۔

۴۔ اللہ تعالیٰ نے ان بزرگوں کی عمروں میں عجیب برکت عطا فرمائی
تھی۔ ۹۱۰ھ (۱۵۰۳ء) سے لیکر ۱۰۱۴ھ (۱۶۰۶ء) سال مراجعت
پانی پت تک ایک سو چوبیس (۱۲۴) سال کی عمر ہو چکی ہے۔
پھر بھی آپ نے تقریباً بیس سال خانقاہ معلیٰ کی خدمت
کی۔ اور امانت بزرگانِ حشمت کی حفاظت کے فرض کو انجام
دیتے ہوئے ۱۰۳۳ھ میں واصلِ بحق ہوئے۔ (رحمۃ اللہ)

عجیب و غریب انکشاف

حضرت شیخ عبدالقدوس گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ اسی سلسلہ کے صاحب سلسلہ مرشد طریقت ہیں۔ فرق یہ ہے کہ آپ حضرت مخدوم کبیر الاولیاء کے خلیفہ حضرت احمد عبدالحق رودلوی رحمۃ اللہ علیہ سے فیضیاب ہوئے ہیں اور حضرت شاہ اعلیٰ صاحب حضرت مخدوم کبیر الاولیاء کے فرزند و خلیفہ حضرت خواجہ شبلی صاحب کے سلسلہ میں ہیں۔ آپ کا سلسلہ نسب اور سلسلہ خلافت یہ ہے۔

شاہ اعلیٰ فرزند و خلیفہ حضرت شیخ نظام الدین، فرزند و خلیفہ حضرت شیخ عثمان زندہ پیر، فرزند و خلیفہ حضرت شیخ عبدالکبیر اولیاء، فرزند و خلیفہ حضرت خواجہ عبدالقدوس، فرزند و خلیفہ حضرت خواجہ شبلی، فرزند و خلیفہ حضرت مخدوم کبیر الاولیاء رحمۃ اللہ علیہ۔

بہر حال یہ دونوں بزرگ اگرچہ حضرت مخدوم کبیر الاولیاء ہی کے سلسلہ میں ایک ہی سرشیمہ سے سیراب ہونے والے ہیں۔ مگر ابراہیم لودھی پر باہر نے حملہ کیا تو سیاسی مذاق میں یہ فرق تھا کہ حضرت شاہ عبدالقدوس صاحب کا رجحان ابراہیم لودھی پھر شیر شاہ سوری کی طرف رہا۔

چنانچہ باہر کی فوج نے اُن کو اہتدار میں گرفتار بھی کر لیا تھا لیکن حضرت شاہ اعلیٰ کا رجحان اس کے برعکس مغلوں کی طرف تھا۔ چنانچہ آپ منحدوں کی فوج میں تقریباً چودہ سال تک ایک منصب پر فائز رہے اور شیر شاہ کی فوج نے آپ کا سامان لوٹا۔

حضرت شاہ اعلیٰ صاحب رحمۃ اللہ علیہ

نے سپاہیانہ زندگی کے بعد دنیا سے

قطع تعلق کیا تو اس کی بھی شان عجیب

مجاہدہ کی نوعیت اور
توکل علی اللہ کی نادر مثال

تھی۔ مثلاً:۔ آپ نے طے کر لیا کہ اسباب سے قطع نظر محض توکل پر زندگی بسر کریں گے۔ حضرت شیخ محمد سودو دلار کے مقبرہ کے قریب ایک شکستہ حجرہ یا ایک غارتھا۔ وہاں آپ مقیم تھے۔ اتفاق سے کوئی چیز بیسر نہیں آئی۔ اور پانچ دن اسی طرح گذر گئے کہ ایک دن آپ کے دہن مبارک میں نہیں پہنچا۔ متواتر فاقہ سے نشست و برخاست مشکل ہو گئی۔ آنکھوں کے سامنے اندھیرا ہونے لگا۔ مگر آپ کے توکل و اعتماد علی اللہ میں کوئی فرق نہیں آیا۔

آپ اسی حجرہ میں تھے کہ باہر سے آواز آئی۔ کوئی آپ کو پکار رہا ہے آپ باہر تشریف لائے تو دیکھا کہ ایک نورانی صورت بزرگ سپید لباس پہنے ہوئے تشریف فرما ہیں۔ ایک نان ان کے ہاتھ میں ہے۔ یہ صاحب آگے بڑھے۔ نان کے ٹکڑے کئے اور خود اپنے ہاتھ سے دو ٹکڑے حضرت شاہ اعلیٰ کو تناول کرائے۔ نان ختم ہو گیا تو وہ صاحب روانہ ہوئے حضرت شاہ اعلیٰ صاحب ان کے پیچھے چلے کہ معلوم کریں کون صاحب ہیں؟ کہاں سے آئے ہیں مگر وہ بہت جلد آنکھوں سے اوجھل ہو گئے۔

حضرت شاہ اعلیٰ کو افسوس ہوا کہ ایسے باکمال بزرگ سے کچھ باتیں دریافت کرنا۔ رات آئی سو نے کا وقت ہو گیا۔ مگر آپ کو ایک ہی افسوس تھا۔ آنکھوں کی تو خواب میں دیکھا کہ وہی صاحب رونق افروز ہیں۔ آپ کی گویا تمنا پوری ہو گئی۔ آپ نے فوراً اپنے سوالات پیش کئے۔ اور اس مرشد روحانی کے جوابات سے مستفیض ہوئے۔

شیخ الشہداء صاحب تحریر فرماتے ہیں کہ حضرت
شاہ اعلیٰ صاحب کے دو فرزند تھے۔ شاہ نور اور

صبر ضبط اور تسلیم و رضا

شاہ منصور۔ یہ دونوں صاحب عیال تھے۔ دونوں کی وفات حضرت شاہ اعلیٰ صاحب
کی زندگی میں ہو گئی۔ پھر ان کے کئی لڑکے تھے۔ وہ بھی سب حضرت شاہ اعلیٰ صاحب
کے سامنے ہی داغِ مفارقت دے گئے۔ صرف ایک پوتا باقی رہ گیا حضرت شاہ محمد۔
جن کی عمر ان کے والد کی وفات کے وقت صرف چھ ماہ تھی۔ اور والدہ اس سے بھی
پہلے رخصت ہو چکی تھیں۔ اس کی پرورش حضرت ہی نے کی۔ اور آخر میں ان
ہی کو خلیفہ اور صاحب سجادہ نشین بنا دیا۔ مگر حضرت شاہ العالمین کے صبر و
ضبط کی حالت یہ تھی کہ کسی کی وفات پر بھی قابو سے باہر نہیں ہوئے میت کا
تمام کام خود اپنے ہاتھ سے کرتے۔ دوسروں کو صبر دلاتے رہتے۔ اور جب دفن
کر کے واپس ہوتے تو کھانا منگواتے اور سب آدمی جو وہاں موجود ہوتے ان
کے ساتھ کھانا کھاتے تھے۔

چند کرامتیں | ایسا صاحب بردشا کر اور ایسا قناعت پسند اور متوکل۔ اگر اس
سے کرامتیں ظاہر ہوں تو تعجب نہیں ہونا چاہیے۔ حدیث

شریف میں ہے کہ جو اللہ کا ہو جاتا ہے اللہ اس کا ہو جاتا ہے۔ اب جو کام
وہ کرتا ہے۔ قدرتِ خدا کے خصوصی کرشمے اس کے ساتھ ہوتے ہیں۔ چنانچہ آپ
کے ایک ارادت مند جن کا نام صاحب سیرالاقطاب نے "مولانا طاہری"
لکھا ہے یہ مولانا طاہری فرماتے ہیں:-

۱۔ ایک شب کو حضرت شاہ العالمین (شاہ اعلیٰ صاحب) نے فرمایا
کہ صبح کو باگہوتی پہنچ کر حضرت قلندر صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے
مزار پر فاتحہ پڑھیں گے۔ اور غریبوں کو کھانا کھلائیں گے۔ پھر

مجھے ہدایت فرمادی کہ نماز صبح یہاں آکر پڑھو۔ یہ میری سعادت تھی کہ حضرت نے مجھے ہمراہ رہنے کا حکم فرمایا۔ میں نے بخوشی منظور کر لیا۔ چنانچہ میں تہجد کے وقت اٹھا۔ اپنے معمولات پورے کئے اور ابھی ایک پہرات باقی تھی کہ بادل گھرا آیا۔ اور بوند باندی ہونے لگی۔ میں نے سوچا کہ ایسی صورت میں کہاں جانا ہوگا۔ اور یہ سوچ کر میں نے حضرت شاہ صاحب کی مسجد کے بجائے اپنی ہی مسجد میں نماز پڑھی اور مکان پر آ گیا۔ فوراً ہی کسی نے دروازہ پر دستک دی۔ میں باہر نکلا تو دیکھا کہ حضرت شاہ العالمین کے پوتے میاں شاہ محمد شریف فرما ہیں اور فرما رہے ہیں۔ کہ حضرت شاہ صاحب آپ کے منتظر ہیں۔ میں نے فوراً گھوڑا کسا۔ اور صاحبزادہ صاحب کو گھوڑے پر سوار کیا اور خود در دولت تک پیدل پہنچا۔

حضرت کی نظر جیسے ہی مجھ پر پڑی۔ فرمایا بہت اچھا ہوا۔ آپ آگئے۔ اب ہاگہوتی چلئے۔ میں نے عرض کیا۔ ترس ہو رہا ہے ایسی صورت میں کیا جانا ہوگا۔ ہاگہوتی میں کوئی سایہ کا انتظام بھی نہیں ہے۔ آج رہنے دیکئے۔ کل چلیں گے۔ فرمایا۔ نہیں جوٹے ہو چکا ہے اس کو بدلنا نہیں۔ اور آپ خاطر جمع رکھئے۔ بارش سے آپ کو کوئی زحمت نہ ہوگی۔ اتنی دیر میں بادل اور گھرا آیا۔ بجلی کڑکی اور بارش زور سے ہونے لگی۔ مگر حضرت اپنے ارادہ پر قائم رہے۔ اور سامان فراہم کر کے روانہ ہو گئے۔ کچھ اور مرید و معتقد بھی جو وہاں موجود تھے ساتھ چل دیئے۔ ہم پانی پت سے کئی میل ہاگہوتی گئے۔ وہاں فاتحہ پڑھا۔ نان اور

یختی جو بہت زیادہ تھی وہ تقسیم کی۔ پھر واپس آئے۔

اب کرامت یہ ہے کہ اس اثنا میں بارش برابر ہوتی رہی مگر ہم سب محفوظ رہے۔ گویا ہم ساہبان کے نیچے ہیں۔ اس پاس بارش برس رہی تھی۔ اور ہم تک بارش تو کیا، بارش کی بوچھاڑ بھی نہیں پہونچ رہی تھی۔ حضرت نے جو فرمادیا تھا کہ خاطر جمع رکھو بارش سے تمہیں کوئی زحمت نہ ہوگی۔ یہ ارشاد اس طرح پورا ہوا کہ ہم جیسے سوکھے روانہ ہوئے تھے۔ ایسے ہی واپس آگئے۔

۲۔ قوت کشف بھی یہاں تک بڑھی ہوئی تھی کہ بسا اوقات لوگوں کے ارادوں کا آپ کو کشف ہو جاتا تھا۔ چنانچہ ایک مرتبہ سو فی بیت سے چند صاحبان آئے۔ راستہ میں گفتگو شروع ہوئی کہ ہم پہونچنے تو حضرت ہماری خاطر کس چیز سے کریں گے۔ کسی نے کہا۔ جلوہ پیش فرمائیں گے۔ کسی نے کہا۔ نان اور مرغ بریاں۔ ایک نے کہا۔ خر بوزہ عنایت فرمائیں گے۔ چنانچہ جب ہم حاضر خدمت ہوئے تو ہر ایک کو وہی عنایت فرمایا جس کا خیال اس نے ظاہر کیا تھا۔ یہاں تک کہ خر بوزہ کے خواہش مند کو خر بوزہ پیش فرمایا۔ حالانکہ موسم نہیں تھا۔

شیخ التددیا صاحب فرماتے ہیں کہ اس کا تجربہ تو خود مجھے بارہا ہوا ہے کہ جس کھانے کا مجھے خیال آیا حضرت شاہ صاحب کے یہاں پہونچا تو وہی سامنے آگیا۔

نوجوانی کے زمانہ کی بات ہے کہ حضرت کے یہاں جاتے ہوئے مجھے خیال آیا کہ اگر حضرت والا۔ مجھے "الوس خاصگی" یعنی اپنا

پس خوردہ عنایت فرماویں تو میری بہت بڑی سعادت اور خوش نصیبی ہو۔ میں دولت کدہ پر پہنچا تو دیکھا کہ دسترخوان بچھا ہوا ہے اور حضرت کھانا تناول فرما رہے ہیں۔ جیسے ہی مجھے دیکھا بڑے اصرار سے بلایا۔ میں نے بہت کچھ معذرت کی۔ مگر شنوائی نہیں ہوئی۔ زبردستی مجھے اپنے پاس بٹھالیا۔ مجھے ندامت ہو رہی تھی۔ اور میں ہرگز نہیں چاہتا تھا کہ حضرت کی برابر بیٹھوں۔ مگر الامرفوق الادب۔ مجھے ارشاد گرامی کی تعمیل کرنی پڑی۔ اور برابر میں بیٹھ گیا۔ حضرت نے فرمایا۔ یہ سب کھانا الوس ہے۔ کھاؤ اور پیٹ پھر کر کھاؤ۔ چنانچہ میں نے خوب سیر ہو کر کھانا کھایا۔

۳۔ شیخ الشہداء صاحب مصنف سیرالاقطاب اگرچہ حضرت مخدوم کبیر الاولیاء کے بڑے فرزند حضرت خواجہ عبدالقادر صاحب کی اولاد میں سے ہیں۔ مگر آپ کے کسی بزرگ نے کیرانہ کی سکونت اختیار کر لی تھی (جو ریل کے راستہ سے تو آج کل بہت دور ہو گیا ہے یعنی پانی پت سے وہی تقریباً ۵۲ میل پر وہی سے کیرانہ تقریباً ساٹھ میل۔ مگر پیدل کے راستہ اب بھی تقریباً ۱۲ میل ہے۔) دریا کے جمنابج میں ہے۔ اس کے ایک جانب کیرانہ ہے دوسری طرف پانی پت) بہر حال حضرت شیخ الشہداء صاحب فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ حضرت شاہ اعلیٰ عابد کیرانہ تشریف لائے۔ کچھ دنوں پہلے شاہی دربار سے میرے عم محترم مقرب خان صاحب پٹنہ کے صوبہ دار مقرر فرمائے گئے تھے۔ عم محترم پٹنہ کے لئے پورے حشم و خدم کے ساتھ روانہ ہوئے تو میرے بڑے بھائی

مولانا شیخ قاسم صاحب جن کو خدانے اس درجہ کا عالم و فاضل بنایا ہے کہ علم و ہنرمندی میں اپنی نظیر نہیں رکھتے۔ یہ بھی اپنے جملہ متعلقین کے ساتھ چچا صاحب کے ہمراہ روانہ ہو گئے تھے۔ اور یہ پورا قافلہ کشتیوں پر روانہ ہوا۔

الغرض۔ حضرت شاہ العالمین جب کیرانہ رونق افروز ہوئے تو قصبہ کے تمام آدمی خصوصاً خاندان کے جملہ افراد ملاقات کے لئے حاضر ہوئے۔ میرے والد صاحب بھی تشریف لائے۔ حضرت شاہ العالمین نے والد صاحب کو دیکھا تو مجھ کو اور والد صاحب کو مخاطب کر کے فرمایا: "چند روز بعد بہت وحشتناک خبر پہنچنے والی ہے۔ مگر آپ پریشان نہ ہوں۔ اللہ کے بھروسہ پر صبر و سکون سے رہیں۔ اللہ تعالیٰ فضل فرمائیں گے۔"

حضرت کا یہ ارشاد خود وحشت انگیز تھا۔ مگر صبر و ضبط کی ہدایت تھی۔ اس لئے ہم نے گھبراہٹ تو ظاہر نہیں کی مگر خبر کا انتظار ضرور ہو گیا۔ پھر حضرت نے خود ہی خبر سنی دیدی کہ جس کشتی پر شیخ قاسم صاحب سوار تھے وہ بجنور میں پھنس کر ڈوب گئی۔ اس پر سوار تمام مسافر غرق ہو گئے۔ مگر خدا کے فضل سے شیخ قاسم ان کی خوشدامن صاحبہ اور سب اہل و عیال جو اس کشتی پر تھے محفوظ رہ گئے۔ حضرت نے یہ بھی فرمایا کہ میں یہی خبر دینے آیا تھا۔

حضرت نے اس روز قیام فرمایا۔ اگلے دن آپ واپس تشریف لے گئے۔ چند روز بعد قاصد آیا۔ تو واقعہ بالکل وہی تھا

جس کی خبر حضرت چند روز پہلے پانی پت سے تشریف لاکر ہمیں
سنا چکے تھے۔

۴۔ ایک حلوائی جو آپ کا مرید تھا۔ اس نے کچھ اشرفیاں ایک ٹھلیا
میں بھر کر اپنے مکان میں چوٹھے کے قریب گاڑ دی تھیں۔ اتفاق
سے اُس کو ضرورت پیش آئی۔ اُس نے زمین کھودی تو وہ ٹھلیا
غائب تھی۔ وہ حضرت پیر روشن ضمیر شاہ اعلیٰ صاحب کی خدمت
میں حاضر ہوا۔ اور سارا ماجرا عرض کیا۔ آپ نے فرمایا۔ جاؤ اور
تلاش کرو۔ اس نے واپس آکر گھر کا کونہ کونہ کھود ڈالا۔ مگر وہ
ٹھلیا کہیں نہیں ملی۔ پھر آپ کی خدمت میں آیا۔ بہت پریشانی
ظاہر کی۔ اور حضرت سے توجہ خصوصی کی استدعا کی۔ حضرت
شاہ العالمین نے فرمایا۔ چلو مجھے بتاؤ تم نے یہ اشرفیاں کہاں
گاڑی تھیں۔ حلوائی آپ کو اپنے مکان کی طرف لے گیا۔ ابھی
مکان تک نہیں پہنچے تھے کہ آپ نے حلوائی سے کہا کدال
لاؤ۔ حلوائی دوڑ کر کدال لایا۔ آپ نے راستہ کے بیچ میں کدال
سے کچھ زمین کھودی۔ پھر حلوائی سے کہا کہ تم زمین کھو دو۔ تمہاری
اشرفیاں یہاں ہیں۔ حلوائی نے زمین کھودنی شروع کی۔
تھوڑی دیر میں ٹھلیا کا کنارہ نظر آیا۔ پھر وہی ٹھلیا اسی طرح
موخ بند وہاں سے برآمد ہو گئی۔ سب کو حیرت ہوئی کہ ٹھلیا
کہاں گاڑی تھی۔ کہاں سے برآمد ہوئی۔ اور حضرت کو اس کا علم
کس طرح ہوا۔ یہ ایک بزرگانہ کشف تھا۔ جس کو العام خداوندی
کہنا چاہیے۔

۵۔ خانقاہِ معلیٰ میں خود حضرت شاہِ اعلیٰ صاحبِ رحمۃ اللہ علیہ نے ایک کنواں کھدوایا۔ جب پانی نکلا تو کھاری تھا۔ بہر حال کنواں تیار ہو گیا۔ مگر پانی کھاری ہی رہا۔ کچھ دنوں بعد کوئی صاحبِ دہلی سے واپس ہوئے اور چند کیک پیش کئے۔ جو حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی رحمۃ اللہ علیہ کی خانقاہ سے بطور تبرک لے گئے تھے۔ حضرت شاہِ اعلیٰ صاحب نے وہ "کیک" اس شخص سے لئے اور ان کے ٹکڑے کر کے ان پر کچھ پڑھا۔ اور یہ ٹکڑے کنوئیں میں ڈال دیئے اور فرمایا۔ اس تبرک کی برکت سے کنوئیں کا پانی میٹھا ہو جائے گا۔ ارادتمندوں نے فوراً ہی پانی نکال کر پیا تو واقعی شوریت ختم ہو گئی تھی۔ اور پانی میٹھا ہو گیا تھا۔ اب اس کنوئیں کا پانی خدا کے فضل سے نہایت شیرین ہے۔

حضرت شاہِ اعلیٰ رحمۃ اللہ علیہ نے عظیم الشان خصوصیات

وفات | کے ساتھ حیاتِ عزیز کے ایک سو تینتالیس (۱۴۳) سال پورے کئے۔ اور ۵ ربیع الاول ۱۰۳۳ھ سہری (۱۶۲۳ء) چہار شنبہ کے روز اس جہان سے رخصت ہو گئے۔

حضرت شاہِ اعلیٰ رحمۃ اللہ علیہ نے خود ایک قبرستان

مزار مبارک | شہر سے باہر سید علی غنیؒ کے مزار کے قریب وقف کیا تھا اپنے صاحبزادوں کو وہیں دفن کیا تھا۔ مگر حضرت کی وفات کے بعد متوسلین اور ارادتمندوں نے خود حضرت شاہ کو وہاں دفن کرنا پسند نہیں کیا۔ بلکہ خانقاہِ معلیٰ ہی میں آپ کو دفن کیا گیا۔

ایک خاص کرامت | شیخ اللہ دیا صاحب فرماتے ہیں:- کہ میری

پروادی جو "اوستانی صاحبہ سلطان" کے نام سے مشہور تھیں۔ وہ حضرت شاہ صاحب سے بیعت تھیں۔ حضرت شاہ صاحب کی وفات سے تقریباً ڈھائی سال بعد انھوں نے حضرت کامزار نختہ بنوانا چاہا۔ اس کے لئے "فتحپور سیکری" سے پتھر منگوائے۔ ابھی ماجر کی بنیادیں نہیں بھری گئی تھیں۔ کہ معمار نے خواب میں دیکھا کہ حضرت شاہ اعلیٰ صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرما رہے ہیں کہ بنیاد میں جب آپ لوگوں نے گئی کوئی شروع کی تو لحد کا ایک پتھر ٹوٹ گیا ہے اور وہ میری داہنی ران پر آ پڑا ہے۔ پہلے اس کو زکالو۔ پھر ماجر کی تعمیر کرنا۔ معمار کی آنکھ کھلی تو وہ پریشان تھا۔ وہ محترمہ اوستانی صاحبہ کے پاس آیا۔ آپ نے فرمایا۔ حضرت نے جو ہدایت فرمائی ہے۔ وہ غلط نہیں ہو سکتی۔ قبر کھول کر دیکھو۔ معمار نے قبر کی مٹی ہٹائی۔ قصبہ کے تمام ہی سربراہ اور وہ حضرات اس موقع پر وہاں پہنچ گئے تھے۔ جب لحد تک مٹی ہٹائی گئی تو دیکھا کہ واقعی ایک پتھر ٹوٹ کر اندر گر گیا ہے۔ پتھر کو لحد کے اندر سے نکالا۔ پھر لحد درست کر کے ماجر کی تعمیر کی۔ اس وقت جو حصہ نظر پڑا تو معلوم ہوا کہ وہ ایسا ہی صاف اور صحیح سالم تھا جیسا کہ دفن کے وقت تھا۔

تنبیہ :- یہاں یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ لحد بند کرنے اور قبر بھر دینے کے بعد اس کا کھولنا جائز نہیں ہے۔ اس قسم کے واقعات کی کوئی توجیہ کی جائے گی۔ مگر ان سے حکم شریعت میں فرق نہیں آسکتا۔ عام حکم ہی ہے۔

الحمد للہ۔ اس وقت ۶ شوال ۱۳۸۲ھ ہجری ۳ مارچ ۱۹۶۳ء یک شنبہ کے روز، بعد نماز مغرب اذان عشر کے وقت جنبش قلم ان سطور تک پہنچ چکی ہے۔ ان اوراق میں جو کچھ درج کیا گیا ہے۔ وہ زیادہ تر سیر الاقطاب سے ماخوذ ہے۔ مصنف سیر الاقطاب شاہجہاں بادشاہ کے ایک منصبدار ہیں۔

آپ نے ۱۰۳۶ھ کو ایک ہزار چھتیس ہجری میں یعنی اپنے شیخ حضرت شاہ اعلیٰ صاحب
رحمۃ اللہ علیہ کی وفات سے تین سال بعد اس کی ترتیب شروع کی۔ اور سنہ
ایک ہزار چھپن ہجری میں یعنی بیس سال کی مدت میں اس کو پایہ تکمیل کو
پہنچا سکے۔

سیر الاقطاب میں حضرت شاہ اعلیٰ صاحب تک بزرگوں کے حالات
درج ہیں۔ ہم بھی اس سلسلہ کو حضرت شاہ اعلیٰ صاحب پر ہی ختم کرتے ہیں۔
مگر اکابر اور بزرگان پانی پت کا سلسلہ حضرت شاہ اعلیٰ رحمۃ اللہ علیہ پر
ختم نہیں ہو جاتا۔

پانی پت وہ مردم خیز خطہ ہے جہاں حضرت شاہ اعلیٰ صاحب کے بعد
بھی حضرت مولانا قاضی ثناء اللہ صاحب پانی پتی جیسے شریعت و طریقت کے
مجمع البحرین جلوہ افروز ہوئے ہیں۔ ان کے تذکرہ کے لئے ایک مکمل جلد کی ضرورت
ہے۔ اللہ تعالیٰ کسی صاحب ذوق کو توفیق بخشے کہ اس قومی اور ملی ضرورت کو
پورا کرے۔

ہم اس کتاب کے آخری صفحات کو ایک نظم سے آراستہ کرتے ہیں۔ جو
مشعل راہ کا کام دے سکتی ہے۔ کیونکہ اس میں ان بزرگوں اور اہل کمال کی
نشاندہی کی گئی ہے۔ جو اس دوسری جلد کا موضوع بن سکتے ہیں۔ البتہ نظم
سے پہلے ایک بزرگ کا تذکرہ ضروری سمجھتے ہیں۔ جو عثمانی خاندان کے پہلے بزرگ
ہیں جو پانی پت میں رخت انداز ہوئے یہ حضرت مولانا عبد الرحمن صاحب گادروٹی ہیں۔
مگر یہ تذکرہ کسی کتاب کے حوالہ سے نہیں کیونکہ کسی کتاب میں ان کا ذکر خیر نظر سے
نہیں گذرا بلکہ جناب شیخ مسیح اللہ صاحب کے مرتب کردہ مسودہ سے نقل
کرتے ہیں۔ یہی خاتمہ کتاب ہے۔ (وآخر دعوانا ان الحمد لله رب العالمین)

پانی پت کے نام

(از جناب خواجہ سہیل احمد صاحب نصاری پانی پتی)

پانی پت۔ اے مرجع اہل صفا و علم و فن
 شیخ کالو۔ بیچ پیراں سید روشن علی
 خاک میں پہاں ہیں تیری قائم و بدر و شہید
 کھینچ لائی سید محمود کو تیری زمیں
 شاہ شرف الدین قلندر صاحب جذب و سلوک
 تیری آغوشِ محبت میں وہ لعلِ بے بہا
 شوق کے عالم میں جب ہوتا تھا وہ نغمہ سرا
 اس کا انداز تغزل قدسیوں کو بھا گیا
 خواجہ شمس الدین کلیر سے لے آکر یہاں
 شہ جلال الدین کبیر الاولیاء و مخدوم ما
 تیرا شہرہ تھا جہاں میں انجمن در انجمن
 شیخ بو اسحاق غازی حضرت سرور سخی
 صاحب تختِ امانت گادرونی سعید
 آنکھ کی ٹھنڈک عراقی کو ملی آکر یہیں
 فخر سے قدموں میں جسکے چھکاتے تھے ملوک
 پرورش پا کر بنا تھا زیب تاج اولیاء
 دل پہ کھل جاتا تھا صوتِ سرمدی کا ماجرا
 شعر کے پرے میں سرار جنوں سمجھا گیا
 ان کا فیض نور سار بہتد پر ہے ضوفاں
 سالکِ راہ طریقت مخزنِ جو دو و سخا

۱۔ مشہور یہ ہے کہ ۱۲۹ھ میں حضرت امام بدر العین بدر عالم کی زیر سرکردگی ایک سو ساٹھ (۱۶۰) مجاہدین کے قافلہ میں شیخ کالو شہید۔ سید روشن علی۔ بیچ پیراں۔ امام ابو اسحاق۔ سید سخی سرور۔ امام ابو القاسم اور سید اکبر علی شہید شامل تھے۔ وارد پانی پت ہو کر جام شہادت نوش کیا۔ ۲۔ ۱۳۳ھ میں خواجہ عبدالرحمن گادرونی سالار افواج غزنویہ نے اس شہر کو تسخیر کر کے یہاں اقامت اختیار کی۔ ۳۔ سید محمود۔ ۴۔ مولانا فخر الدین عراقی والد حضرت قلندر صاحب۔ ۵۔ وہ وقت کتاب میں حالات تفصیل سے تحریر کئے جا چکے ہیں۔

جگمگا اٹھی کھٹی ان کے دم سے یہ تیری میں
 پیر کی نے اسی گلشن سے کس گل چینیوں
 شیخ سودو و سراج الدین۔ امال عبدالسلام
 شہ مبارز شہ کبیر و غوث علی و گل حسن
 درس زہد و اتقا کھٹی جنکی ساری زندگی
 مخزن علم شریعت منبع صدق و صفا
 یہ بزرگان زمانہ تھے ترے سرو چمن
 ہیں یہ سب آسودہ خوابانج بھی ترے ہاں
 خان عداوق۔ خال راسخ۔ ذکر یا خال ویر

منظر نور حقیقت مرکز علم و یقین
 خوشہ چینی کے لئے پیر ہرات آئے یہاں
 قادر و بی۔ شیخ علیم و عبد قدوس و نظام
 شہ نصیر و شہ زماں۔ حاجی ولی۔ احمد حسن
 پیر کینیا۔ سید سلطان اولاد نبی
 احمد اللہ۔ رحمت اللہ حضرت قاضی ثنا
 سید داؤد و قمبر۔ مولوی احمد حسن
 قاری لالہ۔ عبد الرحمن فخر قرآء جہاں
 شیر افکن بخشی و خواجہ معین الدین دلیر

۱۔ پیر ہرات خواجہ ملک علی انصاری۔ ۲۔ مولانا سراج الدین کی ۳۔ خواجہ عبدالقادر۔
 ۴۔ خواجہ شبلی شہباز۔ ۵۔ شیخ علیم اللہ ابدال۔ ۶۔ خواجہ عبدالقدوس عثمانی۔ ۷۔ خواجہ
 نظام۔ ۸۔ شیخ سودو۔ لاری۔ ۹۔ مولانا سراج الدین رکوعی۔ ۱۰۔ شیخ امان پانی پتی۔
 ۱۱۔ شیخ عبدالسلام شاہ اعلیٰ۔ ۱۲۔ شیخ نصیر۔ ۱۳۔ شاہ زماں۔ ۱۴۔ حاجی ولی محمد۔ ۱۵۔
 پیر جی احمد حسن۔ ۱۶۔ شاہ مبارز خال۔ ۱۷۔ شیخ کبیر بالا پیر۔ ۱۸۔ مولوی غوث علی۔ ۱۹۔
 مولوی گل حسن۔ ۲۰۔ پیر کینیا خلیفہ مخدوم صاحب۔ ۲۱۔ سید سلطان احمد کچی آل دالے۔
 ۲۲۔ قاضی القضاات قاضی احمد اللہ۔ ۲۳۔ مولوی رحمت اللہ مہاجر کی۔ ۲۴۔ بیہقی ہند
 قاضی ثناء اللہ محرف۔ ۲۵۔ سید داؤد انگ۔ ۲۶۔ سید قمبر علی شہید۔ ۲۷۔ مولوی
 احمد حسن صاحب۔ ۲۸۔ قاری لالہ صاحب۔ ۲۹۔ قاری عبدالرحمن محدث۔ ۳۰۔ نواب
 شکر اللہ خال شیر افکن گوند شہ۔ ۳۱۔ خواجہ عبدالرزاق بخشی مالگیر۔ ۳۲۔ خواجہ معین الدین
 دلیر دل گورتر کابل۔ ۳۳۔ نواب لطف اللہ خال صادق وزیر بہادر شاہ۔ ۳۴۔ نواب
 امین اللہ خال راسخ وزیر بہادر شاہ۔ ۳۵۔ نواب ذکر یا خال گورتر لاہور۔ ۳۶۔ نواب محمد علی خال
 شیر دل مصنف "تاریخ مظفری"

حاکم ثانی مقرب خاں - وزیر بادشاہ
 شیخ بیاض شیخ زینا اور حکیم اللہ دیا
 یادگاریں ان کی تجھ میں آج بھی موجود ہیں
 مقبرہ لودی کا - کابل مسجد اور وہ کالا آم
 شمع آزادی میں جلتا تھا حسینی کا لہو
 ابتدائے جنگ آزادی ہوئی بقار اقبال سے
 حضرت ملا شیخ - مجروح - عالی و سلیم
 مجلسیں قائم تھیں شعر و شاعری کی کو بکوں
 اب کہاں باقی ہے وہ ماحول وہ شعر و سخن
 گوونے پالے تھے تیری کس قدر اہل کمال
 اب نہ پیدا ہونگے یہ لطل جلیل اس خاک سے

بے تعلق کیوں کہ ہم سے دور رکھتا تھا، جنہیں
 رونق شمع شبستاں یعنی پروانوں کے ہے
 پھر اگر فرصت ہو ہم سے یوفانی یاد کر
 غیر بھی آتے تو سینے سے رگاتا تو انھیں
 حسن کی گرمی محفل اس کے دیوانوں کے ہے
 آج نا جنسوں سے اپنی آشنائی یاد کر

۱۵ نواب مقرب خاں وزیر چہانگیر ۱۲ شیخ بیاض حکیم ۱۳ شیخ زینا حکیم اکبر بادشاہ
 ۱۴ حکیم اللہ دیا طبیب شاہجہاں ۱۵ مقبرہ سلطان ابراہیم لودی ۱۶ مسجد کابل باغ
 تعمیر کردہ بابر بادشاہ ۱۷ کالا آم یادگار فتح احمد شاہ ابدالی ۱۸ مولانا حسینی مجاہد
 ۱۹ ۱۸۵۷ء صوفی اقبال احمد لیڈر تحریک خلافت ۲۰ ملا شیخ مترجم مہا بھارت
 ۲۱ بہ نظم فارسی ۲۲ میر مہدی حسن مجروح ۲۳ شمس العلماء خواجہ الطاف حسین حالی -
 ۲۴ مولوی وحید الدین سلیم - ۲۵ مولانا بقار اللہ صاحب عثمانی مدظلہ العالی -

صبر کر اس سے کبھی بدتر وقت آیر گا کبھی
 مٹ نہیں سکتا کبھی سینے سے تیرے غم کا داغ
 اپنی تہذیب و تمدن پر نہ کر ماتم ابھی
 ڈھونڈتا پھر اپنی سمیٹ لیکے ہاتھوں میں چراغ

دل مچلتا ہے کہ آؤں دیکھنے کو ایک بار
 تیرے کوچوں میں پھڑپھڑ باغوں میں گھوموں ^{شب} و روز
 تیری اُلفت سے مراد دل آج بھی معمور ہے
 تیری اُلفت میری غیرت پر سر پیکار ہے
 وہ چمن جس میں گزارے تھے کبھی لیل و نہار
 سر کے بل روضوں پہ حاضر ہو سکوں حسبِ طلب
 طور ہے سینہ مرا اور تو چراغِ طور ہے
 دید کی طالب ہے وہ۔ یہ نام سے بزار ہے

ہاں مگر آثارِ ماضی کا تعلق آج بھی
 یہ بزرگوں کے مقابراک امانت ہیں مری
 رابطہ قائم رہے گا ہم میں گو ہو مختصر
 یادگار ہیں سب ہیں محفوظ تیرے پاس
 ہم میں باقی ہے جو تو رکھے گا اسکی لاج بھی
 یاد رکھنا امتحانِ گاہِ دیانت ہے تری
 بس نصیح اللہ کا یہ آخری پیغام ہے
 دے سکے تو اس کی اُلفت کا یہی العام ہے

خواجہ سہیل احمد انصاری پانی پتی سرگودھا

ختم شد

کتبہ داظمی ۶ اپریل ۱۹۶۲ء

پانی پت۔ انقلاب ۱۹۲۶ء اور مولانا القار اللہ عثمانی

”پانی پت اور بزرگان پانی پت“ کا یہ تذکرہ جب ختم ہونے لگا تو ضروری معلوم ہوا کہ پانی پت کے موجودہ حالات کا بھی ایک خاکہ پیش کر دیا جائے کیونکہ یہ بھی تاریخ پانی پت کا ایک مستقل باب ہے۔ موجودہ پانی پت ان واقعات کا نتیجہ ہے جو انقلاب ۱۹۲۶ء کے وقت پیش آئے تھے۔ ان واقعات کے مطالعہ سے موجودہ پانی پت کا نقشہ سامنے آجاتا ہے۔ ۱۹۲۶ء کے واقعات کے متعلق حضرت مولانا القار اللہ صاحب عثمانی سے زیادہ معتبر اور بہتر راوی کون ہو سکتا ہے۔ جنھوں نے فہم و بصیرت کی کھلی ہوئی آنکھوں سے ان خونین ہنگاموں کا مشاہدہ کیا تھا۔ چنانچہ مولانا سے درخواست کی گئی کہ وہ خود اس ہنگامہ کی تفصیلات مرتب فرمائیں۔

مولانا ضعف بصارت کے عارضہ کے باعث خود تو قلمبند نہیں کر سکے البتہ اس پر راضی ہو گئے کہ مولانا واقعات بیان کریں۔ اور حاجی حسام الدین صاحب انچارج شعبہ ریلیف جمعیتہ علماء ہند ان کو قلمبند کر لیں۔ چند صفحات کے بعد مولانا کا یہی بیان آپ کے سامنے آئے گا۔ ملاحظہ فرمائیے :-

مولانا القار اللہ صاحب کا تعارف | صحافت حاضرہ کا فیشن یہ ہے کہ جس کا بیان شارح کیا جائے ساتھ ساتھ

اس کا فوٹو بھی شارح ہونا چاہیے۔ اسلام نے جب اصنام پرستی کی بنیادوں کو اکھاڑا تو تصویر اور فوٹو کی بھی سخت ممانعت کر دی۔ لہذا فوٹو کے مہم اور مشتبہ تعارف کے بجائے حضرت مولانا کی اوصافی تصویر موقع کے مناسب معلوم

ہوتی ہے جو پیش کی جا رہی ہے۔

زندہ دل مولانا نقار اللہ صاحب جو عمر عزیز کی تقریباً ۵۰ مندرجہ طے کرنے کے بعد بھی جوان ہمت ہیں۔ جب آزادی ہند کی تحریک کی بسم اللہ ہیرو ہی تھی۔ آپ اس وقت سے جنگ آزادی کے مرد مجاہد ہیں۔

تحریک آزادی کی تمہید تحریک خلافت تھی۔ اور تحریک خلافت کا پہلا مرد میدان جس نے ۱۹۱۹ء اور ۱۹۲۰ء کے وحشیانہ جیل خانہ کو سب سے پہلے آگے بڑھ کر آباد کیا۔ یہی خوش وضع حسین و جمیل نقار اللہ عثمانی تھا جس کے دور شباب پر ہزاروں حسن قربان ہوئے تھے۔ ۱۹۲۰ء سے ۱۹۲۴ء تک ۲۷ سالہ دور، اور آج ۱۹۶۳ء تک ۵۳ سالہ دور اس طرح گذرا کہ اس مرد مجاہد کا ہر ایک لمحہ ملک و ملت اور خدمت خلق کے لئے وقف تھا۔ اور وقف ہے۔

۱۹۲۴ء کے ہولناک اور خونین ہنگاموں پر مولانا کو قابو نہیں تھا۔ نہ ان کے مقابلو تھا۔ جوان ہنگاموں میں گھرے ہوئے تھے۔ البتہ اپنی ذات پر مولانا کو پورا قابو تھا۔ چنانچہ سب نے کوچ کیا یا سب کوچ پر مجبور ہو گئے۔ مگر مولانا تمام مجبوریوں کے باوجود اپنی جگہ استقلال و استقامت کے ناقابل تسخیر کوہ ہمالیہ بنے رہے۔

پانی پت کے اس آتش فشاں میں تن تنہا مولانا کا قیام ایک ایسا ہیڈت انگیز اور خطرناک اقام تھا کہ اس نے حکومت کے دماغ کو بھی متاثر کیا۔ چنانچہ حکومت کی طرف سے مولانا کی حفاظت کے انتظامات کئے گئے۔ مگر مولانا کی ذات ان تمام تحفظات سے مستغنی تھی۔

چند سبق آموز اور قابل تقلید شخصیتیں | ۱۹۶۴ء کی بہت سی برائیوں

میں کچھ اچھایاں بھی پائی گئیں۔ انھیں میں ایک خوبی جو نمودار ہو کر سامنے آئی یہ تھی کہ اس گئے گزرے دور میں بھی اعتماد علی اللہ اور خدا پر بھروسہ کرنے کے نتیجہ کا مشاہدہ ہوا۔ اور چند ایسی شخصیتیں سامنے آئیں جنہوں نے کم از کم ہمت و جرات اور اعتماد علی اللہ کے سلسلہ میں سلف صالحین کا نمونہ پیش کر دیا۔

مجاہد ملت حضرت مولانا محمد حفظ الرحمن صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے سب لوگ واقف ہیں۔ ایسے ہی خان عبدالغفار خاں صاحب کی شخصیت بھی مشہور شخصیت ہے جو تن تنہا انبالہ شہر میں اقامت گزیں اور ضلع کانگریس کمیٹی کے صدر کی حیثیت سے مصروف عمل رہی۔ لیکن حضرت مولانا محمد شفیع صاحب صدر مدرس مدرسہ عبدالرب دہلی۔ اور حضرت مولانا ضیاء الحق صاحب صدر مدرس مدرسہ امینیہ کشمیری گیٹ دہلی سے کوئی واقف نہیں۔ یہ اپنے اپنے مدرسوں میں تن تنہا شب و روز اس وقت اور ان حالات میں مقیم رہے جب اس علاقہ میں کسی مسلمان کے وجود کا تصور بھی لرزہ خیز تھا۔ پھر یہ کچھ اس طرح گنہامی کے ساتھ قیام پذیر رہے کہ کسی کو ان کی حفاظت کے کسی انتظام کا خیال بھی نہیں آیا۔ مگر ان کی نظریں اپنے ربا اور موالی پر تھیں اور وہی ان کا محافظ رہا۔ خطرات کے طوفان برپا ہوئے۔ ان علاقوں کی زمینیں مسلمانوں کے خون سے لالہ زار بن گئیں۔ مگر ان کی طرف کسی نے نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھا۔

حُبِ وطن کی اس سے بہتر مثال کیا ہو سکتی ہے جو ان حضرات کے کردار نے پیش کی۔ دوست، احباب، عزیز و اقارب، بیوی بچے، بہن بھائی۔ سب چھوٹے مگر جو نہیں چھوٹا وہ وطن عزیز تھا۔ کیا اس سے بہتر اور اس سے زیادہ واضح حب وطن کی کوئی مثال پیش کی جا سکتی ہے۔

مجموعہ یاد ہے کہ ۱۹۴۶ء کے ہنگاموں کے بعد پہلا **غم کس بات کا تھا** | رمضان آنے والا تھا۔ غالباً شجبان کی ۲۸ یا ۲۹

کو حضرت مولانا القار اللہ صاحب دہلی تشریف لائے۔ مولانا بہت افسردہ تھے۔ آنکھیں پر غم تھیں۔ اور صدمہ اس بات کا تھا کہ وہ پانی پت جہاں رمضان شریف میں کم و بیش ایک ہزار قرآن شریف ہوا کرتے تھے۔ اس مرتبہ وہاں صرف ایک ہے۔ جو قرآن شریف پڑھنا چاہتا ہے۔ مگر جماعت اور مسجد اس کو بھی میسر نہیں۔ مولانا نے اسی مجلس میں یہ بھی ہدایت فرمائی۔ کہ اگر خدا نخواستہ "وقت موعود" آجائے تو دہلی لا کر تجہیز و تکفین کرنا۔

قناعت | قناعت کا گریہ ہے کہ انسان اپنے خرچ کو اپنی آمدنی میں محدود رکھے اور آمدنی نہ ہو تو اس کی خود داری ہر مصیبت جھیلنے کے لئے آمادہ ہو۔ مگر سوال کی ذلت برداشت کرنے کے لئے کسی وقت تیار نہ ہو۔

حضرت مولانا القار اللہ صاحب عثمانی اس گرسے واقف ہیں۔ چنانچہ تمام عمر ملی اور ملکی خدمات میں صرف کی۔ مگر کسی وقت کوئی الاؤنس یا کسی خدمت کا کوئی معاوضہ لینا منظور نہ کیا۔ جائداد کی معمولی آمدنی ذریعہ معاش تھی۔ جس کو قناعت کے مذکورہ بالا گرنے بابرکت بنا دیا تھا۔

۱۹۴۶ء کے اس ہنگامی دور میں جب کہ آمدنی کے تمام ذرائع مسدود تھے۔ مولانا کو اپنی ضروریات کے لئے بہت کچھ پر لیشان رہنا پڑا۔ آخر میں اس نے طے کیا گیا کہ مبلغ پچاس روپیہ ماہانہ چند ماہ تک بطور قرض دینے جائیں شاید دو ماہ ہی اس طرح قرض کی نوبت آئی تھی۔ کہ اللہ تعالیٰ نے اسباب پیدا کر دیئے۔ اور اب مولانا نے قرض لینے کے بجائے اس کی ادائیگی کا انتظام شروع کر دیا۔ **مولانا کا اثر غیر مسلموں پر** | ہمدردی و غمخواری۔ خدمت خلق خود داری

قتاعت اور خدا پر بھروسہ، وہ جو بہری صفات ہیں جو نہ صرف دوستوں بلکہ دشمنوں اور مخالفین کو بھی متاثر کرتے ہیں۔ چنانچہ مولانا بقار اللہ جو غیروں کی نظر میں چند روز قبل قابل نفرت تھے کچھ دن گزرنے نہیں پائے تھے کہ یہی مولانا بقار اللہ ان کی آنکھ کا تار بن گئے جن کے دلوں میں نفرت کے تنور دھک رہے تھے۔

پانی پت میں کہنے کو مولانا تنہا تھے۔ مگر حالت یہ تھی کہ وہی نفرت کرنے والے معتقد بن کر آتے اور رات دن مولانا کو گھیر رکھتے تھے۔ ابھی آفتاب پوری طرح طلوع نہیں ہونا تھا کہ رفیو جی بھائیوں کی عورتیں اور بچے دعائیں پڑھواتے اور تعویذ لینے کے لئے حاضر ہو جاتے تھے۔

ایک واقعہ خود مولانا کی زبانی سنئے اور اس مقبولیت کا اندازہ کیجئے۔ جو مولانا کو چند ماہ کے اندر ان اجنبی وغیر ملکی شہزادہ تھیوں میں حاصل ہو گئی تھی۔ مولانا نے اپنے ایک مکتوب میں تحریر فرمایا ہے :-

جب میں خرچ سے تنگ تھا۔ اور جمعیتہ علماء یا مجلس سنی اوقاف میں ملازمت کا کچھ خیال پیدا ہوا تھا۔ شاید کبھی زبان پر بھی آگیا ہو۔ بہر حال کچھ لوگوں کو اس کا علم ہو گیا۔

ایک روز صبح کو جناب حکیم سنت لال صاحب خالوال والے چند ہندو رفیو جیوں کے ساتھ میرے پاس آئے۔ اور دریافت کیا کہ کیا آپ پانی پت چھوڑ رہے ہیں۔ میں نے جواب اثبات میں دیا۔ تو یہ بے قابو ہو کر رونے لگے اور ان کی ہچکیاں بندھ گئیں۔ پھر ہاتھ جوڑ کر کہا کہ ہم غریب آدمی زیادہ خدمت نہیں کر سکتے۔ البتہ آنا کر سکتے ہیں کہ چھپاس روپے ماہانہ آپ کی خدمت میں پیش کرتے رہیں۔ پھر کہنے لگے کہ آپ نے جانے کا ارادہ

کیا لو آپ کا تا نگہ ہم مردوں، عورتوں، جوان، بوڑھوں اور بچوں کی چھاتیوں پر سے گذر کر اسٹیشن پہنچ سکتا ہے۔

مولانا نے تحریر فرمایا ہے کہ ان صاحبان کی اس درد مندانہ فرمائش کا اثر میرے اوپر یہ ہوا کہ میں خود بھی رونے لگا۔ ان سب کو سینے سے لگایا اور اطمینان دلایا کہ میں نہیں جاؤں گا۔ میں یہاں اس لئے ٹھیرا ہوا ہوں کہ یہاں میری موت آئے اور اسی خاک پاک میں میری قبر بنے۔

یہ ہیں — مولانا القاسم اللہ عثمانی۔ جن کا بیان آپ کے سامنے پیش کیا جا رہا ہے جس سے اگست ۱۹۴۷ء سے لے کر آج تک کے حالات کا علم ہو جائے گا۔

حضرت مولانا القاسم اللہ صاحب کا بیان

فساد کی ابتداء | آخر اگست ۱۹۴۷ء سے پاکستانی شہر تھیں کی آمد شروع ہو گئی تھی۔ جو روز بروز بڑھتی رہی۔ ستمبر شروع ہوا تو پانی پت کی فضا خراب ہونے لگی۔ گاندھی جی کی یہ خواہش ضرور تھی، اور دلی جذبہ کے ساتھ تھی کہ پانی پت میں امن رہے۔ مگر حالات دن بدن بگڑ رہے تھے۔ اوائل اکتوبر میں پانی پت کی فضا کو درست اور حالات کو قابو میں رکھنے کے لئے مولانا حفظ الرحمن صاحب، مولانا ابوالکلام صاحب آزاد اور نیڈت نہرو کو توجہ دلائی گئی۔ وہاں سے جب کوئی جواب نہ آیا۔ تو توجہ دہلی گیا۔ اور اپنے چھوٹے بھائی حاجی وقار اللہ کو نہایت خطرناک حالات میں ہلی بھیجا۔ انھوں نے میرا خط اور یہاں کے حالات مولانا آزاد کے سامنے پیش کئے۔ مولانا حفظ الرحمن صاحب، مولانا احمد سعید صاحب، مولانا محمد میاں صاحب

۱۵ فالٹا سید محمد صاحب جعفری کی جگہ یہاں میرا نام لکھا گیا ہے۔ یہی غلطی اور جگہ بھی ہوئی ہو (محمد میاں)

اور حافظ محمد نسیم صاحب پٹن والے اور دیگر اراکین جمعیتہ علمائے ہند اس گفتگو میں شریک تھے۔ ۲۹ اکتوبر تک جب کوئی صاحب تشریف نہ لائے۔ اور شہر نار تھیوں کی کثرت کی وجہ سے خطرہ بڑھ گیا۔ شہر پانی پت سے باہر مسلمان قتل کئے جانے لگے۔ تو میں خود ۳۰ اکتوبر ۱۹۴۷ء کو چودہری ناصر علی خاں صاحب کو ساتھ لیکر دہلی پہنچا۔ حالات انتہائی خطرناک تھے۔

مولانا حفیظ الرحمن صاحب سے بات چیت ہوئی۔ دوسرے روز مولانا آزاد سے ملاقات ہوئی۔ غور و فکر ہو ہی رہا تھا۔ کہ ۳ نومبر کو اطلاع ملی۔ کہ پانی پت میں عام قتل و غارت گری شروع ہو گئی ہے۔ اور محلہ انصاریان و راجپوتان مسلمانوں سے خالی کر لیا گیا۔ اور یہاں کے مسلمانوں کو محلہ مخدوم زادگان اور محلہ افغانان میں منتقل کر دیا گیا ہے۔ اور اس طرح کہ جو شخص جہاں تھا سب کچھ چھوڑ کر خالی ہاتھ وہاں سے نکال دیا گیا۔ کوئی سامان ساتھ نہ لے سکا۔ اس کی اطلاع فوراً مولانا ابوالکلام صاحب آزاد کو دی گئی۔

مجھ کو مولانا آزاد نے دوسرے روز بلایا۔ چنانچہ میں مولانا حفیظ الرحمن صاحب، مولانا احمد سعید صاحب، مولانا سید محمد میاں صاحب، حاجی محمد نسیم صاحب، ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب، حافظ فیاض احمد صاحب اور دوسرے حضرات جو پانی پت سے وطن ہونے کا تعلق رکھتے تھے۔ انکی ایک بڑی جماعت مولانا آزاد کی خدمت میں پہنچی۔ مولانا موصوف کو حالات سنائے۔ بہت غم اور اندوہ کے ساتھ مولانا موصوف نے فرمایا۔ "آہ" میرا پانی پت "لٹ گیا۔

امن کی کوشش | ۵ نومبر کو مولانا آزاد نے پنڈت نہرو سے ملاقات کی۔ پنڈت جی دفتر تشریف لے جا رہے تھے انھوں نے فرمایا۔ کہ ایک دو آدمیوں کو میرے پاس دفتر میں بھیجو۔ جو وہاں کے حالات

تفصیل سے بتلا دیں۔

چنانچہ ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب اور غالباً حافظ فیاض احمد صاحب دفتر پہنچے اور نیڈت جی کو تفصیلی حالات سنائے۔

۵ نومبر کو ہمارا وفد پھر مزید حالات سنانے کے لئے مولانا آزاد کے مکان پر پہنچا۔ اور مولانا آزاد نے گاندھی جی سے ملاقات کا وقت مقرر کرنا چاہا۔ گاندھی جی نے فوراً ہی بلالیا۔ گاندھی جی نے بڑے تپاک سے استقبال کیا۔ اور محبت بھرے انداز میں فرمایا "بھائی لکار اللہ (لِقَارِ اللّٰہِ) بہت مدت کے بعد ملاقات (ملاقات) ہوئی۔ ہم کو بٹھایا۔ ہم نے پانی پیت کے حالات سنائے شروع کئے۔ مولانا ابوالکلام آزاد کو پانی پیت کے برباد ہو جانے کا بہت قلق تھا۔ کیونکہ وہ اس گئے گزرے دور میں بھی تجوید و قرأت اور تعلیم قرآن کا بہت بڑا مرکز تھا۔ مولانا کی زبان سے اس وقت بھی یہ جملہ بے ساختہ نکلا۔ ہائے میرا پانی پیت۔" گاندھی جی اس سے بھی متاثر تھے اور ان کو اس بنا پر بھی افسوس تھا کہ پانی پیت صنعت اور دستکاری کا بھی ایک مرکز تھا۔

تمام حالات سنائے اور بات چیت کے بعد میں نے چلتے ہوئے مہاتما گاندھی کو ہندوستان کی آزادی اور مسلمانوں کی بربادی پر مبارکباد دی۔ اس پر مہاتما جی نے بہت جوش و جذبے میں تقریباً ڈیڑھ گھنٹوں سے جس کا اثر تمام حاضرین نے محسوس کیا۔ فرمایا کہ:- "میں تو پٹیل سے کہتا ہوں کہ چل پنجاب کو دیکھ تیری بدولت کیا ہو رہا ہے۔" تاہم ۱۱ نومبر ۱۹۴۷ء کو پانی پت تشریف لانے کا وعدہ کیا۔

ریلیف سکریٹری کو پہلے تنبیہ کی کہ پانی پیت کے حالات نہیں معلوم کئے مجھے کل تک اطمینان دلاتے رہے۔ کہ وہاں کچھ نہیں ہے۔ اب مولانا

لقار اللہ صاحب سے کچھ حالات معلوم ہوئے۔ پھر ہدایت کی کہ آپ خود مولانا لقار اللہ صاحب کے ساتھ پانی پت جائیں اور وہاں کے حالات کی صحیح رپورٹ پیش کریں۔

یہ بھی سنا گیا تھا کہ ۶ نومبر کی صبح کو مہاتما گاندھی پانی پت آنے کے لئے تیار ہو گئے تھے۔ گاڑی بھی منگالی۔ مگر جوب کیبنڈٹ کے اراکین کو معلوم ہوا۔ تو گاندھی جی کے پاس پہنچے۔ اور اس طرح دفعتاً بلا کسی انتظام کے جلنے سے بمشکل باز رکھا۔

بہر حال سردار گورچن سنگھ ریلیف سکریٹری اور کچھ اور ساتھیوں کے ساتھ میں ۶ نومبر کا دن گزار کر رات کو ابجے پانی پت پہنچا۔ گرفتاری کی وجہ سے رات کو لالہ کھیم چند کے یہاں قیام کیا۔ صبح گھر پہنچا۔ یہ لوگ بھی ساتھ تھے۔ پورا محلہ ایک کیمپ بنا ہوا تھا۔ اور آدھ دفعاں کی صدا میں ہر طرف سے سنائی دے رہی تھیں۔ ہمارے پہنچنے کے ساتھ ہی ایک امریکن ڈاکٹر رچو بہت شریف اور ہمدرد انسان تھا، زخمیوں کی مرہم پٹی اور علاج کے لئے پانی پت پہنچ گیا تھا۔ مسلم حالی ہائی اسکول میں شفا خانہ قائم کیا گیا۔ اور امریکن ڈاکٹر نے بہت ہمدردی سے زخمیوں کا علاج شروع کیا۔

یہاں آکر معلوم ہوا کہ ۶ نومبر کو جب پانی پت میں یہ خبر پھیلی کہ یہاں مہاتما جی آنے والے ہیں۔ تو اس وقت کے بعد سے قتل کا حادثہ کوئی وقوع میں نہیں آیا۔

مسلمانوں کی پریشانی | ۶ نومبر کو پانی پت میں عام طور پر معلوم ہوا کہ گرفتاری کی وجہ سے آئے کی مشینیں بند ہیں۔

نہ کہیں غلہ اور آٹا مل رہا ہے اور نہ تیل دستیاب ہو رہا ہے۔ شہر میں کسی

کے پاس بھی آٹا نہیں چنے اور گیہوں اُبال کر لوگ کھا رہے ہیں۔ نمک۔ تیل۔ گڑ۔ کوئی چیز بھی نہیں ہے سب بند ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ شہر کے دوکانداروں نے فیصلہ کر لیا تھا۔ کہ اگر کسی مسلمان کے ہاتھ ایک پیسہ کی چیز بھی فروخت کی گئی۔ تو پانچ روپے جرمانہ کیا جائے گا۔

ڈپٹی کمشنر علاقہ مسٹر روشن لال اور راشن کنٹرول آفیسر نے فوراً چکی چلانے والا تیل کافی مقدار میں میرے حوالے کیا۔ اور چکی چلانے والوں پر سے گریو ہٹا دیا گیا۔ تاکہ رات کو چکیاں چل سکیں۔ غلہ کی دوکانیں قائم کی گئیں۔ اور بجمدا اللہ ۸ نومبر کو مسلمانوں کو روٹی نصیب ہو سکی۔

عجیب بات یہ ہوئی کہ وال، نمک، گڑ وغیرہ ضرورت کی چیزیں جن سے مسلمان محروم ہو گئے تھے وہ رفیو جیوں نے فراہم کیں۔ اور قلندر صاحب کے چوک میں دوکانیں لگا کر بیٹھ گئے مسلمان ان سے خون زدہ تھے۔ وہ اپنی ضرورت کی چیزیں دیکھتے تھے مگر وہاں جاتے ہوئے ان کو وحشت ہوتی تھی۔ انھوں نے مجھ سے شکایت کی۔ میں اسسٹنٹ ڈپٹی کمشنر اور تھانہ دار وغیرہ افسران کو لے کر وہاں پہنچا۔ ہم نے ان دوکاندار شرنار تھیوں سے گفتگو کی۔ ہمیں اندازہ ہوا کہ وہ غریب بھی اپنی ضروریات فراہم کرنے کے لئے یہاں بیٹھے ہیں۔ چنانچہ ہم نے مسلمانوں کو سمجھایا کہ گھبرانے کی بات نہیں ہے۔ وہ بھی تمہاری طرح ضرورت مند ہیں۔ وہ تمہاری ضرورت کی چیزیں تمہارے ہاتھ بچکر اپنی ضرورتوں کے لئے پیسے کمانا چاہتے ہیں۔ آپ اطمینان سے جائیں اور خرید و فروخت کریں۔ بہر حال نو دس دن کے بعد مسلمانوں کو ان کی ضرورت کی چیزیں میسر آئیں۔ اور لطف یہ ہے۔ کہ انھیں شرنار تھیوں کے ذریعہ جو ان کے خون کے پیاسے بن کر یہاں پہنچے تھے۔ کفن کے لئے کپڑا اور عام طور پر مٹی کا تیل اور نمک کی ضرورت پورا کرنے

کے لئے شہر کے سب حج وغیرہ متعین کئے گئے۔ اور شہری انتظام ٹھیک طور پر چلنے لگا۔

انرا نمبر کو حسب وعدہ مہاتما گاندھی، حضرت مولانا آزاد، مولانا احمد سعید صاحب، مولانا حفیظ الرحمن

گاندھی جی کی آمد

صاحب، سید محمد صاحب جعفری، حافظ محمد نسیم صاحب بن والے۔ اور جمعیتہ علماء ہند کے دوسرے ذمہ دار حضرات پانی پت تشریف لائے۔ یہاں کے حالات کا جائزہ لیا۔ لالہ کھیم چند جو یہاں کی کانگریس کے بڑے لیڈر تھے۔ ان سے دریافت کیا کہ آپ لوگوں کی مسلمانوں سے کیسی گذرتی تھی۔ ابھی وہ جواب دینے بھی نہیں پائے تھے کہ ایک وکیل صاحب پول پڑے۔ ہمیشہ لڑائی جھگڑے میں۔ تب لالہ کھیم چند نے فرمایا۔ کہ ہماری لڑائی دو بھائیوں کی لڑائی ہوتی تھی۔ صبح کو لڑے اور شام کو گلے مل لئے۔ اور ہمارے تعلقات آپس میں بہت اچھے تھے۔ مسلمانوں میں سے ایک صاحب نے حکام کی مدد سے لڑائی شروع کر دی جو خلاف واقعہ تھی۔ لوگوں کو اچھا معلوم نہیں ہوا۔ تاہم مہاتما جی پورے حالات سے باخبر ہو کر واپس تشریف لے گئے۔ اور مسلمانوں کا انخلا رکھنے کے ذریعہ جو پاکستان سے آئے تھے، شروع ہو گیا۔

تعمیر | ایک بات بہت تعجب کی ہے کہ مسلم لیگ والے میرے سخت مخالف تھے حتیٰ کہ قتل کرنے کے لئے تیار تھے۔ لیکن پاکستانی حکومت اور اس کے افسران کو جب یہ معلوم ہوا کہ مسلمانوں کے پاس آٹا اور دیگر ضروریات کی چیزیں نہیں ہیں۔ تو انھوں نے تقریباً ۱۰ پوری آٹا اور مریشیوں کے لئے ڈاکٹری ادویات میرے ہی نام بھیجیں۔ اور خاص طور

پروہاں کے ریلیف کمیٹی کے افسر نے مجھ کو خط لکھا کہ یہ تمام چیزیں آپ اپنے طور سے مسلمانوں میں تقسیم کر لیں۔

رفتہ رفتہ کتوا بیوں کے ذریعہ انخلاء
مسلمانوں کے انخلاء کا فیصلہ

ہو رہا تھا۔ پاکستانی دوست اگرچہ مجھ سے خفا بھی تھے اور غالباً یہ بھی صحیح ہے کہ وہ مجھ سے نفرت کرتے تھے۔ مگر ساتھ ہی مجھ پر اعتماد بھی اتنا تھا کہ انخلاء کی صورتوں کے متعلق پاکستانی فوجی افسران مجھ سے ہی مشورہ کرتے تھے۔ حالانکہ میرے مکان کے نیچے کھڑے ہوئے مسلمان دبائنگ دہل کہا کرتے تھے کہ یہ شخص باغی ہے، غدار ہے، کافر ہے۔ ہمارا نمائندہ نہیں ہے۔ کانگریسی ہندوؤں کے ہاتھ پکا ہوا ہے، پاکستان کا دشمن ہے۔ یہ افسر یہ تمام آوازیں سنتے تھے مگر ان کو اطمینان میری ہی بات سے ہونا تھا۔ اور جو بات تک پوری نہیں ہوتی تھی یہ واپس نہیں ہوتے تھے۔ ایک روز ڈپٹی ہائی کمشنر پاکستان تشریف لائے ان کے ساتھ ڈپٹی کمشنر

علاقہ اور کچھ فوجی افسران تھے۔ حضرت شاہ قلندر صاحب کے نقار خانے پر نمونے مسلمانوں کو جمع کر کے دریافت کیا کہ آپ لوگ یہاں رہنا چاہتے ہیں۔ یا پاکستان جانا چاہتے ہیں۔ اور یہ بھی کہا کہ پاکستان جا کر کوئی جنت نہ ملے گی۔ وہاں حلوا پوری تیار نہیں رکھی ہے۔ اس پر زیادہ بار نہ ڈالو۔ اور خود پریشان ہو کر پاکستان کو پریشانی میں مبتلا نہ کرو۔ مگر اس کا کوئی اثر نہ ہوا اور اس کے برخلاف مسلمانوں سے ایک درخواست حاصل کی گئی۔ کہ ہم سب پاکستان جانا چاہتے ہیں۔ صرف میں نے پاکستان جانے سے انکار کیا۔

ڈپٹی ہائی کمشنر نے تنہائی میں مجھ سے بہت سی باتیں کیں۔ لیکن اس وقت میں نے یہ فیصلہ نہیں کیا تھا۔ کہ میں پانی پت ہی میں قیام کریں گا۔ یا کسی دوسری جگہ رہوں گا۔

اس اطلاع پر کہ پانی پت کے
دیہاتی مسلمان اور ان کا انحلال مسلمان پاکستان جا رہے ہیں

دیہات کے مسلمانوں میں انتشار پیدا ہوا اور دیہات کے اکثر مسلمانوں نے
 ڈر اور خوف کی وجہ سے جو پاکستان سے آئے والے شہر نار تھیوں نے پھیلا دیا
 تھا۔ اپنے آپ کو ہندو ظاہر کیا (فسادات کے زمانہ میں پنجاب میں بہت
 خطرناک سیلاب آیا تھا۔ اب یہ سیلاب کم ہو گیا تھا۔ تو ایک روز تقریباً ۷ ستر
 دیہات کے یہ خوف زدہ مسلمان اپنے تعلق کے ہندو جالوں کے ہمراہ پانی پت
 آئے۔ اور انھوں نے مجھ سے آکر کہا کہ ہمارا کیا حشر ہو گا۔ کیا ہم مرتد ہو کر یہاں
 رہیں گے یا ہم بھی پاکستان جا سکتے ہیں۔ دوسرے روز بھی اسی قدر دیہات
 کے مرتد مسلمان آئے۔ مگر تیسرے روز بہت زیادہ تعداد میں لوگ آئے۔ اس
 وقت کوئی بات سمجھ میں نہیں آئی کہ ان کا کیا حل ہو۔ چونکہ میں خود بھی مترد
 تھا کہ میں دہلی رہوں جیسا کہ مہاتما جی اور جمعیتہ علماء ہند کے اکابرین کی خواہش
 تھی یا کیرالہ یا حیدرآباد قیام کروں جہاں سے دوست و احباب کا سخت تقاضا
 تھا۔ پانی پت رہنے کا خیال اس وقت تک پختہ نہیں تھا۔

تیسرے روز رات کو میں کچھ سو رہا تھا کچھ جاگ رہا تھا۔ بہر حال
سکون غنودگی طاری تھی۔ کہ ایک مشتین حسین چہرہ دکھائی دیا۔ اور اس
 نے تنبیہ کی کہ "مسلمانوں کی خدمت کا وقت اب ہے۔" مارکاٹ اور شہر نار تھیوں
 کی بربریت و مظالم کی وجہ سے میرا بھی دل مطمئن نہیں تھا لیکن ان الفاظ کے
 بعد میرے دل میں سکون پیدا ہو گیا۔ اور وحشت و پریشانی وغیرہ سب کا فور
 ہو گئی۔ اور یہ عزم پختہ ہو گیا کہ مجھ کو یہاں پانی پت ہی میں رہنا ہے۔

صبح کو نماز کے بعد میں نے اپنے ایک عزیز دوست سے ذکر کیا۔ کہ اب
 میں کہیں نہیں جاؤں گا۔ بلکہ پانی پت ہی رہوں گا۔ میرا بھائی (وقار اللہ)

جو وہلی سے بعض بے یار و مددگار عورتوں کو لیکر ہوائی جہاز سے پاکستان چلا گیا تھا۔ اگر وہ موجود ہوتا تو اپنے اس عزم کی اطلاع اسکو دیتا۔ اس دوست کو نہ دیتا کیونکہ وقار اللہ صرف میرا بھائی نہ تھا۔ بلکہ وہ میرا دوست بھی تھا اب میرے دماغ میں دو خیال گھوم رہے تھے (۱) مغویہ عورتوں کی واپسی اور (۲) مرتد مسلمانوں کی واپسی یا ان کا پاکستان بھجنا۔ اس سلسلہ میں کوئی رائے نچتے نہیں ہوئی تھی کہ پانی پت کے مسلمانوں کے انخلاء کا متفقہ آخری فیصلہ ڈپٹی ہائی کمشنر پاکستان کے سامنے ہو گیا تو میں پھر دوبارہ نپڈت مادھورام اور دیگر کانگریسی دوستوں کو ساتھ لے کر وہلی گیا۔ رات کو مولانا حفظ الرحمن صاحب اور مولانا احمد سعید صاحب سے ملاقاتیں کیں۔ اور ان کو مسلمانوں کا فیصلہ سنایا۔ یہ آخری نومبر یا دسمبر کی پہلی دوسری تاریخ کا واقعہ ہے۔

صبح کو مولانا حفظ الرحمن، مولانا احمد سعید صاحب ڈاکٹر ذاکر حسین۔ مولانا محمد میاں صاحب۔ حافظ محمد نسیم صاحب وغیرہ کے ساتھ مہاتما گاندھی کے یہاں پہنچے۔ مہاتما جی نے فرمایا کہ بھائی نقار اللہ اب کیوں آئے ہو؟ میں نے جواب دیا کہ پانی پت کے مسلمان رہنا نہیں چاہتے اور پاکستان جانے کا فیصلہ کر چکے ہیں۔ میری خواہش اور درخواست ہے کہ آپ ان کو رخصت کر دیں۔ انھوں نے ہر دسمبر کی تاریخ مقرر کی۔ اس کے بعد میں نے پلاپسار کر درخواست کی کہ میں آپ سے ایک بھیک مانگتا ہوں۔ انھوں نے کہا کہ فرمائیے۔ تو میں نے مسلمان مغویہ عورتوں کی بازیابی اور دیہاتی مسلمانوں کے انخلاء کے بندوبست کرنے کی درخواست کی۔ مہاتما جی نے کہا کہ مغویہ عورتوں کی واپسی تو بہت ہی ضروری ہے وہ آپ لے سکتے ہیں۔ لیکن مسلمانوں کا اپنے گھروں کو چھوڑ کر جانے کا نہ میں پہلے حامی اور موید تھا اور

نہ اب ہوں۔ اسی طرح ہندوؤں کا پاکستان سے آنے کا نہ میں پہلے حامی تھا۔
نہ اب ہوں۔ یہ سلسلہ دونوں ملکوں کے لئے تباہ کن ہے۔

پنڈت مادھوراہم کے ساتھ مہاتما
گانڈھی کے یہاں میرے دوست

کانگریسی دوستوں کی غلط بیانی

اور عزیز دلش بندھو گپتا بھی موجود تھے۔ مہاتما جی نے دلش بندھو گپتا سے
پوچھا۔ کہ تم مسلمانوں کو نہیں رکھ سکتے۔ اس نے جواب دیا۔ کہ ہم نے بہت
کوشش کی، لیکن مسلمان نہیں مانے اور نہیں رک سکے۔ میں نے فوراً
جواب میں کہا کہ دلش بندھو تم غلط کہتے ہو تم دہلی میں ہو۔ لالہ کھیم چند، لالہ
روشن لال، سردار گوبچن سنگھ وغیرہ ۸ نومبر کو میرے مکان پر موجود تھے۔
میں نے ان لوگوں سے خود کہا کہ آپ لوگ اگر مسلمانوں کو روکنا چاہتے
ہیں تو ایک عام جلسہ بلائیے اور اس میں کھلے دل سے کھیلے کروار کی معذرت
کیجئے۔ اور آئندہ کے لئے ان کو اطمینان دلایئے مسلمان یقیناً رک جائینگے
مگر ایسا اجتماع آج تک نہیں ہوا۔ اس پر مہاتما جی کو بہت غصہ آیا۔ اور
انہوں نے دلش بندھو گپتا کے متعلق بہت سخت الفاظ استعمال کئے۔

۴ نومبر کو مہاتما گانڈھی کی تشریف آوری | مہاتما جی نے ہم
دسمبر پانی پت کے

لئے مقرر کی تھی۔ وہ پانی پت تشریف لائے۔ دوسرے روز حالات سننے۔
میں نے بالکل کھل کر واضح طور پر حکام اور مقامی لوگوں کے متعلق (جس میں
کانگریسی دوست بھی شامل تھے) وہ سب کچھ صاف صاف کہہ دیا جو میں کہہ
سکتا تھا۔ یہ سب لوگ اس وقت موجود تھے۔ ان کے علاوہ وزیر اعلیٰ پنجاب
شری بھارگو اور دوسرے وزراء پنجاب بھی موجود تھے۔

ہتھیار | مقامی حکام نے کچھ ہتھیاروں کی بھی نمائش کی۔ اور الزام یہ لگایا کہ یہ ہتھیار مسلمانوں کے یہاں سے برآمد کئے گئے ہیں۔ حالانکہ یہ ہتھیار خود شرنارکتھی حضرات اور پولیس والوں نے کرنیو کے زمانے میں کہیں باہر سے جمع کئے تھے۔ البتہ معمولی چاقو اور ترکاری کلٹے والی چھریاں ضرور مسلمانوں کے یہاں سے برآمد ہوئی تھیں۔ جن کو آلات حرب سے تعبیر کیا گیا۔ اس نمائش پر تبصرہ کرتے ہوئے میں نے کہا کہ اگر آپ اجازت دیں تو میں ان سے زیادہ سخت ترین ہتھیار ہندوں کے یہاں سے برآمد کرا سکتا ہوں یہ ہتھیار اس طرح برآمد کئے گئے ہیں کہ کرنیو لگا ہوا تھا، حکام کے پاس ہتھیار موجود تھے۔ اور مشہور کر دیا گیا کہ یہ مسلمانوں کے مکانات سے نکلے ہیں۔ یہ میرا بیان تقریباً ایک گھنٹہ جاری رہا جس کو عزیزہ اندرا گاندھی (دختر نہڈت جو اسہر لال نہرو) نے پورے طور پر نوٹ کیا۔

اسپیشل ٹرینوں کا انتظام | ۵ دسمبر کو پہلی اسپیشل روانہ ہوئی اس میں مسافر بھس کی طرح بھرے گئے تھے۔ اور ستم یہ کہ وہ لیگی کارکن جن کو ٹکٹ دیئے گئے تھے۔ کہ جانے والوں کو تقسیم کر دیں، انھوں نے فی ٹکٹ ایک روپیہ نذرانہ وصول کیا تھا۔ ۶ دسمبر کو ڈپٹی کمشنر صاحب کرنال تشریف لائے اور انھوں نے فرمایا کہ مجھے ہدایت کی گئی ہے کہ میں آپ کو یہ اطلاع کر دوں کہ پرسوں والی اسپیشل ٹرین بخیریت لاہور پہنچ گئی۔ میں نے مسکراتے ہوئے عرض کیا۔ کہ وہ پانچ مسلمان جو مرے ہیں ان کے انتقال کی رپورٹ کہاں ہے اس پر وہ بہت سراسیمہ اور پریشان ہوئے اور کہا کہ ٹھیک ہے۔ پھر دریافت کیا کہ مسلمانوں کی روانگی میں کوئی تکلیف تو نہیں ہے۔ میں نے توجہ لائی۔ کہ مسلمانوں کو گاڑی میں بھس کی طرح بھرا جا رہا ہے یہ کوئی انسانیت نہیں ہے

تو انہوں نے بہتر انتظام کا وعدہ کیا اور مجھ سے کہا کہ چل کر دیکھ لو کہ گاڑی میں مسافروں کو آرام سے جگہ دی گئی ہے۔ چنانچہ میں اسٹیشن گیا۔ اسٹیشن سے دور فاصلہ پر اسپیشل کھڑی کی جاتی تھی۔ میں نے ڈپٹی کمشنر صاحب کو دکھلایا کہ مسافر زیادہ ہیں۔ چنانچہ فوراً دوسری خالی گاڑی اسٹیشن ماسٹر سے طلب کر کے لگوائی گئی۔ اور ایک گاڑی کے بجائے دو گاڑیوں میں وہ مسلمان سوار ہو کر جاسکے۔ اور اسی طریقے سے گاڑیاں روانہ ہوتی رہیں۔ ۹ دسمبر کو آخری اسپیشل روانہ ہوئی۔ اسپیشل گاڑیاں علاقہ مجسٹریٹ اور میرے دستخط سے لگائی۔ اور روانہ کی جاتی تھیں۔

اب پانی پت میں میرے گھر کے سوا کوئی مسلمان نہیں تھا۔ دس بارہ مسلمان اور تھے جو میرے ہی مکان پر مقیم تھے۔ اور بعد میں یا تو پاکستان چلے گئے یا وہی وغیرہ میں جا کر مختلف جگہ آباد ہو گئے۔

پانی پت کے مسلمانوں کے انخلاء میں پاکستانی افسران کپتان محمد اصغر جنرل فخر الدین صاحب نے بہت خوش اسلوبی اور بہت ہمدردی کے ساتھ امداد فرمائی۔ میں اپنی کمزوری کی وجہ سے باہر دیہات میں نہیں جاسکتا تھا۔ تو میرے بھائی وقار اللہ نے منغویہ عورتوں کے برآمد کرنے اور دیہاتی مسلمانوں کو پاکستان روانہ کرنے کا کام بہت مستعدی سے کیا۔ ایک مقامی سکھ دوست نے بھی بڑی تن دہی، جانفشانی اور لوری ہمدردی سے اس کام کے انجام دینے میں عزیزم وقار اللہ کی مدد کی۔

پانی پت اور دیہات میں
فساد کا ذمہ دار کون تھا؟

پانی پت اور اس کے دیہات میں جو کچھ ہوا
مجھے یقین ہے کہ وہ کانگریسی لوگوں کے
مشورے اور ایما سے ہوا۔ ڈاکٹر کپور جو
پانی پت ضلع کے کانگریس کے سکریٹری تھے۔ انہوں نے تمام دیہات اور

قرب و جوار میں دورہ کیا اور تمام جاٹوں اور ہندوؤں کو مسلمانوں کے خلاف ورغلا یا۔ جب مردو لاسارا بانی اور دوسرے حضرات دریافت حال کے لئے پانی پت آئے تو مجھ سے پوچھا۔ اس وقت ڈاکٹر کیپور موجود تھے۔ میں نے ان کی طرف اشارہ کر دیا کہ ان حضرت سے دریافت کیجئے جن کا یہ سبب کیا دھرا ہے تو مردو لاسارا بانی کو بہت غصہ اور افسوس ہوا۔ اس کا نتیجہ یہ ضرور ہوا کہ ڈاکٹر کیپور کو وہاں سے ہٹا دیا گیا۔ مگر افسوس بعد از وقت۔

اکثر مسلمان انخلاق کے وقت اپنے مکالوں پر لکھ گئے تھے

ایک لطیفہ | کہ مالک مکان لقار اللہ ہے۔ چنانچہ شرنا رخصیوں اور رفیوجیوں کا میرے مکان پر تانا بندھ گیا۔ کہ فلاں مکان ہم کو دید و سلسلہ بہت دنوں تک جاری رہا۔

جب رمضان شریف قریب آیا تو میں نے وہی ^طکشنر صاحب کو درخواست دی کہ میں رمضان شریف میں درگاہ میں تراویح اور قرآن شریف پڑھنا چاہتا ہوں۔ درگاہ و مسجد خالی کرادی جائے۔ اس وقت مسجد و درگاہ شریف اور اس کے سارے مکانات و جگہ شرنا رخصیوں سے بھری پڑی تھی۔

انخلاق مسجد و درگاہ۔ | حضرت مخدوم شاہ | میری درخواست منظور ہو گئی چونکہ مسجد میں نماز اور گرتھ صاحب | مسجید میں سکھوں کا گرتھ رکھا ہوا تھا۔ اس کے منتقل کرنے کے لئے کوئی جگہ مناسب نہیں ملی تو اس کو مدرسہ میں منتقل کر دیا گیا۔ اور رمضان شریف میں خدا کے فضل سے اطمینان سے قرآن شریف اور تراویح ادا کی گئیں۔ بریلی کے ایک حافظ صاحب جو بریلی میں موجود تھے میں ان کو جا کر لے آیا تھا۔ انھوں نے قرآن شریف سنایا۔ رمضان شریف کے بعد گرتھ پھر مسجد میں آ گیا۔ اور ہر سال ایسا ہی ہوتا رہا۔ کہ رمضان شریف میں گرتھ مدرسہ میں رکھ دیا

جاتا اور بعد اختتام قرآن شریف و تراویح پھر مسجد میں آجاتا۔ ۱۹۵۶ء میں جب بالکل انخلاء ہو گیا تو اس وقت سے مسجد میں نماز باجماعت اور قرآن پاک و تراویح باقاعدہ ہو رہی ہے۔ بہر حال ناغہ کبھی نہیں ہوا۔ (وَلِلّٰهِ الْحَمْدُ)

ورگاہ حضرت مخدوم عبا میں ایک شہزادہ کھٹی خاندان **ایک کرامت** آیا دیکھا۔ جس کا ایک نوجوان لڑکا دق کا سخت مریض

تھا۔ اور اس کی چار پائی حضرت مخدوم شاہ صاحب کے مزار کی پائنتی میں پڑی تھی۔ جب میرا آنا جانا مسجد میں ہونے لگا تو مجھ سے دعا کے لئے فرمائش کی گئی کہ مولوی صاحب اس مریض کے لئے دعا کر دیجئے کہ اچھا ہو جائے۔ میں نے کہا میرا ایک کہنا مان لو کہ اس کی چار پائی درگاہ سے باہر بچھا دو۔ اور روزانہ درگاہ میں چراغ جلاؤ۔ مریض اچھا ہو جائے گا۔ سروراجی میری بات سے متاثر ہوئے۔ اور میری ہدایت پر عمل کیا۔ خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ مریض دن بدن اچھا ہونے لگا۔ اس شخص نے کچھ دنوں بعد جب عرس کے دن آئے تو درخواست کی کہ میں نے منت مانی تھی کہ درگاہ پر چادر چڑھاؤں گا۔ لہذا چادر چڑھاؤ دو۔ چادر چڑھا دی گئی۔ اور اس طرح عرس کی صورت نکل آئی اور عرس کبھی ناغہ نہیں ہوا۔

۸، ۹، رمضان شریف جولائی ۱۹۵۸ء کو محمد یونس صاحب **عرس قلندر رضا** مالک جامعہ ہوٹل دہلی کچھ کھانا پکوا کر جس میں بریانی

اور شیرمال تھے۔ ۸۔ ۱۰ ہمارا ہیوں کے ساتھ پانی پیت آئے۔ ان کو پولیس نے روک لیا۔ اور تھانہ لے گئے۔ وہاں ان سے پوچھ گچھ کی گئی تو انھوں نے کہا کہ ہم پاکستانی نہیں ہیں، بلکہ دہلی سے درگاہ پر نیا ز چڑھانے آئے ہیں۔ اور کوئی مقصد ہمارا نہیں ہے۔ مولانا تقار اللہ صاحب کے مکان پر کھڑے گئے چنانچہ ان کو چھوڑ دیا گیا۔ رات کو درگاہ قلندر شاہ میں ایک معمولی سا

عرس ہوا۔ اور کھانا تقسیم کر دیا گیا۔

یہ لوگ رات کو میرے مکان پر آ گئے تو مشہور کر دیا گیا کہ پاکستانی لوگ آئے ہوئے ہیں۔ چنانچہ میرے مکان پر شرٹاں تھیلوں کی بھیڑ لگ گئی۔ جب میں نے ان کو سمجھایا کہ یہ لوگ وہی سے آئے ہیں، پاکستانی نہیں ہیں۔ تب وہ لوگ واپس ہوئے۔ اور اس طرح عرس حضرت قلندر صاحب کی صورت نکلی۔ ان دونوں بزرگوں کا عرس کسی سال بھی ناغہ نہیں ہوا۔

ایک غلط خبر | ۱۴ فروری ۱۹۴۸ء کو ایک شخص مسیحی ظہور پانی پتی کا پاکستانی اخبارات میں بیان شائع ہوا۔ کہ پانی پت کے قلندر شاہ کی درگاہ کے کسوٹی کے ستون نکال لئے گئے ہیں۔ اور مولانا غوث علی شاہ صاحب کے مزار کا گنبد مسمار کر کے صاف کر دیا گیا ہے۔ اس بیان کے شائع ہونے کے چار پانچ روز بعد فروری کے آخر میں کرنل فخر الدین صاحب پانی پت تشریف لائے۔ ان کے ساتھ کسٹوڈین پانی پت اور ضلع کرنال کے کچھ افسران بھی تھے۔ انھوں نے دونوں جگہ کا معائنہ کیا اور بالکل مطمئن ہو گئے۔ انھوں نے درگاہ غوث علی شاہ صاحب پر ایک کمیٹی قائم کر دیا۔ جہاں دیہاتی مسلمان جمع ہوتے تھے۔ جہاں سے پاکستان روانہ کئے جاتے تھے۔ اسی طرح کرنال میں مغویہ عورتوں کا ایک کمیٹی بنایا گیا تھا۔

خواتین کی بازیابی اور مذہبی آزادی | اس سے قبل ۸ جنوری کو ایک مرتبہ پھر گاندھی جی کے پاس وہی گیا۔ اور ان کو مغویہ مسلمان عورتوں کی بازیابی اور دیہاتی مسلمانوں کے انحلال

کے اطمینان بخش انتظام کی طرف توجہ دلائی۔ اسی وقت میں نے مہاتما جی سے ایک مطالبہ یہ بھی کیا۔ کہ جو مسلمان مرتد ہو گئے ہیں وہ اگر بحیثیت مسلمان یہاں رہنا چاہیں تو ان کو آزادی دی جائے۔ مہاتما جی نے کہا کہ میرے پاس بھارتی

آنے والے ہیں۔ میں ان کو یہ سب باتیں سمجھا دوں گا۔ وہ آپ سے پانی پت ملیں گے۔ بھارگو صاحب میرے ہیں۔

بھارگو صاحب پانی پت آئے اور انھوں نے مسلمانوں کی پوری پوری مدد کرنے اور مجھ سے تعاون کا وعدہ کیا۔ عرسوں کا سلسلہ شروع ہو جانے سے اور حکومت کی ظاہری روش سے مسلمانوں نے یہ سمجھ لیا۔ کہ اب ہم پر کوئی پابندی وغیرہ نہیں ہے تو وہ بھی ارکان اسلام کی ادائیگی کھلم کھلا کرنے لگے۔ خصوصی طور پر حضرت مخدوم شاہ صاحب کے ۱۹۲۹ء والے عرس میں صاف طور پر مسلمانوں نے اپنے مسلمان ہونے کا اعلان بھی کیا۔ اس وقت مقامی حکام نے بھی ان کا حوصلہ بڑھایا۔

ایک مسلمان فوجی افسر نے مجھ سے کہا۔ کہ ان مسلمانوں کی جو مسلمان رہنا چاہتے ہیں۔ یا پاکستان جا رہے ہیں ان کی چوٹی کٹوائیے۔ میں نے کہا۔ کہ یہ کام میرے بس کا نہیں ہے۔ اس نے کہا کہ آپ پولیس کو باہر مشغول رکھیں اور اندر زتانے مکان میں ہم یہ کام کرتے ہیں۔ چنانچہ جن مسلمانوں نے اپنے مسلمان رہنے کا اعلان کیا، ان کی چوٹیاں کاٹی گئیں جس سے دو کنستریٹیل والے بھر گئے۔

مہاتما جی نے مجھ سے پوچھا کہ کام کی نوعیت کیا ہوگی۔ اس کے متعلق میں نے ایک خط لکھا۔ جو ۳ جنوری ۱۹۴۸ء کو ۱۱ بجے دن

کام کی نوعیت اور
گاندھی جی کا حادثہ قتل

کے وقت مہاتما جی کے پاس پہنچا۔ انھوں نے سر دار گورجن سنگھ سے کہا۔ کہ کل کو مولوی صاحب کی چٹھی کا جواب لکھنا۔ مگر ابھی کل نہیں آئی تھی کہ شام کے وقت مہاتما جی کے قتل کا واقعہ پیش آ گیا۔ رات کو جب اطلاع ملی تو میرے مکان کے نیچے سے لوگ یہ کہتے ہوئے گزر رہے تھے کہ دہلی میں

گاندھی جی کو قتل کر دیا گیا ہے یہاں اس کو (مجھ کو) بھی ختم کر دو۔ مگر خدا کا شکر ہے کہ کوئی واقعہ ناگواری کا پیش نہیں آیا۔ میں بدستور مغویہ عورتوں کے نکلنے کے کام میں عملی طور پر ارکان جمعیتہ علماء اور سوشل ورکروں مثلاً - بہن مردو لا سارا بانی کے ساتھ مصروف رہا۔ اور یہ کوشش جاری رہی کہ جو مسلمان ہندو علاقہ میں رہ گئے ہیں۔ ان کے بچوں کی تعلیم کا کوئی نہ کوئی بندوبست جلد ہونا چاہیے۔ اور جو اوقات ہیں ان کا انتظام بھی اپنے ہاتھ میں ہونا چاہیے۔

ہنگاموں کے ختم ہونے اور فضا کے ساکن ہونے کے بعد جب یہ حقیقت سامنے آئی کہ مکمل تخلیہ اور انخلا

کے باوجود مسلمان دیہاتیوں میں موجود ہیں۔ تو جمعیتہ علماء ہند کے ذمہ دار حضرات کی طرف سے اصرار شروع ہوا کہ پانی پت میں دینی تعلیم کا سلسلہ از سر نو شروع کیا جائے۔ اور کوشش کی جائے کہ دیہات کے مسلمان بچوں کو یہاں لا کر رکھا جائے۔ اور ان کو دینی تعلیم سے آشنا کیا جائے۔ اس تحریک کو حضرت مولانا شاہ عبدالقادر صاحب رائے پوری رحمۃ اللہ علیہ اور مولانا ابوالکلام آزاد کی تائید سے تقویت حاصل ہوئی۔ چنانچہ ستمبر ۱۹۵۲ء سے دینی تعلیم کا مکتب قائم کیا گیا۔ دشواری یہ تھی کہ پانی پت میں کوئی مسلمان بچہ نہیں تھا۔ دیہات کے بچے ہوئے اگاؤ کا تباہ حال مسلمانوں میں نہ تعلیم کا شوق تھا نہ اتنی ہمت تھی۔ کہ اپنے بچوں کو جدا کریں۔ نہ خود بچوں میں کوئی شوق یا احساس تھا۔ ان تمام باتوں کا اثر یہ تھا کہ بمشکل بچوں کو لایا جاتا۔ بچے کچھ دن پڑھتے اور پھر نکل کر چلے جاتے تھے۔

بہر حال پہلی مرتبہ جناب کنور عبدالرحمن صاحب کی نگرانی میں مدرسہ کی ابتداء کی گئی۔ جمعیتہ علماء ہند کی طرف سے ماہانہ امداد جاری کی گئی۔ مگر یہ مکتب چند ماہ جاری رہ کر بند ہو گیا۔

پھر حافظ عبدالحمید صاحب کو جو پانی پت کے شاگرد ہیں۔ اور یہاں ہی کے باشندہ ہو گئے تھے۔ ان کو بلا کر مدرسہ ان کے سپرد کیا مگر وہ بھی نہ چلا سکے۔ پھر حافظ محمد عمر صاحب کو قصبہ سہنسیپور ضلع بجنور سے یہاں بلا یا۔ اور مدرسہ ان کے سپرد کر دیا۔ حافظ صاحب کا بچپن پانی پت ہی میں گذرا تھا۔ آپ نے یہیں تجوید و قرأت کی تکمیل کی تھی۔ خدا کا شکر ہے آپ کی محنت و جانفشانی سے مدرسہ اب تک جاری ہے۔

حافظ صاحب میصوف نہ صرف مدرسہ کی نگرانی اور بچوں کی تعلیم و تربیت کا کام کرتے ہیں۔ بلکہ میرے دوستِ راست ہیں۔ اور مدرسہ کے لئے مالی امداد کا فراہم کرنا، اور اوقاف کے مقدمات کی پیروی نہایت تندہی اور ہمدردی سے کر رہے ہیں۔ اور بہت کامیاب ہیں۔

کچھ دنوں بعد نواب عظمت علی خاں صاحب رئیس کرنال کی موقوفہ جائداد سے تقریباً تین ہزار روپے سالانہ کی امداد آنے لگی۔ اور ایک ادارہ اسلامی پانی پت و کرنال کے نام سے قائم کیا گیا جس میں مسٹر محمد احمد کاظمی ایڈووکیٹ و ممبر پارلیمنٹ، مولانا سید محمد میاں صاحب، میرا محمد حسین صاحب، حافظ عبدالجلیل صاحب، حافظ فیاض احمد صاحب انصاری پانی پتی، اور راقم الحروف ممبر مقرر کئے گئے۔ یہ ادارہ اس وقت تک قائم ہے اور اس کے ماتحت مدرسہ اس وقت تک جاری ہے۔ تقریباً ۶۰ بچے قرآن شریف، اور رسالہ تعلیم الاسلام اور جمعیتہ علماء ہند کی مرتب کردہ مذہبی کتابیں پڑھنے اور لکھنے کے قابل ہو کر فارغ ہو چکے ہیں۔

ادارہ اسلامی کی امداد کے لئے وقف نواب عظمت علی خاں کی جانب سے یہ شرط تھی کہ جب کرنال کی جامع مسجد مسلمانوں کے قبضہ میں آجائے گی۔ اور وہاں مدرسہ قائم ہونے کی صورت ہو جائے گی تو یہ رقم بند کر دی جائے گی

اور وہاں خرچ ہوگی۔

چنانچہ محمد انڈر سٹی وکوشش سے کرنال کی جامع مسجد خالی ہوگئی ہے۔ اور وہاں مدرسہ قائم ہو گیا ہے۔ راؤ محمد حسین خاں صاحب وہاں مقیم ہیں۔ اور کرنال کے حصہ کی رقم اس مدرسہ کو دی جا رہی ہے۔ لیکن اس کا دوسرا نتیجہ یہ بھی ہے کہ پانی پت کے مدرسہ کی آمدنی بہت محدود رہ گئی ہے۔ یعنی صرف تقریباً ایک ہزار روپیہ سالانہ رہ گئی۔ اس بنا پر وظیفہ پانے والے طلبہ کی تعداد کم کرنی پڑی۔ تاہم مدرسہ جاری ہے۔ اور اب وقف درگاہ قلندر صاحب درگاہ مخدوم صاحب اور بعض دوسری درگاہوں کی آمدنی بھی ہونے لگی ہے۔ تو توقع ہے۔ مدرسہ کو ترقی کا موقع ملے گا۔ اور طلبہ میں اضافہ ہو سکے گا۔

تنظیم اوقاف اوقاف کے بارے میں عرصہ سے لگن اور خواہش تھی کہ کسی طرح ان کا تحفظ ہو جائے اپنے طور پر حکومت کو مسلسل توجہ دلا رہا تھا۔ کہ کم سے کم دو چار وقف ہی میرے سپرد کر دیئے جائیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا۔ کہ درگاہ مخدوم صاحب، درگاہ بوعلی شاہ قلندر، درگاہ حضرت شیخ جلال الدین کبیر الاولیاء ۱۹۵۷ء میں میرے سپرد کر دی گئی۔ درگاہ مخدوم صاحب کچھ دنوں بعد بالکل خالی ہوگئی۔ لیکن درگاہ بوعلی شاہ قلندر میں زنانہ اسکول تھا۔ اور باوجود وعدوں کے میونسپلٹی درگاہ شاہ قلندر سے اسکول نہیں ہٹا رہی تھی۔ اور درگاہ کو خالی نہیں کیا جا رہا تھا۔ تو اپریل ۱۹۵۷ء میں اکابرین جمعیتہ علماء ہند کے مشورے سے میں نے میونسپلٹی پانی پت کو نوٹس دیا۔ کہ درگاہ شاہ قلندر سے مدرسہ ہٹا کر اس کو خالی کر کے دروازہ پر قفل لگا کر کنجی میرے حوالے کرو۔ ورنہ میں سستی گڑھ شروع کر دوں گا۔

محمد انڈر اس کا بہت اچھا اثر ہوا۔ اور جون ۱۹۵۷ء میں درگاہ خالی

ہوگئی۔ اس کے بعد صحیح طور پر اجتماعی کوششیں مشرقی پنجاب کے اوقاف کی واکٹاری کے لئے جمعیتہ علماء ہند کی طرف سے شروع ہوگئی۔ اور کئی سال کی جدوجہد کے بعد اکتوبر ۱۹۶۱ء میں پنجاب وقف بورڈ کی تشکیل عمل میں آئی۔ اب بھمد اللہ پنجاب وقف بورڈ اطمینان اور تندہی سے مسلمانوں کی تعلیمی، مذہبی کاموں میں مدد کر رہا ہے۔

سیکولرزم کا ایک خوشگوار نتیجہ اور حکومت کا حوصلہ مند اقدام

ہزاروں انسان دوبارہ دامن اسلام میں

دیہات کے خوف زدہ مسلمانوں کا ذکر پہلے بھی آچکا ہے۔ ان کو مرتد کہنا تو اس لئے صحیح نہیں ہے کہ اسلام سے ایک لمحہ کے لئے بھی منحرف نہیں ہوئے تھے۔ ان کے دلوں میں اسلام اسی طرح رچا ہوا تھا۔ بلکہ بعض ایسی مثالیں بھی ملی ہیں کہ لوگ چھپ چھپ کر نمازیں پڑھتے تھے۔ البتہ حالات کی ہولناکیوں سے مرعوب ہو کر انھوں نے سر پر چوٹیاں رکھ لی تھیں۔ اور اپنے آپ کو ہندو کہنے لگے تھے۔ ان کا معاملہ بہت تکلیف دہ تھا۔ اور ان کی وجہ سے ہر وقت پریشانی رہتی تھی۔ ان کے متعلق حکومت سے عرض معروض اور خط و کتابت کرتا رہا۔

مزید برآں غیبی تائید یہ ہوئی کہ اسی طرح کے مسلمانوں کا ایک وفد جو پٹیا لہ ضلع کے رہنے والے تھے، دہلی پہنچا۔ اور مجاہد ملت حضرت مولانا محمد حفظ الرحمن صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے ذریعہ اپنی فریاد حکومت ہند کے وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو تک پہنچائی۔ کہ مذہبی آزادی کا نہ صرف اعلان بلکہ ایسا انتظام کیا جائے کہ ہم آزادی کے ساتھ اپنے اسلام کا اظہار کر سکیں، ورنہ

ہمیں پاکستان پہنچانے کا انتظام کیا جائے۔
یہ بات باعث مسرت ہے کہ پنڈت نہرو نے ان کی فریاد کی طرف فوراً
توجہ کی۔ اور ایک سرکلر جاری کر دیا۔ کہ ۱۹۴۷ء سے پہلے جو مسلمان تھے۔ وہ
مسلمان ہی ہیں۔ وہ آزادانہ اپنے مذہبی احکام پر عمل کر سکتے ہیں۔ روک ٹوک
کرنے والوں اور ڈرانے دھمکانے والوں کو مجرم قرار دیا جائے۔ اور ان کو اس
جرم سے باز رکھا جائے۔

بہر حال حکومت نے اس سرکلر پر حوصلہ مندی سے عمل کیا۔ سوشل
ورکروں، سرکاری ملازموں اور پولیس وغیرہ کے ذریعہ اس سرکلر کا عام اعلان
کیا گیا۔ اور دو چار جگہ ڈرانے دھمکانے کے واقعات پیش آئے تو ان کو سختی
سے روک دیا گیا۔

پھر سیاسی حالات نے بھی کچھ ایسا پلٹا کھایا کہ مسلمان کی قیمت
بڑھنے لگی۔ پنجابی اور ہندی زبان کے قصے میں ہندو اور سکھوں میں کچھ کشیدگی
پیدا ہوئی تو مسلمانوں کو تیسری پارٹی قرار دے کر ہر ایک نے اپنی طرف کھینچنا
چاہا۔ بہر حال خدا کا شکر ہے کہ یہ سب مسلمان اس وقت مذہبی آزادی سے
بہرہ اندوز ہیں۔ اور اب اس نفرت کے آثار بھی تقریباً ختم ہیں جو اس دور نامعلوم
میں ان تمام تباہیوں اور بربادیوں کی ذمہ دار تھی۔

مسلمانوں کی جائدادوں کی واگذاری | مسلمانوں کے پاکستان
جانے کے بعد حکومت

مشرقی پنجاب نے یہ عام فیصلہ کر دیا کہ یہاں کوئی مسلمان نہیں ہے۔ جس کا
نتیجہ ہوا کہ جو مسلمان یہاں رہ گئے تھے ان کی جائدادیں بھی ضبط کر لی گئیں۔
خود اس فقیر کی جائداد بھی ضبط ہوئی۔ ان جائدادوں کے متعلق جمعیتہ علماء ہند
نے جو جدوجہد کی وہ اس کا ایک تاریخی کارنامہ ہے جس کی بنا پر کروڑوں

روپوں کی جائدادیں مسلمانوں کے پاس محفوظ رہ گئیں۔ جمعیتہ علماء ہند کے علاوہ اس فقیر کی خط و کتابت بھی حکومت ہند اور حکومت پنجاب سے شکمہ سے جاری رہی۔

جمعیتہ علماء ہند کی جدوجہد اور احقر کی مراسلت کے نتائج زیادہ بہتر ہو سکتے تھے۔ مگر بد قسمتی سے محکمہ کسٹوڈین میں ایسے شرنا رکھی حکام اور عملہ تعینات کیا گیا جن کے دلوں میں انسانی درد اور ہمدردی پاس کو کبھی نہیں گزری تھی۔ انہوں نے ہندوستانی مسلمانوں کے ساتھ وہ جابرانہ سلوک کیا کہ تاریخ یاد رکھے گی۔ حالانکہ اس وقت تک بہت سے معاملات طے ہو چکے ہیں۔ لیکن پھر بھی میرے جیسے گوشہ نشین انسان، عدالتوں کے چکر سے گھبرانے والے بے یار و مددگار اب تک پریشان ہیں۔ اور ان کی جائدادیں کسٹوڈین نے غیر قانونی طور پر زبردستی ہٹ کر لی ہیں۔ ہندوستان میں مسلمان موجود ہے۔ مگر کسٹوڈین کے فائل میں لکھا ہوا ہے کہ وہ پاکستان چلا گیا ہے۔ اور یہ جائداد کسٹوڈین کی ہے۔

کرنل فخر الدین پاکستانی فوجی افسر نے
منغویہ عورتوں کی بازیابی

شروع نومبر ۱۹۴۷ء میں ورگاہ حضرت مولانا غوث علی شاہ میں کیمپ قائم کر دیا تھا۔ وہاں پر دیہاتی مسلمانوں کو جو پاکستان جانا چاہتے تھے اکٹھا کیا جاتا تھا۔ اور جو عورتیں بازیاب اور برآمد ہوتی تھیں ان کو یا تو پاکستان بھیجا جاتا تھا۔ یا جن کے اعزا کا پتہ چل سکا ان کے حوالے کر دیا جاتا تھا۔

شروع نومبر ۱۹۴۷ء میں نسا دہور ہا تھا جس میں تقریباً دو ڈھائی ہزار آدمی کام آئے۔ اور سات سو کے قریب عورتیں اغوا کی گئیں۔ میں مرود لاسارا بانی صاحبہ کی اسکیم کے تحت مولوی انیس الحسن صاحب ورگاہ جمعیتہ علماء ہند منغویہ

عورتوں کی بازیابی کے لئے مس مرد و لاسارا بانی کے ساتھ پانی پت آئے۔ اور میری مرتب کردہ فہرست کے مطابق مغویہ عورتوں کی بازیابی ہوئی۔ بحمد اللہ دو چار عورتوں کے سوا جن کی موت و زندگی کا کچھ پتہ نہیں چل سکا۔ تمام مغویہ عورتیں برآمد ہو گئیں۔ اسی سلسلہ میں بعض شرنا رتھی بھائیوں کی عورتیں جو پاکستان میں رہ گئی تھیں یا اغوا کر لی گئی تھیں ان کی بازیابی بھی اپنے احباب و اعزاء کے ذریعہ جو پاکستان میں تھے ہوتی رہی۔ اللہ تعالیٰ نے اس کام میں کامیابی عطا فرمائی بعض معاملات میں کچھ دشواری بھی پیش آئی لیکن اللہ تعالیٰ نے ہماری مدد فرمائی۔ اور آسانیاں پیدا کر کے ہم کو کامیاب بنایا۔

حرفِ آخر ناسپاسی ہوگی اگر میں اس تذکرے میں میرا احمد حسین صاحب شملوی کا ذکر نہ کروں کیونکہ انھوں نے اس جدوجہد اور ٹنگ و دوڑ میں یعنی مسلمانوں کو مسلمان رہنے۔ انکی جائدادوں کی واپسی اوقاف کی واپسی اور ان کا انتظام و انصراف اور دوسرے مسائل میں جس غیر معمولی لچک سے کام لیا وہ ہر ایک ہمدرد ملت بالخصوص مسلمانانِ مشرقی پنجاب کی طرف سے ہزاروں شکر یہ کی مستحق ہے۔ جب کبھی مقامی حکام، حکام نایع یا صوبائی یا مرکزی حکومت سے خط و کتابت یا ملاقات کی ضرورت پیش آئی تو جہاں جماعتی حیثیت سے جمعیتہ علماء ہند کے کارکن اور جمعیتہ علماء ہند کا دفتر مستحق شکر یہ ہے کہ اس نے اس ضرورت کو پورا کیا۔ انفرادی حیثیت میں میر صاحب موصوف مستحق ستائش ہیں نکاسی جائدادوں کے سلسلہ میں حکومت کی طرف سے ایک تاریخ مقرر کی گئی کہ جو لوگ پاکستان نہیں گئے ہندوستان ہی کے کسی مقام پر رہے وہ فلاں تاریخ تک واپسی جائداد کی درخواست دیدیں۔ لیکن مسلمان ہزاروں کی تعداد میں ہیں۔ ان لوگوں نے معینہ تاریخ تک درخواستیں دیں۔

میر احمد حسین صاحب شملوی نے صرف یہی نہیں کیا کہ اس طرح کی درخواستیں لکھنے میں رہنمائی فرمائی۔ بلکہ ایسی درخواستیں خود ہی ٹائپ بھی کیں۔ اور پوری توجہ سے ان کو

بروقت روانہ کیا۔ اس طرح کی خدمات میں جہاں میر صاحب کا وقت خرچ ہوا۔ آپ پر مالی بار بھی پڑا جس کو میر صاحب نے فراخ حوصلگی سے برداشت کیا۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ انکو اسکی جزائے خیر سے اور اس دولت سے سرفراز فرمائے جو اس کے نزدیک بہتر سے بہتر ہے۔
 حضرت مولانا محمد حفظ الرحمن صاحب۔ مولانا آزادؒ۔ مولانا مفتی کفایت اللہ صاحبؒ
 مولانا احمد سعید صاحبؒ۔ مولانا محمد میاں صاحب اور دوسرے تمام ارکان جمعیتہ علماء ہند کے لئے بھی یہی دعا میری اور پنجاب کے تمام مسلمانوں کی جانب سے ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ آباد کاری، مخویہ عورتوں کی بازیابی اور اوقاف کی مالگذاری، مسلمانوں کی ازداد سے واپسی، یہ سب امور بخیر و خوبی کامیاب ہو گئے ہیں۔ البتہ کچھ مسلمانوں کی جائدادیں اور کچھ اوقاف کی جائدادوں کی واپسی کا مسئلہ باقی ہے۔ اللہ تعالیٰ محکمہ سٹوڈنٹس کے حکام و عمال کو فرض شناسی کی توفیق بخشے تاکہ مسلمان اپنا جائز حق پا کر مطمئن ہوں۔ اور حکومت کابل بل بالا ہو۔
 اللہ تعالیٰ ہم سب کی مدد فرمائے۔

لقار اللہ عثمانی (پانی پت)

۸ محرم الحرام ۱۳۸۳ھ مطابق یکم جون ۱۹۶۳ء

خاتمہ کتاب | ایک سبق — جو کبھی بھی فراموش نہ ہونا چاہیے۔

آپ نے بزرگان پانی پت کے حالات میں تقریباً تین سو صفحات کا مطالعہ کیا ان حالات میں مرکزی نکتہ جس کی جھلک ہر جگہ نظر آ رہی تھی۔ کیا تھا۔ ؟
 پریم۔ محبت۔ رواداری۔ اپنوں پرانیوں سے اچھا سلوک۔ ایک دوسرے پر اعتماد و خدا شناسی اور خدا ترسی۔ ان تین سو صفحات میں آپ کو یہی باتیں ملیں گی۔ جو دراصل انسانیت کی صحیح تصویر اور شرافت کا جوہر ہیں۔

پھر آپ نے حضرت مولانا لقار اللہ صاحب عثمانی کا بیان بھی ملاحظہ فرمایا۔
 یقیناً آپ کا مزہ بگڑ گیا ہوگا۔ وہی انسان جو شرافت کا پیکر تھے آپ کو بھیرے معلوم

ہونے لگے ہونگے۔ یہ فرق کیوں ہوا۔ اس وقت ۱۹۶۳ء میں جبکہ جمہوریہ ہند پر واران
 چڑھ رہے ہمارا فرض یہ کہ ہم اس فرق کو سمجھیں اور اس کی بنیادی وجہ معلوم کریں۔
 وجہ مسلمان بادشاہوں کو آپ کچھ بھی کہیں اُن کی آپس کی لڑائی جھگڑوں کے
 متعلق آپ کچھ بھی فیصلہ کریں۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ اُن کا اصول حکمرانی وہ تھا۔
 جس کی وصیت بابر نے اپنے بیٹے ہمایوں کو کی تھی۔

اے سپر مملکت ہندوستان مختلف مذاہب سے پر ہے۔ الحمد للہ کہ اس
 نے اس کی بادشاہت تمہیں عطا فرمائی۔ تمہیں لازم ہے کہ تمام تعصبات
 مذہبی کو لوح دل سے دھو ڈالو۔ اور عدل و انصاف میں ہر مذہب ملت
 کے طریق کا لحاظ رکھو۔ جس کے بغیر تم ہندوستان کے لوگوں پر قبضہ نہیں کر سکتے۔
 جس طرح انسان کے جسم میں چار عناصر مل جل کر کام کر رہے ہیں۔ اسی طرح
 مختلف مذاہب رعایا کو ملا جلا رکھو اور ان میں اتحاد عمل (قومی یکجہتی) پیدا
 کرو۔ تاکہ جسم سلطنت مختلف امراض سے محفوظ و مامون رہے۔

رجوالہ علماء ہند کا شاندار ماضی ج ۲ و اخبار خلافت عن ۱۹ اگست ۱۹۲۶ء

بیشک ایسا ہوا کہ ہمایوں کو شیر شاہ نے ہندوستان سے بھگا دیا۔ پھر تقریباً
 بارہ سال بعد ہمایوں نے چڑھائی کر کے شیر شاہ کے وارثوں کو ختم کیا۔ مگر یہ لڑائی
 حکمرانوں کی تھی۔ وہ آپس میں تباہ ہوتے اور ایک دوسرے کو تباہ کیا کرتے تھے لیکن
 جیسا کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کی رپورٹ پنجم ۱۸۱۳ء میں کہا گیا تھا۔ اس تباہی کا اثر
 عوام نہیں پڑتا تھا۔ رپورٹ میں تحریر ہے۔

”میسویل (مقامی) گورنمنٹ کے اس سادہ نظام میں (یعنی دیہات کے پنجائی
 نظام میں) اس ملک کے باشندے نامعلوم زمانہ سے زندگی بسر کر رہے
 ہیں۔ وہ یہ فکر نہیں کرتے کہ بادشاہت ٹوٹ گئی یا منقسم ہو گئی۔ جب تک
 اُن کا گاوں صحیح سالم ہے انھیں پروا نہیں کہ وہ کس سلطنت میں شامل

ہو گیا۔ یا کس بادشاہ کے قبضہ میں آ گیا۔ اس کی اندرونی زندگی کے آئین اور

دستور منقلب نہیں ہوتے۔“ (دت صفحہ ۱۹۶)

بہر حال۔ بابر کی وصیت سے جو اصول معلوم ہوتا ہے۔ اس کے نتائج وہ
تھے جو آپ نے کتاب کے تین سو صفحات میں ملاحظہ فرمائے۔
اب آئیے۔ انگریزوں کا اصول حکمرانی ملاحظہ فرمائے:-

”ہندوستان میں ہماری حکومت کے ہر صیغہ کو خواہ وہ خارجی تعلقات سے
واسطہ رکھتا ہو یا عدالتی اور حربی نظم و نسق سے، یہ اصول ہمیشہ مد نظر
رکھنا چاہیے۔“ تفرقہ ڈالو اور حکومت کرو۔“

(بحوالہ ایشیاٹک جنرل ۱۸۲۱ء)

”نفاق ڈال کر حکومت کرنا رومیوں کا اصول تھا۔ یہی اصول ہمارا بھی ہونا
چاہیے“ (یادداشت لارڈ الفنسٹن گورنر بمبئی مورخہ ۱۳ مئی ۱۸۵۹ء)

(بحوالہ ان سپی انڈیا۔ مصنفہ لالہ لاجپت رائے)

پانی پت کے یہ واقعات جو مختصر اور مندرجہ طور پر آپ نے مولانا تقار اللہ صاحب
عثمانی کے بیان میں ملاحظہ فرمائے۔ نفاق کے اسی پودے کے کڑوے پھل تھے جس کو
انگریزوں نے بویا تھا۔ افسوس سوسال میں اس کی جڑیں اتنی گہری پھیل گئی ہیں کہ
۱۶ سال ہو گئے۔ انگریز جاچکا۔ مگر یہ جڑیں اب تک نہیں اکھڑ سکیں۔

لعل اللہ یحدث بعد ذلك امراً۔

۵ گندم از گندم برود جو ز جو از مکافات عمل غافل مشو
و آخر دعوانا ان الحمد لله رب العالمین۔

محمد میاں

(۱۱ صفر ۱۳۸۳ھ مطابق ۳ جولائی ۱۹۶۳ء)



دینی تعلیم و تربیت کے اُردو ہندی رسالے

نام فہم۔ دلچسپ۔ مستند اور معتبر۔ ظاہری اور معنوی خوبیوں سے آراستہ
آپ خود ملاحظہ فرمائیں۔ بچوں اور عورتوں کو مطالعہ کرائیں۔

مقصد

یہ ہے کہ بزرگوں اور پیشواؤں کے حالات معلوم ہوں۔ ہم اور ہمارے بچے اور عورتیں
بھیس پڑھ کر اچھے اور نیک بننے کی کوشش کریں۔ اللہ تعالیٰ ہماری مدد فرمائے۔

نام کتاب	اُردو	قیمت	نام کتاب	ہندی	قیمت
حق تعالیٰ کا کچھ ذکر	۳۰ پیسے	تعلیم الاسلام	حصہ اول	۲۰ پیسے	
محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم)	۵۰	"	حصہ دوم	۳۰	
ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ	۵۰	"	حصہ سوم	۳۰	
عمر فاروق رضی اللہ عنہ	۵۰	"	حصہ چہارم	۴۰	
عثمان غنی رضی اللہ عنہ	۵۰	دینی تعلیم کا رسالہ	۱	۳۰	
علی رضی اللہ عنہ	۲۰	"	۲	۵۰	
امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ	۵۰	"	۳	۶۰	
امام مالک رحمۃ اللہ	۶۰	"	۴	۳۲	
امام شافعی رحمۃ اللہ	۳۰	"	۵	۵۲	
امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ	۳۰	"	۶	۲۰	
حضرت موسیٰ علیہ السلام	۲۵	ہندی کا قاعدہ۔ گیان مالا		۳۰	
حضرت عیسیٰ علیہ السلام	۲۵	گیان مالا پمپلا بھال		۳۰	
		گیان مالا دوسرا بھال		۵۰	

الجمعیۃ لک ڈپو۔ گلی قاسم جان دہلی

ہائٹل مطبوعہ فائن پریس جامع مسجد دہلی